اُردو شاعری کی تنقید
اور ڈاکٹر تقی عابدی: ایک تنقیدی مطالعہ
(انیسؔ، فیضؔ اور حالیؔ کے حوالے سے)

تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

مقالہ نگار
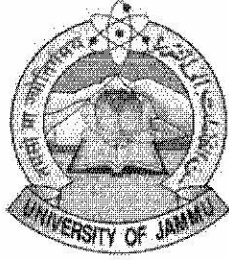
صائمہ منظور

نگراں

پروفیسر شہاب عنایت ملک

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی، ۱۸۰۰۰۶

۲۰۱۷ء

POST GRADUATE DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU, JAMMU 180006
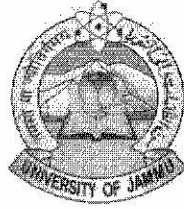
CERTIFICATE

This is to certify that the Thesis entitled: ***"Urdu Shairi Ki Tanqeed Aur Dr. Taqi Abedi: Ek Tanqeedi Mutalia (Anees, Faiz Aur Hali Ke Hawale Se)"*** *submitted by* ***Saima Manzoor*** *has completed under my supervision. Thesis is worthy of consideration for the award of degree of Ph.D. in Urdu.*

I certify:

1. *That the Thesis embodies the work of the candidate.*
2. *That the candidate works under him for the period required under statutes.*
3. *That has put in the required attendance and seminar in her department.*
4. *That the candidate has fulfilled the statutory conditions as laid down in sec. 18.*

Countersigned by:
H.O.D
Department of Urdu
University of Jammu

Supervisor:
Prof. Shohab Inayat Mlik
Department of Urdu
University of Jammu

فہرست

حرفِ چند	:	________	7
باب اول	:	تقی عابدی حیات وشخصیت ________	21
باب دوم	:	تقی عابدی کی مجموعی ادبی خدمات ________	61
باب سوم	:	تقی عابدی اور انیسؔ فہمی ________	133
باب چہارم	:	تقی عابدی اور فیضؔ فہمی ________	253
باب پنجم	:	تقی عابدی اور حالیؔ فہمی ________	415
		حاصل مطالعہ ________	605
		کتابیات ________	627
		رسائل وجرائد ________	636

باب اول

تقی عابدی حیات و شخصیت

اردوادب میں شعری پیرائے میں اظہار رائے کی مختلف اصناف ہیں جن میں غزل،نظم، مثنوی، مرثیہ ،قصیدہ، رباعی ،قطعہ ،مخمس،سلام، گیت ، دوہے وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام اصناف کی اپنی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ ہمارے ہندوستانی معاشرے کی طرح اردوادب بھی وحدت میں کثرت کا متقاضی ہے چنانچہ اسی کثرت کا نتیجہ ہے کہ اردونثری اورشعری ادب دونوں کواپنے دامن میں جگہ دے کر دِن بہ دن تابناک مراحل طے کررہی ہے جس سے عوام وخواص سب استفادہ کرر ہے ہیں۔لہٰذااردو ہندو پاک ہی نہیں بلکہ دیارغیر میں بھی گنگا جمنی تہذیب وثقافت کے فروغ کے لئے پابندعہد ہے۔جس سے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور بھائی چارے کے ماحول کو سمجھنے میں آسانی ہورہی ہے۔اس پس منظر میں اردو کی نئ بستیوں کا جائزہ لیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان بستیوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی بقا کی خاطر چنداہم لوگ اپنی مادری زبان وادب کے لئے کام کرر ہے ہیں اور ہمہ وقت اپنی وسعت کے مطابق اردوزبان وادب کے تئیں ذمہ دارانہ رویہ اپناتے ہیں ان بستیوں میں برطانیہ کینیڈا ،امریکہ، جرمنی،فرانس، روس،آسٹریلیا،سوئٹرزلینڈ،اسپین ،افریقہ، ماریشس ، جاپان،ایران اورخلیجی مما لک سرفہرست ہیں۔اردو کی ان نئ بستیوں میں موجوداد یب محقق اور ناقدین کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ رہورہاہے اور ساتھ ہی مختلف اصناف پر عمدہ اور معیاری ادب بھی تخلیق کیا جارہاہے۔

اردو کی نئ بستیوں میں کئی دہائیوں سے ان مما لک کی نمائندگی کا تاج ایک کہنہ مشق ادیب

شاعر محقق ونقاد ڈاکٹر تقی عابدی کے سر ہے جو اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے ہندو پاک سمیت اردو کی نئی بستیوں میں بھی یکساں مقبول ہیں۔ موجودہ وقت میں وہ فیزیشن کے ساتھ ساتھ ماہر اعضائے انسانی اور ماہر امراض قلب ہیں۔ The Scarborought Hospital میں طبابت کے پیشے سے منسلک ہیں ساتھ ہی کینیڈین رائٹرز یونین کے ممبر بھی ہیں دنیا کے مختلف ممالک میں 40 سال سے زیادہ کام کرنے کا تجربہ ہے۔ ان تجربات میں خالص تحقیق وتنقید ہی نہیں بلکہ فزیشن کی حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ بھی حاصل ہے اردو تحقیق وتنقید تدوین وترتیب تخریج وتشریح ترجمہ وتفسیر کی صورت میں اب تک (۶۰) ساٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں خاص طور پر شعری تنقید کو اولیت حاصل ہے ان کے تمام تحقیقی وتنقیدی سرمائے کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیک وقت ماہر انیسیات، دبیریات، غالبیات، اقبالیات، فیضیات اور ماہر حالیات کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کے بڑے عالم ہیں اپنی ان تصنیفات وتالیفات کے علاوہ چالیس سال سے زیادہ ادبی خدمات دو درجن سے زیادہ نیشنل وانٹرنیشنل ایوارڈس حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیفات اردو کے تیئں عظیم شخصیات انیسؔ، فیضؔ اور حالیؔ کی شعری فہم وفراست کے حوالے سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

الف۔سوانحی کوائف:

دور حاضر میں رثائی ادب کے ماہر، ادب کے مریض اور صحت کے طبیب ڈاکٹر سید تقی عابدی یکم مارچ ۱۹۵۲ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔آپ بیک وقت ڈاکٹر ،شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔آپ کا ادبی نام تقی عابدی اور تخلص تقی ہے اور اصلی نام سید تقی حسن عابدی ہے۔آپ کے والد کا نام سید سبط نبی تھا جو قانون دان تھے، دادا کا نام شبیر علی تھا جو زمیندار تھے ،بچپن میں ہی ان کے والد جو کہ دلی عدالت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے کا تبادلہ حیدر آباد ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر عابدی کو بھی اُن کے ہمراہ حیدر آباد جانا پڑا یوں ان کی تعلیم حیدر آباد میں ہی شروع ہوئی۔

تقی عابدی کے خاندان میں کافی علماء گزرے ہیں اس لئے مذہب سے محبت اور تہذیب سے شائستگی آپ کو ورثے میں عطا ہوئی ہے گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ابتدائی قرآنی تعلیم گھر کے علاوہ مکتب میں اپنے اساتذہ زاہد حسین اور وفا صاحب سے حاصل کی عربی کی تعلیم چھتہ بازار حیدر آباد میں مقیم مولوی شمس الدین قادری سے حاصل کی۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں کے حاجی منصور خراسانی سے حاصل کی۔

بچپن سے ہی شعر وسخن اور دیگر موضوعات کے علاوہ کرکٹ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اکثر تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے اور انعامات حاصل کرتے تھے شعر وشاعری کے ساتھ بچپن سے ہی خاص لگاؤ تھا آپ نے ہندی زبان بھی سیکھی۔ چونکہ ان کے (تقی عابدی)

اسکول کے زمانے میں ہندی اور انگریزی زبانیں لازمی تھیں اور اردو اختیاری زبان تھی اس طرح آپ نے تینوں زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔

تقی عابدی نے میٹرک کا امتحان دارالشفاء ہائی اسکول حیدر آباد دکن سے پاس کیا۔ ایف ایس سی سیف آباد کالج حیدر آباد دکن سے کیا۔ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور پھر یہیں سے 1975ء میں MBBS (ایم۔بی۔بی۔ایس) مکمل کیا۔ مزید تعلیم کے لئے برطانیہ چلے گئے پھر گلاسکو یونیورسٹی برطانیہ سے پتھالوجی میں MSC کیا اورامریکہ تشریف لے گئے یہاں سے آپ نے (FCAP) ایف۔سی۔اے۔پی۔ کی ڈگری ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف پتھالوجی سے مکمل کی۔ اس کے بعد (FRCP) کی ڈگری فیلو آف رائل کالج آف فیزیشن اینڈ سرجن کینیڈا سے حاصل کی۔

1975ء میں ایران تشریف لے گئے یہاں پر آپ نے فارسی زبان سیکھی جس کے لئے آپ نے ایرانی معلم سے بھی استفادہ کیا اور اس دوران آپ کو ایرانی ادب کا مطالعہ کرنے کا موقعہ بھی حاصل ہو گیا۔ فارسی شعراء کے کلام اور فارسی ادب کا مطالعہ کرنے کے علاوہ آپ نے اپنے تحقیقی و تخلیقی سفر میں بھی ان سے بخوبی استفادہ کیا۔ تقی عابدی ایک طبیب کی حیثیت سے جب ایران تشریف لے گئے تو وہاں ان کی ملاقات محترمہ گیتی سے ہوگئی یہ ملاقات جلد ہی خانگی زندگی میں تبدیل ہوگئی اس بارے میں وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

''بطور طبیب جب میں ایران میں مشغول تھا تو میری خاتون خانہ سے

وہیں ملاقات ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد ہم دونوں کی رضامندی اور بڑوں
کی اجازت سے ہماری شادی ہوگئی میری شریک حیات گھر کی دیکھ بھال
بچوں کی تعلیم وتربیت کے علاوہ میرے علمی جہاد میں ہمیشہ میری معاونت
کرتی رہی ہیں۔ اور آج بھی ان کے تعاون کے بغیر میرا ادبی سفر جاری رکھنا
ناممکن ہے۔''(1)

تقی عابدی کی چار اولادیں ہیں جن میں دو بیٹے رضا اور مرتضٰی دو بیٹیاں رویا اور معصومہ شامل ہیں تقی عابدی کے بچوں کی پرورش امریکہ اور کنیڈا میں ہوئی ہے۔

تقی عابدی نے اپنے پریوار کے ساتھ 20 سال امریکہ میں گذارے ہیں مگر اب وہ کینڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں اس سلسلے میں وہ خود بتاتے ہیں۔

''امریکہ کی نسبت کناڈا کا ماحول پرسکون ہے اور صرف انچاس سال کی
عمر میں جس وقت میرے موجودہ ادارے نے مجھے پروفیسری کے اعزاز کے
ساتھ یہاں کام کرنے کی دعوت دی تو میرے خاندان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا
کہ کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کرنا ہمارے لئے ہر لحاظ سے سودمند ہوگا۔
اس کی ایک اور وجہ میری بیٹی کا میڈیسن میں داخلہ بھی بنا۔''(2)

تقی عابدی آج کل کینیڈا میں پیتھالوجسٹ اور فیزیشن کے طور پر کام کرنے کے علاوہ ادب کی خدمت کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

آباؤ اجداد:

تقی عابدی کے والد محترم کا نام سید سبط نبی عابدی، والدہ کا نام سنجیدہ بیگم اور دادا کا نام شبیر علی عابدی تھا۔آپ کے (تقی عابدی) آٹھ بھائی اور دو بہنیں ہیں ان میں آپ تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔آپ کا آبائی وطن امروہہ سے متعلق سادات کی بستی نوگاؤں سے ہے۔ آپ کا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے۔آپ کا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیاء سے ملتا ہے۔خواجہ حسن نظامی ثانی اسی نسبت سے انہیں اپنا راشتہ دار کہا کرتے تھے۔آپ کے خاندان میں مختلف علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں آپ کے ذاتی کتب خانے میں آپ کے جد کی لکھی ہوئی سوا دوسو سال پرانی کتاب ''حق الیقین'' ابھی تک موجود ہے۔تقسیم ہندو پاک کے پانچ سال بعد آپ دلی میں پیدا ہوئے اور بچپن سے ہی حیدر آباد آپ کا وطن ٹھہرا کیونکہ آپ کے والد سید سبط نبی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے اور وہیں عدالت میں سیشن جج کے عہدے پر فائز تھے والد کے تبادلے کے بعد حیدر آباد آپ کا مستقل مسکن بن گیا۔آپ کے والد ایک گوشہ نشین شاعر بھی تھے اور انہیں سے آپ نے شعر گوئی اور شعر فہمی کا فیض بھی حاصل کیا۔

(ب) ادبی سفر کا آغاز

تقی عابدی پیشے کے اعتبار سے ایک طبیب (ڈاکٹر) ہیں مگر اُن کی شہرت و مقبولیت کا

سبب اُن کی علمی دنیا سے وابستگی ہے آپ کی ادبی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو آپ بچپن سے ہی شعر وادب کے رسیا تھے۔ گھر کا ماحول بھی علمی وادبی تھا۔ اورادب کی کتابوں سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ آپ بچپن میں اکثر ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے جس کی ایک خاص وجہ گھر کی ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس میں آپ دورانِ تعطیلات اپنا اکثر وقت گزرا کرتے تھے۔ یوں آپ کی ادبی زندگی کا آغاز اپنے ہی گھر سے ہوا۔

تقی عابدی بچپن سے ہی مطالعے کے عادی تھے۔ یہاں تک کہ ہر اخبار کے ادبی گوشوں کو پڑھ کر نوٹس تیار کرتے۔ اکثر کتابوں کے حاشیوں پر نوٹس تحریر کرتے۔ ادب کے مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جب کبھی بیرون ملک جاتے سوائے کتابوں کے اپنے ساتھ کچھ نہ لاتے۔ اکثر دوستوں سے کہتے کہ کتابیں بھیجیں۔ پبلشرز انہیں کتابیں بھیجتے تھے۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ تقی عابدی کو بچپن سے ہی شعر وادب سے خاصی دلچسپی تھی۔ اسکول اور کالج کے زمانے سے ہی شعر وشاعری کی طرف توجہ دی حالانکہ اسکول اور کالج میں شعر وشاعری کا ماحول نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود اکثر شعر وسخن کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے اس سے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''بے قاعدہ شعر کہنا یا بعض موقعوں پر تگ بندی کرنے کا شغل تو مدرسے اور کالج کے ابتدائی دور کی تلخ اور شیریں وارداتیں ہیں۔ فطری شاعری جو کہ ایک قدرتی چشمہ کی طرح سے سینے سے اُبل پڑی تھی مجھے شعر گوئی کے علاوہ

بیت بازی کے مقابلوں ،شعر وسخن کی محفلوں میں شریک کرتی رہتی تھی۔
چنانچہ اسکول میں اگر چہ شاعری کا ماحول نہ تھا کالج میں بھی شعروادب کا گزر
نہ تھا لیکن دل میں شعر گفتی کی شمع روشن تھی۔جیسے ہی تعلیم اور معاش کی
بندشوں سے ذرا مہلت ملی تو شاعری کی چاندنی پھیلنے لگی اور بہت کم عرصے
میں شرق وغرب میں شعری محافل میں پذیرائی ہونے لگی۔''(3)

شاعری میں چونکہ قدرتی اورفطری ذوق شامل رہا اسی لئے کبھی اس فن کو انہوں نے علمی سطح پر پرکھنے کی کوشش نہیں کی ۔شاعری میں نہ ان کا کوئی استاد تھا اور نہ ابھی تک کوئی ہے۔ ابتداء میں عروض وقافیہ سے بےخبر شعر کہنے سے بعض اوقات انہیں تحسین ناشناس اورسکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے انہوں نے خود اس طرف توجہ کر کے شعر وادب سے مربوط دیگر علوم کا دقیق مطالعہ کیا۔اس فن پر ان کی ایک کتاب ''رموز شاعری'' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔جس میں انہوں نے اردو کے مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی ہے۔اس کے علاوہ تقطیع ہیجائی بھی اس میں شامل ہے۔تا کہ نہ صرف عالم بلکہ عام قاری اورمشاق سب اس سے استفادہ کرسکیں اورشعر کی صحت سے واقف ہوسکیں۔اس کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں نہایت ہی صاف زبان اور عام فہم انداز میں فن عروض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تقی عابدی نہ صرف سخن گوئی بلکہ سخن شناسی کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں اس کے ساتھ ہی

علم عروض اور علم بیان کے رموز و نکات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔قدیم شعر وادب کی طرح جدید شعر وادب سے بھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔شاعری میں اپنے مقام کے بابت یوں بیان کرتے ہیں:۔

''میں مطمئن ہوں جو کچھ بھی شاعری میں میرا مقام ہے یہ دل سے اٹھتی ہوئی لہریں ہیں جن کا دبانا میرے بس میں نہیں میں شعر وسخن کو برائے ہدف استعمال کرتا ہوں۔شاعری کا لطف کیا ہے وہ تو صرف قدرتی چشمے کا بہتا ہوا پانی بتائے گا کہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے آبشاروں میں گاتے ہوئے دریاؤں میں گھل مل جانے میں کیا سرور ملتا ہے۔''(4)

تقی عابدی کا تعلق چونکہ طبابت سے ہے اور سائنسی علوم اور طبابت کو اگر دیکھا جائے تو دونوں میں اتنا فاصلہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دور نظر آتے ہیں مگر ان کا ذوق شوق اور عزم ان کے پیشے اور ان کے شوق کو آپس میں ملا دیتا ہے۔اپنے پیشے کے تمام تر مصروفیات کے باوجود بھی وہ ہر ہفتہ 35 سے 40 گھنٹے ادب پر صرف کرتے ہیں جو ان کے ذوق وشوق کی ایک عمدہ دلیل ہے۔ادب سے انہیں جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔شعر وادب اور تصانیف کیلئے درکار وقت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کوئی کمی نہیں۔وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ہم بہت سے کاموں سے دستبردار ہو جاتے ہیں، میں اپنے شغل کی

تمام تر مصروفیات کے باوجود تقریباً 35 سے 40 گھنٹے ہر ہفتے ادب پر صرف
کرتا ہوں۔ ادبی مضامین پر ہر وقت غور وفکر کرتا رہتا ہوں۔ جس موضوع پر
مجھے کچھ لکھنا یا کہنا ہے اُسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر ذہن میں مطالب تیار
کرلیتا ہوں۔ چنانچہ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو مطالب باران رحمت کی طرح
صفحہ قرطاس پر اترنے لگتے ہیں اس طرف مصروف زندگی میں بھی یہ گنجائش
رہتی ہے کہ انسان اپنے ذوق وشوق کی تکمیل کر سکے۔ (5)

تقی عابدی کا لائبریری سے استفادہ کرنے کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ جس کی خاطر تقی عابدی نے کناڈا میں تقی عابدی لائبریری کے نام سے ایک لائبریری بنا رکھی ہے جس میں تقریباً 13 ہزار سے 14 ہزار کتابیں موجود ہیں جن میں قریباً 2 ہزار کتب فارسی سے متعلق ہیں بڑی تعداد میں انگریزی اور ہندی کی کتابیں بھی اس میں شامل ہیں اور اردو فارسی کی زیادہ تر کتابیں کلاسیکی ادب، شعر وشاعری، تنقید وتحقیق تذکروں، سوانح عمریوں لسانیات اور دیگر ادبی تخلیقات سے مربوط ہیں۔ اس لائبریری میں 1400 مخطوطات اردو وفارسی میں ہیں جن میں مرثیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور کاغذات کی تعداد 8 سو 9 لاکھ تک ہے۔ مخطوطات کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

''جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانہ میں
چودہ سو کے لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں رثائی

بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہے۔ ان مخطوطات کو میں نے (40) سال
کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ کتب خانہ کی پرانی اور نادر کتابیں اور مخطوطات
تمام تر برصغیر سے جمع کی گئی ہیں رثائی ادب کی کتابیں اور کچھ قلمی مرثیے اور
قلمی بیاضیں راقم کو ''جعفر منزل'' کے علمی ذخیرے سے حاصل ہوئی ہیں جن
کی تعداد کوئی خاص زیادہ بھی نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت
سی کتابیں کنیڈا نہیں پہنچ سکیں، اور یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں بہر
حال رثائی ادب کا یہ ذخیرہ بھی جو چند سو کتابوں پر مشتمل ہے آئندہ مغربی دنیا
کی یونیورسٹی میں محفوظ رہے گا۔'' (6)

تقی عابدی چونکہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اکثر نادر مخطوطات پر چند افراد اپنا قبضہ جمائے بیٹھے رہتے ہیں جس کی وجہ سے تحقیق کاران اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور ان تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی ہے اس لئے انہوں نے اس لائبریری کو کناڈا کی یونیورسٹی کو بطور عطیہ دینے کا فیصلہ بھی لیا ہے تا کہ ان کے بعد باقی لوگ اس تمام ذخیرے سے استفادہ کرسکیں اور یہ لائبریری کسی ایک فرد کی ملکیت بن کر نہ رہ جائے۔ لائبریری کو بطور عطیہ دیئے جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

''چونکہ میرا تعلق تحقیق اور تنقید کے ساتھ ہے اور میں نے ذاتی تجربات
سے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ اردو ادب کے یہ ذخائر تحقیق اور تنقید کے لئے

ضروری ہیں اس لئے میری حیات تک یہ ذخائر میرے پاس موجودہ رہیں
گے لیکن میرے مرنے کے بعد خود ہی یونیورسٹی کے ذخائر میں محفوظ ہوجائیں
گے تاکہ اردو اسکالرس اس سے استفادہ کرسکیں میں نے کتب خانہ اور مخطوطات
سے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس لئے بھی بے دخل کردیا ہے کہ اس ادبی
سرمایہ تک اردو کے پرستاروں کی رسائی ہوسکے اور میرے تلخ تجربوں میں
جہاں کہیں بھی نادر مخطوطات ہیں وہاں اس ذخیرہ پر خاندان کا کوئی فرد
سانپ بن کر اوپر بیٹھا رہتا ہے اور دوسروں کو اس کے قریب بھی نہیں آنے
دیتا جس کا نتیجہ یہ ذخیرہ دیمک کی نظر ہوجاتا ہے۔''(7)

لائبریری کو بطور عطیہ دیئے جانے کی اس وصیت سے تقی عابدی کی اردو ادب سے بے پناہ محبت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔تقی عابدی کو غالبؔ اور اقبالؔ سے خاص لگاؤ ہے اور وہ علامہ اقبالؔ کے فلسفہ پیام عمل اور فکر وفن سے کافی متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری میں جذبہ ملی کی جو بلندی نظر آتی ہے وہ علامہ کی شاعری کے اثرات کی دین ہے۔ اس کی واضح مثال ان کا اس شعر سے دی جاسکتی ہے۔

؎ خود روشنی پھیلے گی محبت کی زمین پر
اقبال اور رومی کے کچھ اشعار سُنا دو

تقی عابدی کی شاعری سے وہی لوگ مستفید ہوسکتے ہیں جو ان کو بذات خود جانتے

ہوں۔تقی عابدی ایک مہذب ادب شناس ،علم دوست دانشور ،خوش گفتار اور خوش مزاج انسان ہیں۔ وہ بیک وقت کئی صفات کے مالک ہیں صاف اور عام فہم زبان،مخصوص الفاظ کاانتخاب، دل کوموہ لینے والا خلوص وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جو انہیں دوسروں سے منفرد کردیتے ہیں۔ اِن عادات واطوار کی واضح جھلک ان کی شاعری میں بھی دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔وہ روایتی شاعری میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ اب تک تقی عابدی کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔پہلا شعری مجموعہ ''گلشن رویا'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے جبکہ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''جوش مودت'' ہے اس مجموعہ میں صنف مراثی کی علیحدہ علیحدہ جزئیات کی صورت میں حمد ونعت اور منقبت پیش کی گئی ہیں۔جو ان کے قلب کی گہرائی سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

تقی عابدی نے اپنے نثری سفر کا آغاز روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد میں ایک مضمون لکھ کر کیا جب ان کی عمر پندرہ برس تھی اس مضمون کا عنوان ''قطب شاہی گنبد'' تھا۔اس مضمون کو لکھنے سے پہلے وہ بہت ساری تحقیقی وتنقیدی کتب کا مطالعہ کر چکے تھے۔آپ کو فکشن سے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔آپ کی تحقیق کا محور کلاسیکی ادب تھا اور ہے بھی۔ جس میں تحقیق تنقید اور تاریخ کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔آپ نے نہ صرف سخن گوئی میں بلکہ سخن فہمی میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ 1969ء میں پہلا کتابچہ قطب شاہی سلطنت کے

پانچویں حکمران ''عبداللہ قطب شاہ'' کے حوالے سے تحریر کیا۔ طب کے حوالے سے پہلا مضمون مختلف بیماریوں کی تشخص کے اسی دور میں تحریر کیا۔

1981ء میں ایران کے مشہور عالم مطہری کی ایک فارسی کتاب کا ''شہید'' کے نام سے ترجمہ کیا جو شہادت کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اس کتاب کو دفتر ارشاد تہراں نے ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا۔ یہیں سے لکھنے پڑھنے کا ایک باضابطہ سلسلہ چل پڑا جو ابھی تک اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔ تحقیق وتنقید کے علاوہ ترتیب وتدوین کا میدان بھی ان (تقی عابدی) کی شخصیت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ مختلف مجلوں اور میگزینوں میں ان کے شعری اور نثری فن پارے اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے مضامین 'اردو ٹائمز نیو یارک سے تقریباً ہر ہفتے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جو کافی پسند بھی کئے جاتے ہیں۔ روز نامہ ''سیاست'' حیدر آباد دکن میں بھی آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اس کے علاوہ دیگر مجلوں، میگزینوں اور اخبارات میں بھی آپ کے شعری ونثری تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔

تقی عابدی ماہر اقبالیات، غالبیات، انیسات، دبیریات اور لسانیات کے ساتھ ساتھ فیضؔ فہمی اور فیضؔ شناسی کے حوالے سے بھی اردو ادب میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مرزا دبیرؔ پر مختلف اصناف کے حوالے سے اب تک سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، مصحف فارسی، مثنویات دبیرؔ، سلک سلام دبیرؔ اور رباعیات دبیرؔ وغیرہ خاص طور پر مقبول ہیں۔ تقی عابدی میر ببر علی انیسؔ، مرزا غالبؔ علامہ اقبالؔ، انشاء،

نجم آفندی تعشق لکھنوی رشید لکھنوی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے علاوہ دیگر نثر نگاروں وشعراء حضرات پر تحقیقی وتنقیدی کتابیں اردو ادب میں بلند حیثیت رکھتی ہیں جوکہ اردو زبان وادب کے سرمائے میں ایک بہترین اضافہ ہیں۔

تقی عابدی مقدمات کی صورت میں تخلیقی نثر میں بھی اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔اردو کے معروف ومشہور شعراء کے علاوہ گم شدہ شاعر وادیب جن کے کلام کو علمائے ادب یا مشاہیر ادب نے فراموش کردیا اُن کو بھی ادبی دنیا میں اُن کا نام اور مقام دلوانے کی پوری کوشش کرتے ہیں اوراس کام کو بڑے ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ کائنات نجم اور تعشق لکھنوی اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔اس حوالے سے تقی عابدی لکھتے ہیں:۔

> ''جب بھی فنکار پر ظلم ہوتا ہے تو اردوادب کی روح تڑپ اُٹھتی ہے اس پرُ آشوب دنیا میں حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا چنانچہ دیگر افراد کی طرح میری بھی سعی وکوشش یہی رہی ہے کہ ایسے نامور شعراء اور ادباء جن کے ساتھ اہل قلم انصاف نہ کرسکے ان کے فن اور شخصیت کو کسی طور اجاگر کیا جائے۔''(8)

اب تک تقی عابدی کی چاردرجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو ان کی محنت اور تندہی کا واضح ثبوت ہیں۔مغربی ممالک میں اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں کی جانے والی جدو جہد کے سلسلے میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔اردو کی نئی بستیوں میں منعقد کرائے جانے والے سمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی آپ سرفہرست ہیں۔ان کے انعقاد میں آپ

نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ رسم الخط کی حفاظت کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات قابل تحسین ہیں۔آج کل آپ کنیڈا میں اردو کے فروغ کے لئے مصروف عمل ہیں اور ادب آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ کو اُردو ادبی دنیا ایک معتبر اور مستند محقق ونقاد کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔آپ نے دیار غیر میں رہ کر علم وادب کی ایسی بے مثال شمع روشن کی ہے جس سے ہمارے قلوب منور ہو رہے ہیں اپنی تصنیفات وتالیفات کے علاوہ آپ دو درجن سے زیادہ قومی اور بین الاقوامی سطح کے ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔اس طرح آپ کا ادبی سفر اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جاری وساری ہے۔

(ج) اعزازات وانعامات:

تقی عابدی اردو کی نئی بستیوں میں جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں ایک امتیازی اور اہم نام ہے جنہوں نے مختلف موضوعات پر توجہ دی اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین وتالیف کر کے کئی کتابیں منظر عام پر لائیں جو شاید بہت کم لوگوں سے ممکن ہوتا ہے شعر وادب کے تعلق سے ان کے عزم وہمت جذبہ وشوق لگن اور اخلاص کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے تحقیق کے دشوار گذار اور صبر طلب مراحل کو نہایت خوش اسلوبی سے طے کرلیا ہے۔تقی عابدی کی تحقیق تدوین وتالیف کی فہرست کافی طویل ہے۔جس کا ذکر آئندہ کے صفحات میں آئے گا۔

بیسویں صدی کے محققین کے تحقیقی کام پر اگر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اہم موضوعات پر اچھا خاصا تحقیقی کام کیا ہے۔جس کی وجہ سے آئندہ نسلوں کے محققین

کے لئے زیادہ کچھ کر دکھانے کو باقی نہیں رہ گیا ہے مگر آگے کے مراحل زیادہ دشوار ہو گئے ہیں۔لیکن جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق میں کبھی حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ حرف آخر سے آگے بھی کچھ ہوتا ہے۔تقی عابدی اس حرف آخر کے آگے کے تحقیق کار ہیں آپ نے اپنے ذوق وجستجو کے بل بوتے پر کچھ برسوں سے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں شائع کر کے تحقیق کے میدان میں اپنی ایک محکم جگہ بنالی ہے۔جس میں میر انیسؔ،اقبالؔ،غالبؔ،فیضؔ اور مرزا دبیرؔ خصوصی محور رہے ہیں۔

یہ اُن کی کڑی محنت اور جذبے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب تک انہیں بے شمار اعزازت وانعامات سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ان کے اعزازات کی فہرست بھی اتنی ہی طویل ہے جتنی کہ ان کی ادبی کارناموں کی تقی عابدی کے اعزازات اور انعامات کی فہرست یوں ہے۔

ا۔**قاضی شفیع محمد فخر اردو انٹرنیشنل ایوارڈ**:یہ ایوارڈ ڈاکٹر سید تقی عابدی کو 25رستمبر 2004ء کو لاس اینجلس میں منعقد ہونے والے اردو مرکز انٹرنیشنل کے سالانہ مشاعرے میں دیا گیا ۔ یہ ایوارڈ ہر سال پوری اردو دنیا میں کسی ایسی شخص کی خدمات کو سراہنے کے سلسلے میں دیا جاتا ہے جس نے اردو کی خدمت بڑے خلوص اور نیک نیتی سے کی ہو۔اس میں کسی ملک طبقے یا رنگ کی تخصیص نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی طرفداری جانب داری یا ذاتی رشتے یا تعلق کو دخل ہوتا ہے۔اردو مرکز انٹرنیشنل سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص اس ایوارڈ کے لئے منتخب نہیں ہوسکتا۔تقی عابدی کے علاوہ اس ایوارڈ کو حاصل کرنے والوں میں جناب حمایت

علی (سال2002ء) جن کا تعلق پاکستان سے ہے اور جناب کلیم عاجز (سال2003ء) جن کا تعلق ہندوستان سے ہے کا نام شامل فہرست ہے۔

۲۔حسان اردو انٹرنیشنل ایوارڈ: تقی عابدی کو اس ایوارڈ سے سال2007ء میں لاس اینجلس میں یکم دسمبر 2007ء کو منعقد ہونے والے انٹرنیشنل مشاعرے میں سرفراز کیا گیا۔ اردو ادب میں نعت منقبت اور تصوف کے سلسلے میں آپ کی تحقیقی اور تحریری کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے اردو مرکز انٹرنیشنل ایوارڈ کمپنی نے آپ کو اس ایوارڈ سے نوازا۔

۳۔انیسؔ و دبیرؔ ایوارڈ: یہ ایوارڈ آپ کو بھارت میں سال2007ء میں دیا گیا۔

4. Allama Iqbal Award of Excellence (By the Government of ontario Premiere Erine Eves. Canada)

۵۔ امتیاز اردو ایوارڈ: یہ ایوارڈ تقی عابدی کو تامل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے سال2010ء میں دیا گیا۔

۶۔ اردوادب ایوارڈ: یہ ایوارڈ انہیں اتر پردیش ساہتیہ کمیٹی کی طرف سے سال 2010ء میں دیا گیا۔

۷۔ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ: یہ ایوارڈ آپ کو ساحر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے سال2011ء میں دیا گیا۔

8. Award of Excellance: Hyderabad Deccan Foundation of Canada.

۹۔میر تقی میر ایوارڈ: امریکن فیڈریشن آف انڈین مسلم کے اکیسویں عظیم الشان جلسے میں

جو 29 دسمبر 2012ء کو حیدر آباد میں منعقد ہوا اور جس میں کثیر تعداد میں مندوبین نے شرکت کر کے موقعہ پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کو ان کی ادبی خدمات پر میر تقی میر ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ میر تقی میر ایوارڈ اقیمی کی کمیٹی کی جانب سے اردو کی ان شخصیات کو دیا جاتا ہے جن کی اردو ادبی خدمات بے مثال ہوں۔ اب تک یہ ایوارڈ شمس الرحمٰن فاروقی، مجتبیٰ حسین اور گلزار کو دیا جا چکا ہے۔

۱۰۔ پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ: کاروان الہ آباد 2012

10. Award of outstanding Contribution to Litterature from Multiview Bureau of greater Toronto (canada)
11. Life time Achievement Award for Excellence in literature-Alligarh University Alumni New Jersy 2014
12. Award for contribution and achievement in Urdu language and Literature, IAME 2014
13. Writer of the year Award, Eastern News Canada, Toronto Canada.
14. Award of Distinguished services and contribution to Urdu literature Alligarh University Alumni, New York, USA
15. Fakhre-e-Urdu International Award, Urdu Markaz International, Los Angels California, USA.
16. Sardar Jafry literacy Award, the Alligarh Allumni, Association, Texas 2014
17. Award of Excellence: Idare-Faiz-Adab Washington, USA.
18. Nishne Imteyaz, Anees Dabeer Award, India
19. Award of Excellence: Campack chamber Toronto, Canada.
20. Distinguished services to Urdu Literature ADNA-USA
21. Best Critic and research in Urdu Poetry Idare-Faiz-Adab,

Washington, USA.

22. Special Literacy Award, UMAA, 2009

23. Sir Syed day Distinguished Service Award: Alligarh Allumni Association New York Tri-State کی جانب سے شمالی امریکہ میں اردو لٹریچر میں نمایاں کارکردگی اور انیس شناسی کے حوالے سے دیا گیا۔

۲۴۔ انعام امتیاز: تقی عابدی کو یہ ایوارڈ 14/اگست 2010ء کو اردو تحریک عالمی یوکے (UK) اور اردو سوسائٹی کی طرف سے اردو ادب کے تئیں ان کی بیش بہا علمی وادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا گیا۔

۲۵۔فیض احمد فیض ایوارڈ: فیض احمد فیضؔ کے فن اور شخصیت پر اب تک متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں تاہم شریف اکیڈمی جرمنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' کو اس ایوارڈ کا حق دار مانتے ہوئے پاکستان میں منعقد ہونے والے اکیڈمی کے سالانہ پروگرام میں انہیں اس ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

۲۶۔ عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ: عالمی شہرت یافتہ تنظیم مجلس فروغ اردو ادب دوحہ۔قطر گذشتہ (۲۵) پچیس سالوں سے اردوادب کے فروغ کے لئے مصروف عمل ہے ۔مجلس نے ۲۰۱۲ میں نصیر الدین شاہ کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر اُن کی خدمت میں خصوصی عالمی فروغ اردو ایوارڈ پیش کیا ''امسال بھی چیئر مین مجلس محمد عتیق کی سربراہی میں مجلس انتظامیہ کے عہدیداران نے معروف شاعر نقاد محقق اور دانشور ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی وتنقیدی اور ادبی خدمات کوتسلیم کرتے ہوئے ان کا نام ''خصوصی عالمی فروغ اردو

ایوارڈ'' کیلئے منتخب کیا ہے۔ یہ ایوارڈ آپ کو نومبر ۲۰۱۷ء کے پہلے ہفتہ میں دوحہ قطر میں پیش کیا جائے گا۔

(د) :تقی عابدی مشاہیر کی نظر میں:۔

میں یہاں اُردو ادب کے اُن اہم مشاہیر کے بیانات رقم کر رہی ہوں جو انہوں نے تقی عابدی کی شخصیت اور فن پر وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔ ان مشاہیر کے اقتباسات کو رقم کرنے کا یہاں میرا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ قاری تقی عابدی کی قد آور ادبی شخصیت کا اندازہ لگا سکیں۔ تقی عابدی سے متعلق نثار احمد فاروقی رقمطراز ہیں۔

> ''تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا عزیزم شاہد حسین نے آپ کی کتاب ''تجزیہ یادگار انیس'' کا ایک نسخہ آپ کی جانب سے بطور ہدیہ عنایت کیا نہایت ممنون ہوں کہ اس بیش بہا ادبی سوغات کے لئے آپ نے اس گمنام کو بھی یاد رکھا کتاب کی تعریف سے قلم عاجز ہے الفاظ گنگ ہیں زبان لال ہے ظاہری حسن و جمال ہی بے مثال ہے۔ مگر یہ تو زیادہ خرچ کرنے سے پیدا کیا جا سکتا ہے کہ آپ سونے کے حروف میں کتاب چھپوا دیں اس کا اصلی حسن وجذبہ اور گہری عقیدت ہے جو آپ کو موضوع کتاب سے ہے اور میر اانیس مرحوم یقیناً اس قدر دانی کے سچے حقدار تھے۔ اس کتاب میں ان کے بارے میں اتنی معلومات جمع کر دی گئی ہیں جو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

پھر مرثیہ انیسؔ کا تجزیہ جس عالمانہ ژرف نگاہی دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی سے کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے آج تک اردو تو کیا انگریزی کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب کے فن کا تجزیہ ایسی عمیق نگاہ سے نہیں کیا گیا۔(۹)

شان الحق حقی کا کہنا ہے کہ:

''ایک بات جو میں آپ سے کہہ نہ سکا اب تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ جس پائے کے مصروف طبیب اور ادیب ہیں اپنے وقت کی اس طرح قدر نہیں کرتے ہیں۔ ادباء اور شعراء کے لئے آپ جس طرح ہر وقت اور ہر گھڑی جس بے دردی بلکہ بے رحمی سے وقت اور وسائل لٹاتے ہیں اس کی داد کم از کم میں نہیں دے سکتا اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت دینا چاہوں گا۔ اس حقیر فقیر نے سرسری طور پر آپ کی ان کتب کی جانب اشارہ کیا تھا جن سے یہ عاجز محروم ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری کتب اتنے بھاری بھر کم مالیت کے ٹکٹ لگا کر کراچی پاکستان ارسال فرمائیں جبکہ میرا کناڈا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے بہر حال اس عنایت خاص کے لئے بے حد کر شکر گزار ہوں اور آپ کی صحت وسلامتی کے لئے دعا گو بھی قدرت نے مہلت دی تو مرسلہ کتب کی بابت ضرور کچھ لکھوں گا۔''(۱۰)

شبنم رومانی فرماتی ہیں:

''یوں تو آپ کی شخصیت وفن کے سحر نے ''گلشن رویا'' کی تقریب رونمائی کے زمانے سے ہی ناچیز کو گرفت میں لے لیا ہوا ہے مگر انیس اور دبیر پر آپ کے حالیہ کارنامے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آپ سمندر پار مقیم عاشقان اردو میں اول وافضل مقام پر برحق طور پر فائز ہو چکے ہیں مستقبل کے حوالے سے میری امیدیں آپ کی ذات کی نسبت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔''[۱۱]

گیان چند جین رقمطراز ہیں:

''ایک زمانہ سے آپ کی شہرت وناموری سماعت تک محدود تھی مگر جب آپ برادرم تابش خانزادہ کے ہمراہ عزیزی گلزار جاوید کے جریدے ''چہار سو'' جسے گلزار جاوید سے زیادہ محترمی ضمیر جعفری مرحوم کا جریدہ کہا جائے تو مناسب ہوگا، کی خاص اشاعت کے لئے مسودات اور تصاویر طلب کرنے کی غرض سے تشریف لائے اور اپنی'' تازہ تصانیف ''سبد سخن اور ''انشاء اللہ خان انشا'' پیش کیں تو میری خوشی کی انتہا آپ یا برادرم تابش صاحب ہی لگا سکتے ہیں۔ میری نظریں آپ کی تازہ اور آمدہ کتاب میر انیس کے تجزیے پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے آپ اس نادر کتاب کو میری رخصتی سے قبل منظر عام پر

لے آئیں تا کہ اس کے مداحین میں ایک اور نام کا اضافہ ہو سکے۔''(۱۲)

محسن بھوپالی کا کہنا ہے کہ:

''آج کا دِن میرے لئے آپ کی بلند اقبال کتب کی شکل میں خوش قسمت دِن ثابت ہوا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں برادرم گلزار جاوید کا شکریہ ادا کروں یا آپ کے روبرو اظہار سپاس کروں کہ آپ نے کس قدر اہم اور نابغہ کتب کا تحفہ عطا فرمایا ہے۔اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں یا ان کتب کا طلبگار آپ کے ہاں حافظ اور خسرو سے عقیدت کا جو انداز ہے وہ انوکھا نرالہ نہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ضرور ہے آپ نے ان بلند قامت شعراء کی شاعری کو جس تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا اور پرکھا ہے اس سے آپ کی اردو اور فارسی کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ اردو شاعری کی آبرو میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور دبیرؔ کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبالؔ کی شاعری اور شخصیت پر آپ کی جو نظر اور اس کے جو مختلف پہلو ہیں انہیں نہایت بصیرت افروز کہا جا سکتا ہے اور انہیں اردو وادب میں خصوصی اضافے کی حیثیت کا حامل بھی گردانا جا سکتا ہے۔آپ کی شاعری تنقید و تحقیق کی متنوع جہات کا تقاضا ہے۔کہ تمام علمی اور ادبی ادارے اور افراد آپ کی بجا اور بھرپور حوصلہ افزائی فرمائیں اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ بھی نہیں اردو ادب اور شاعری کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔''(۱۳)

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات پر فخر حاصل ہو رہا ہے کہ میں نے شہر آشوب وادی کشمیر میں آپ کی کتاب کے مسودے ''تجزیہ یادگار مرثیہ'' ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کو متعدد بار پڑھا۔ اس کے بعد پانچ مرتبہ اس کی پروف ریڈنگ کا شرف بھی حاصل رہا۔ کتاب پڑھ کر میری حسرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک پیشہ ور معالج (ڈاکٹر) کو اتنا وقت کہاں سے میسر ہوتا ہے کہ وہ ایسی بھاری بھرکم اور ضخیم ترین کتاب لکھ سکے۔ میں خود رثائی ادب کا ایک کم مواد طالب علم ہوں جس نے اردو لٹریچر میں ستر سے زائد کتابیں تصنیف کیں ہیں، یہ بات بلا خوف تردید پورے مطالعہ ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایسی معتبر مستند اور معلومات افزا کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ کا یہ صحیفۂ ادب چودہ باب پر مشتمل ہے۔ آخری تین باب نہایت اہم ہیں۔ جو نہایت دیدہ ریزی اور محنت شاقہ سے مرتب کئے گئے۔ تیرہواں باب، تجزیہ کامل حاصل کتاب ہے۔ اس میں آپ نے ہر بند کے سامنے پورے صفحے میں تجزیہ کیا اور وہ شعری محاسن دکھائے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے کتاب کے آخر میں دو بیش بہا گوہر نایاب کو بھی شامل کیا جو عرصے سے برصغیر ہند میں عنقا ہو گئے تھے۔ یعنی مشہور مفسر قرآن سید العلماء مولانا سید علی نقی قبلہ مرحوم سابق ڈین شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا منظوم عربی ترجمہ اور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا منظوم انگریزی ترجمہ۔ ان دونوں ادبی شاہکاروں کو کتاب میں شامل کرکے آپ نے انہیں حیات جاودانی

سے ہمکنار کیا۔ میں آپ کو اس عظیم کارنامے کی ترتیب واشاعت پر دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور سلام عقیدت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ایسا شاندار اور بے مثل کام کیا جو آج تک کسی سے نہ ہوسکا۔ اگر اردو لٹریچر اور رثائی ادب کی تاریخ از سر نو رقم کی جائے تو آپ کا نام ممتاز ماہرین انیسیات میں سرفہرست ہوگا۔ جب تک دنیائے اردو میں خدائے سخن میر انیسؔ کا سکہ جاری رہے گا۔ آپ کی یہ کتاب بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جائے گی۔(۱۴)

صبا اکبر آبادی کا کہنا ہے کہ:

کچھ عرصے سے رثائی ادب کو اردو ادب میں ایک طرح سے فراموش کیا ہوا ہے۔ مگر نوجوان اور پرعزم تقی عابدی صاحب نے اپنی جولانئ طبع کو بروئے کار لاتے ہوئے رثائی ادب کے بانیوں جانثاروں اور معماروں کی نسبت جس قدر جستجو اشتیاق اور تحریک کو کام میں لاکر نئے نئے گوشے اور نکات دریافت کئے ہیں اس کے باعث یہ فراموش شدہ صنف ادب ایک بار پھر سے زندہ اور توانا ہوگئی ہے۔''(۱۵)

معروف افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی تحریر کرتے ہیں:

''ڈاکٹر سید تقی عابدی سچے عاشق اردو اور پکے مرثیہ شناس دانشور محقق اور نقاد ہیں۔ اُن کا اشتیاق اور لگن دیکھ کر ان پر پیار بھی آتا ہے اور غصہ کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آج کے دور

میں اپنے کام سے اس قدر لگاؤ مشکل ہی دیکھنے میں آتا ہے۔اس لئے ہم تقی عابدی صاحب کا دم غنیمت جانتے ہیں کہ انہوں نے دیار غیر میں جس اخلاص سے اردو ادب کا پودا لگایا ہے اور جس شیفتگی سے اس کی آبیاری کرر ہے ہیں ایک نہ ایک دِن یہ نرم نازک پودا ضرور تناور درخت کا روپ اختیار کرے گا۔"(١٦)

پروفیسر صغرا مہدی لکھتی ہیں:

"تقی عابدی کا نام اردو دنیا کے لئے نیا نہیں ہے۔موصوف کا پیشہ ڈاکٹری اور دلچسپی اردو ادب سے ہے شعر بھی کہتے ہیں اور رہائش کنیڈا میں ہے۔ ہندوستان آ کر یہاں بھی تنقید اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے شوق کو مہمیز کرتے رہتے ہیں ۔موصوف کا خاص میدان رثائی ادب ہے۔ دو سال پہلے آپ ہندوستان تشریف لائے ساتھ میں اپنی مرتب کی ہوئی کتاب یادگار انیسؔ بھی لائے جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں۔تقی عابدی صاحب کے اعزاز میں جگہ جگہ انیسؔ پر سمینار ہوئے انہوں نے لوگوں کو انیسؔ پر مزید کام کرنے پر اکسایا ، ماہرین انیسؔ سے رابطہ قائم کیا ہم سمجھے موصوف انیسیے ہیں۔مگر ابھی حال میں شاہد پبلی کیشنز دریا گنج سے تین ضخیم کتابیں موصول ہوئیں جو تقی عابدی نے بہت عرق ریزی اور عالمانہ انداز میں مرتب کی ہیں۔اور بہت صحت اور خوبصورتی سے شائع ہوئی ہیں۔"

(١) مثنویات دبیر،(٢) ابواب مصائب،(٣) مصحف فارسی ۔ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا

کہ موصوف کا شمار انیسؔ کے ان مداحوں میں نہیں ہے جو اپنے پیروں کو اڑاتے ہیں ہندوستان میں بھی دبیرؔ پر کچھ کام ہورہا ہےاور ماہرین دبیرؔ یہاں بھی موجود ہیں۔مگر مذکورہ بالا تینوں کتابوں میں جو معلومات دبیرؔ کی سوانح اور شاعری ونثر کے بارے میں فراہم ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اب تک کہ تحقیق میں کس قدر کمی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تینوں کتابیں اردو اور فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں ۔ ہم مشکور ہیں تقی عابدی صاحب کے کہ وہ دیارِ غیر میں رہ کر اپنی زبان وادب کو نہیں بھولے اور گاہے گاہے ہندوستان آ کر ہم لوگوں کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ تحقیق ایسی ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ مرحلہ شوق ط نہ ہواور وہ اسی طرح بے مثال علمی کارنامے انجام دیتے رہیں۔''(۱۷)

بقول ہلال نقوی:

''مرثیے کے محقق اعظم مسعود رضا رضوی ادیب نے 1943ء میں شاہکار انیسؔ کے نام سے انیسؔ کا جو مرثیہ پوری اردو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا آج تقریباً ساٹھ سال بعد اسی مرثیے کو ڈاکٹر تقی عابدی نے فنی ولسانی تشریحات کے ساتھ ایک ایسے نئے زاویے سے اجاگر کیا ہے کہ اہل تحقیق حیران ہیں یہ حیرانی انیسؔ کی شعری عظمت کی تہہ داریوں پر بھی ہے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی فنی وتحقیقی بصیرتوں پر بھی ۔ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اس حیران کن ادبی خدمت نے انیس پر لکھنے سوچنے اور سمجھنے کے کئی دریچے کھول دیئے ہیں۔ ہر دریچہ ایک نئے مظہر کا اظہار ہے اور یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ ابھی انیسؔ کی دریافت کے مراحل بہت

باقی ہیں۔ میں نے ٹورانٹو میں ڈاکٹر تقی عابدی کا کتب خانہ دیکھا ہے ان کے گھر رہا ہوں اس کتب خانے میں ڈاکٹر اکبر حیدری اور ڈاکٹر انیسؔ اشفاق کے ساتھ میں نے کئی دن گذارے ہیں۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا بھی یہی کہنا تھا کہ انیسؔ و دبیرؔ اور اردو مرثیے کے متعلق اس کتب خانے میں انتہائی گراں قدر نوادرات ہیں ڈاکٹر تقی عابدی جیسے مرثیہ شناس اور علم دوست شخصیت کے پاکستان آنے پر ان کی کتاب کی رسم اجراء اور انیسؔ پر گفتگو کا جو اہتمام اقبال کاظمی صاحب نے کیا ہے اس پر وہ ہم سے کئی مبارکباد کے مستحق ہیں۔‘‘(۱۸)

معروف اُردو شاعر احمد فراز فرماتے ہیں:

’’تقی عابدی کچھ نہ بھی کرتے تو ادباء وشعراء کی خدمت میں بہت کچھ کر سکتے تھے مگر انہوں نے نہ صرف کچھ کرنے کی دل میں ٹھانی بلکہ بہت کچھ کر بھی گذرے اور آئندہ بھی ان سے بہت کچھ سرزد ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔‘‘(۱۹)

باقر زیدی کا کہنا ہے کہ:

> ’’ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دنیائے اردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت لگاتار کوشش گہری لگن اور ایک بے دریغ اور مسلسل جذبۂ عمل کا صلہ ہے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگردانی نے انہیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ عطا کیا ہے۔تحقیق وتنقید کے بڑے اہم قلمکاروں میں شمار

ہوتے ہیں اردو زبان کے مضبوط اور کہنہ منطقوں ہندوستان اور پاکستان سے
دور رہ کر بھی جو احترام و اعتبار انہوں نے کمایا ہے وہ لائق تحسین ہی نہیں
قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہے۔''(۲۰)

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

''ادب کی دنیا دعوے کی نہیں دلیل کی دنیا ہے۔ یہاں نام نہیں کام بولتا ہے اگرچہ خالی نام کا سکہ چلانے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن ٹانکا نکلتے دیر نہیں لگتی۔ البتہ ادب کی آبروان لوگوں سے ہے جو خلوص نیت اور لگن سے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں اور دردمندی وانکساری سے کشت ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں انہوں نے ایک کے بعد ایک جو مطبوعات پیش کی ہیں۔ وہ کسی کے لئے بھی باعث رشک ہوسکتی ہیں۔ رثائی ادب انیسیات، اقبالیات، غالبیات، فیضیات کیسے کیسے میدان دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سر کیے ہیں ''لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر''

وہ خطیب بھی ایسے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں اور مشاعرے بھی لوٹتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ان پر ''چہار سو'' کا نمبر آرہا ہے۔ دعا گذار ہوں کہ خدا انہیں زخم چشم سے محفوظ رکھے اور اسی طرح اپنے کام میں مگن رہیں۔ (۲۱)

اردو ادب کے بلند قامت افسانہ نگار انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر سید تقی عابدی ہمارے عصر کے نامور ریسرچ اسکالر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کی شہرت کی خاصی پہچان انیسؔ شناسی گردانی جاتی ہے۔حالانکہ آپ نے مرزا دبیرؔ پر بھی بہت کام کیا ہے اور بہت سے نئے نکات سامنے لائے ہیں۔جن سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔انیسؔ ودبیرؔ کے علاوہ آپ نے انشاءاللہ خان انشاء،نجم آفندی اور علامہ اقبالؔ پر بھی دقیق نگاہی سے کام کیا ہے جسے نہ سراہنا یا صرف نظر کرنا تقی عابدی سے نہیں بلکہ اردو ادب سے ناانصافی شمار ہوگی۔''۲۲

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تحریر کرتے ہیں۔

''فیضؔ فہمی'' تقریباً ڈیڑھ مہینہ کے بعد کہیں جا کر ہماری دسترس میں آئی ہے اور اسے دیکھ کر بے اختیار آپ کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ بظاہر تو یہ مضامین کو یکجا کیا گیا ہے لیکن آپ نے کمال محنت وکوشش اور تگ ودو سے فیضؔ سے متعلق نہ صرف مضامین ومقالات وتصاویر بلکہ ان کی تصانیف پنجابی تخلیقات ان کے تراجم مقدمے اور غیر مدون کلام یکجا کردیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک بڑے تحقیقی منصوبے کے بغیر ممکن نہ تھا۔پھر ان تمام چیزوں کو اس قدر خوبصورتی سلیقے اور نفاست سے مرتب اور شائع کیا گیا ہے کہ اس کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا۔فیضؔ کے عقیدت مند تو بہت ہیں ان کے نام لیوا بھی

ایک سے بڑھ کر ہیں۔لیکن ان میں تقی میں اپنے کارنامے پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔یہ ایسا بھاری بھرکم منصوبہ تھا۔جس نے مجنونانِ فیض پر گرانی کی مگراس کو یہ ناتواں اُٹھالایا۔"(۲۳)

ڈاکٹر رشید گُل ٹورانٹو،کینڈا کا کہنا ہے کہ:

ڈاکٹر تقی عابدی جیسی قدآور علمی اور ادبی شخصیت پر قلم اٹھانے کی جسارت کرنا بلاشبہ ایک بہت بڑی گستاخی اور بے ادبی متصور ہوگی۔لیکن ایسی شخصیت کی علمی ادبی اور تحقیقی کاوش نہ سراہنا بھی راقم الحروف کے نزدیک بڑے درجے کی تنگ نظری اور بخیلی ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی فیض نوازی بشکل "فیض فہمی" پر رائے زنی کو اپنے خیال میں مناسب روا اور جائز سمجھتا ہوں سب سے پہلی بات جس نے بندۂ ناچیز کو مجبور کیا کہ وہ مذکورہ کتاب اور اس کے مصنف اور محقق کے حوالے سے چند معروضات پیش کرے،وہ یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا غیر جانبدارانہ غیر متعصّبانہ اور عادلانہ تبصرہ ہے محقق اور مصنف نے عہد ساز انقلابی اور روحانی شاعری کی زندگی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ مذکورہ شاعر کی زندگی کا کوئی گوشہ عدم توجہی بے اعتنائی کا شکار نہ ہونے پائے۔"فیض فہمی" کے مصنف اور ناقد نے عامی اور عالم کے ذوق سلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے فیض کی ذاتی زندگی ان کے فن شاعری اور نظریات کے متعلق مشاہیر عالم اور عہد حاضر کے نامور شاعروں ادیبوں اور نقادوں کے خصوصی مضامین شامل کرکے حق فیض ادا کیا ہے۔ڈاکٹر سید تقی عابدی کا یہی ایک

وصف ہی ان کو صاحبان نقد ونظر کی ذہنوں اور دلوں میں تا قیامت مسند قدر ومنزل پر بٹھانے کے لئے کافی ہے ۔موصوف نے علاقائی وجغرافیائی حدوں بغض اور کینہ کے اندیشوں سے اٹھ کر بڑے ہی متوازن مدبرانہ اور منصفانہ انداز میں مذکورہ کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر کے اپنی علمی وادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے دور حاضر کے مصنّفین اور ناقدین کیلیئے ایک ایسا گراں قدر اور انمول تحفہ فراہم کیا ہے جو کہ نادر ہونے ساتھ ساتھ عدیم المثال بھی ہے ۔ مذکورہ کتاب کی ضخامت طباعت اور کتابت دیکھ کر بلا اختیار ڈاکٹر صاحب کے حسن ذوق نفاست اور سخاوت کی داد دینی پڑتی ہے۲۴۔"

علامہ اعجاز فرخ لکھتے ہیں

"فیض پر بہت کچھ وہ تمام بھی جو فیض کا حق تھا وہ بھی جو کم قامتوں نے فیض پر لکھ کر خود کو بلند قامت کرنے کی ناکام کوشش کی کچھ یوں بھی ہوا کہ مختلف مقالوں سے کیر پیوست کر کے نئے عنوانات تراشے گئے لیکن فیض کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک ایسی مستند دستاویز کی تیاری جو شائقین ادب مداحان فیض کے ساتھ ساتھ محققین کے لئے بھی سود مند ثابت ہوا ایک سنگِ گراں بار سے کم نہ تھی۔کم حوصلہ تو شائد "بوجھ کس ناتواں سے اٹھتا ہے" کے مصداق اس بھاری پتھر کو چوم کر ہٹ گئے ۔ اردو دنیا کے وہ نامور اہل قلم جن پر اردو کو بجا طور پر ناز ہے ۔ انہوں نے فیض کو دریافت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ، چنانچہ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض پر 120 صاحبان علم وفن کے وہ مقالے جمع کئے جو نہ صرف مستند کتابیاتی

حوالوں کے ساتھ تھے بلکہ فیض فہمی کے باب میں ایک عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے تھے۔
جب سب کچھ جمع کیا جاچکا اور ترتیب کا مرحلہ درپیش ہوا تو ڈاکٹر تقی عابدی کی باریک بینی نے کائنات فیض میں ان 42 جزیروں کو دریافت کیا جن پر ابھی کسی کی نظر ہی نہیں گئی تھی اس تلاش نے تقی عابدی کو ایک نئی جولانی کے ساتھ آمادۂ سفر کیا غیر مانوس جزیرے اجنبی زمنیں تلاش مسلسل ایسے میں آبلہ پائی تو مقتدر ہو ہی جاتی ہے۔لیکن ہزار آبلہ پائی کے باوجود ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ مہم سرانجام کی اور تنہا سر کی۔(۲۵)

شکیل آزاد

تقی عابدی کی کتاب کائنات نجم سے متاثر ہوکر انہیں یوں شعری خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:۔

تحقیق وتدوین۔ڈاکٹر سید تقی عابدی

ارث ادب میں وسعت امکاں ہیں عابدی
روشن چراغ طاق دبستاں ہیں عابدی
اہل سخن ہیں نیر تاباں ہیں عابدی
کس کو ہسار عزم کے انسان ہیں عابدی
تحقیق کے قلم کی رگ جاں ہیں عابدی

اہلِ ادب کے درد کا درماں ہیں عابدی

ہر زاویئے سے رحمت باراں ہیں عابدی

کہتا ہے کون؟ بے سروساماں ہیں عابدی

منزل بدوش جوئے پریشاں ہیں عابدی

ہر کام میں خلوص بھی رکھ رکھاؤ بھی

کہہ دو شکیل! جان ودل ہیں عابدی"(۲۶)

مندرجہ بالا دانشوروں کی آراء سے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں ہوتی ہے کہ اردو شعروادب میں تقی عابدی ایک متنوع شخصیت کے حامل ہیں جنہوں نے اپنے قلم کو بروئے کار لاکران ممالک میں اردو کی شمع کو روشن رکھا ہے جہاں اس زبان کے چاہنے والے اس قدر نہیں ہیں جس قدر برصغیر ہندو پاک میں ہیں۔اس کے باوجود تقی عابدی کے اُردو کی نئی بستیوں میں اُردو کے علم کو جس طرح بلند رکھا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تحقیقی کارنامے انجام دے کر اُردو تحقیق اور ادب میں جو اضافہ کیا ہے اسے بھی اُردو ادب کا قاری ہمیشہ یادرکھے گا۔

حواشی

(1)چہار سو، جلد۱۸، شمارہ مئی۔ جون۔ 2009ء، راولپنڈی فیض الاسلام، پرنٹنگ پریس،ص ۱۷

(2)ماہنامہ چہارسو راولپنڈی پاکستان، مئی جون،2009ء ص17-16

(3)ماہنامہ شاعر (ممبئی) شمارہ نمبر80،اکتوبر 2015ء،ص نمبر 14

(4)ماہنامہ شاعر،ممبئی شمارہ86،اکتوبر 2015،ص14

(5)ایضاً،ص15

(6)ایضاً،ص18 سے 19

(7)ایضاً،ص18

(8) ماہنامہ چہارسو،راولپنڈی، پاکستان مئی، جون 2009ء،ص18

(9) ماہنامہ شاعر ممبئی۔اکتوبر ۲۰۱۵ شمارہ نمبر ۸۶،جلد نمبر ۵۹،صفحہ نمبر ۳۱)

(10) ۱۰رفروری 1998ء کراچی پاکستان

(11)5جولائی 2007ء،کراچی پاکستان)

(12)4 مئی،2002ء،نیویارک۔امریکہ)

(13)14 جون،1999ء کراچی پاکستان

(14)30 جولائی،2002ء،سرینگر کشمیر

(15)ایضاً،صفحہ نمبر۳۲

(16)ایضاً

(17)ایضاً

(18)ایضاً

(19)ایضاً

(20)ایضاً

(21)ایضاً

(22)ایضاً

(23)تقی عابدی سے موصول ہوئے ایک اقتباس سے،7 مئی،2017)

(24)ایضاً

(25)ایضاً

(26)ایضاً

باب دوم

تقی عابدی کی مجموعی ادبی خدمات

تقی عابدی کا تعلق طب کے میدان سے ہے مگر اردو کے تحقیق وتنقیدی سرمائے پر اُن کی گہری نگاہ ہے۔آپ نے اردو کی نئی بستیوں میں تن تنہا تحقیق وتنقید کے میدان میں جو نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔اس نے شمالی امریکہ میں خصوصاً اور اردو کی نئی بستیوں میں عموماً تحقیقی وتنقیدی منظر نامے کو کافی معتبر بنا دیا ہے۔علمی وادبی تحقیق وتنقید میں آپ اپنی نظیر آپ ہیں برصغیر سے بہت دور اردو کی نئی بستیوں میں آج جو شعر وادب کے نمایاں چراغ روشن ہیں ان میں تقی عابدی ایک امتیازی نام ہے۔انھوں نے ایسے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین وتالیف کر کے ادبی دستاویزات کو منظر عام پر لایا ہے۔جو شائد کم لوگوں سے ممکن ہو پاتا ہے۔شعر وادب کے تعلق سے ان کا عزم اور ارادہ، جذبہ وشوق لگن اور محنت قابل دید ہے۔تقی عابدی نے تحقیق کے دشوار گزار اور صبر طلب مراحل کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا ہے۔ان کی تحقیق تدوین تشریح اور تالیف کی فہرست کافی طویل ہے۔لہٰذا اس حوالے سے باب میں ان کی مجموعی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔جن کو چار زمروں میں رکھا گیا ہے یعنی شعری خدمات، تحقیقی خدمات، تنقیدی خدمات اور اردو کی نئی بستیوں کے حوالوں سے ان ان کی خدمات۔

(الف) شعری خدمات:

تقی عابدی ایک دانشور، مہذب علم دوست ادب شناس خوش مزاج اور خوش گفتار انسان ہیں، الفاظ کا مخصوص انتخاب اور استعمال صاف وشفاف زبان، دل موہ لینے والا خلوص محبت

اور حیدر آبادی لہجہ ایسی خوبیاں ہیں جو ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان تمام اوصاف کی جھلک ان کی شاعری میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ طبیعت اور مزاج دونوں روایت پسند ہونے کی وجہ سے ان کی شعری تخلیقات میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے ادب میں میں ان کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ وہ ان دونوں زبانوں کے مزاج شناس ہیں۔ سخن گوئی کے ساتھ ساتھ سخن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ قدیم ادب سے بھی اتنا ہی واقف ہیں جتنا کہ جدید سے غالبؔ اور اقبالؔ دونوں سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔ اب تک تقی عابدی کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ ''گلشن رویا'' کے نام سے ادبی حلقوں میں مقبول و معروف ہے آپ بیک وقت ڈاکٹر، محقق، نقاد، شاعر اور عروض دان ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری سرمایوں میں انسان اور مسلم معاشرے کی بے سروسامانی کی کیفیت سنائی دیتی ہے۔ اور ''گلشن رویا'' نام بھی اسی مناسبت کی دین ہے۔ ''خواب میں بیدار ہوں میں یا ہے بیداری کا خواب'' تقی عابدی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے باخبر اور احساس سے لبریز انسان ہیں۔ اُن کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

ساحل پہ کھڑے ہو کے تماشا نہیں کرتے
ہم ڈوبتی کشتی کا نظارا نہیں کرتے

طوفان سے لڑا دیتے ہیں جو اپنا سفینہ
ساحل کو کبھی اپنا کنارا نہیں کرتے

تم دھوپ کے صحرا میں کسے ڈھونڈ رہے ہو
یہ جھاڑ ہیں کانٹوں کے جوسایا نہیں کرتے

کھیلے ہیں عجب طرح سے ہم عشق کی بازی
یوں جیتنے والے کبھی ہارا نہیں کرتے

اب پاس میرے کچھ بھی نہیں ہے جو لٹادوں
ہم دوستی اے دوست دوبارا نہیں کرتے

پھولوں کو لٹاتے ہیں جو شیشے کے
پتھر وہ کبھی شیشے پر مارا نہیں کرتے
خوشبو ہے تری یاد کی ہر وقت میرے ساتھ
ہم پھول کی خوشبو پہ گزارا نہیں کرتے

ہر گوشۂ دل میں تیری تصویر لگی ہے
ہم نقش کوئی اور اتارا نہیں کرتے

آنکھوں کے اشارے سے بلا سکتے ہیں جو بھی
وہ نام کبھی لے کے پکارا نہیں کرتے

جو لوگ تقی حسن کی عظمت کے ہیں قائل
وہ حسن کو پردوں میں گوارا نہیں کرتے (۱)

تقی عابدی کی شاعری میں ہندوستانی عناصر اور امکانات بھی موجود ہیں۔ جس کی واضح مثال ان کے شعری مجموعہ ''گلشن رویا'' کے اس شعر سے دی جاسکتی ہے:

؎ تھا گلستاں میں ذکر یار ایسا
جیسے مندر میں رام کی باتیں

تقی عابدی کی شاعری میں فکر کی بلندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ اپنے خیالات کو کبھی انیسؔ کے سوز و گداز کا رنگ دیتے ہیں اور کبھی اقبالؔ کے فلسفیانہ لب و لہجے میں شائستگی کے ساتھ برملا کہتے ہیں۔

؎ آج حیوان صفت پہنے ہیں انسانی نقاب
آج ہر ہاتھ میں رہتی ہے تمدن کی کتاب

آج ظالم کے حوالے ہے عدالت کا حساب
آج قمری کا نگہبان ہے خونخوار عقاب

ایسے عالم میں کوئی ہے جو حقیقت بولے
بندلاشوں پہ کوئی ہے جو درزندان کھولے۔ (۲)

تقی عابدی کی شاعری میں ان کے اردگرد واقع ہونے والے حالات واقعات کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ ان کے محسوسات کو بھی اولیت حاصل ہے۔ یہاں ان کی ایک نظم کے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں:۔

؎ کلی کو بادۂ شبنم پلا دیا میں نے
لہو سے کانٹے کا چہرہ سجا دیا میں نے

چمن کو آتش گل سے کبھی جلاتا ہوں
صدائے بانگ درا سے کبھی جگاتا ہوں

خیال کو پرے جبریل دے دیا میں نے
قلم میں رنگ گلستان کو بھر دیا میں نے

جو منزلوں کو ملائے وہ رہ گزار ہوں میں
چمن سرشت ہوں صحرا کا برگ وبار ہوں

صدائے کلک میں رودادِ زندگانی ہوں
میں کائنات کی اِک ان کہی کہانی ہوں(۳)

تقی عابدی انسانی محبت کے عنوان سے نظم وغزل میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ اظہار

خیال کرتے ہیں کہ قاری بھی ان کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے چند اشعار بطور مثال پیش کئے جارہے ہیں:

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
راستوں سے اگر رہنماؤں کو ہٹا دو

لوگوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانہ میں بٹھا دو

خود روشنی پھیلے گی محبت کی زمین پر
جو تم سے جفا کرتا ہے تم اس کو دعا دو

ہر شخص جیئے عزت نفسی سے جہاں میں
قانون مشیت ذرا ملّا کو بتا دو۔(۴)

ان کی شاعری محبت سچائی اور انسانی ہمدردی کے جذبوں سے بھی سرشار ہے جس کی واضح جھلک ان کی نظم ''بچوں کی ہنسی'' میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ نظم انہوں نے اپنی بیٹی ''رویا'' کے لئے کہی ہے نظم کے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

اچھی لگتی ہے فرشتوں کو بھی بچوں کی ہنسی
اس لئے خواب میں بچوں کو ہنساتے ہیں وہی

عرش اور فرش کی ہے جب یہ پسندیدہ خوشی
آؤ پھر مل کر کریں عام یہ بچوں کی ہنسی

کتنے بچے ہیں کہ ہنستے نہیں اس دنیا میں
پیدا ہوکر بھی جو بستے نہیں اب دنیا میں

خون کابل میں رواں سرخ فلسطین کی گلی
دیکھی جاتی نہیں اب بوسینا میں بھی خوشی

ننھے بچوں کی ہنسی
جس کے سر پر ہے کھڑی
تیرہ وتار گھڑی
جو مصیبت سے بھری
روتے بچوں کو ہنسا دے یہ عبادت ہے بڑی
پونچھ دے آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسوں کی لڑی
بانٹ بچوں میں خوشی
دے دے بچوں کو ہنسی
حج اکبر ہے یہی

آب کوثر ہے یہی
نیک کاموں میں تقی
سب سے بہتر ہے یہی۔(۵)

اس نظم کے چند اشعار فلسطین میں ہورہے قتل وغارت کی کیفیت کوبھی بیان کرتے ہیں جہاں کئی معصوم بے گناہوں کوقتل کیا جارہاہے۔تقی عابدی کی اس نظم کے یہ اشعار قاری کی آنکھوں کواشک بار کردیتے ہیں ادبی حلقوں میں اس نظم کی بہت پذیرائی ہوچکی ہے۔اس میں جڑے جذبات واحساسات ہر دل کوموہ لیتے ہیں۔بچوں پر اتنی اچھی نظم تقی عابدی کو اہم شعرا کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔

تقی عابدی کی شاعری موجودہ وقت کے حالات وواقعات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔وہ اس دور کی سچی تصویروں کوعیاں کرتے نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کربھری ہوئی ہے جس کی مثال مندرجہ ذیل چند اشعار سے دی جاسکتی ہے:۔

؎حادثے کب کہاں نہیں ہوتے
کچھ عیاں کچھ بیاں نہیں ہوتے

جو کریں دشمنوں کو شرمندہ
دوست ایسے کہاں نہیں ہوتے

کاغذی پھول لاکھ رنگیں ہوں
شامل گلستاں نہیں ہوتے

جو بدل جاتے ہیں زمانے سے
وہ امام زماں نہیں ہوتے۔(۶)

تقی عابدی کی نظم ''حسن مطلق'' میں حسن و جمال کی مرقع کشی کی گئی ہے۔اس نظم میں انہوں نے حسن کو کئی پہلوؤں اور کئی زاویوں سے دیکھا پرکھا اور اشعار کے قلب میں ڈھالا ہے۔ ہر چیز میں حسن کو تلاشنے اور مثبت پہلوؤں سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔اس نظم کو پڑھتے وقت قاری لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ محظوظ بھی ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں ایک ایسا سحر ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔رمثال کے طور پر یہاں اس نظم سے چند اشعا پیش کیے جارہے ہیں۔تا کہ قاری خود اندازہ لگا سکیں:۔

؎ حسن سے دیکھو تو ہر چیز حسین ہوتی ہے
حسن سے ہٹ کے ہر اک چیز اثر کھوتی ہے

حسن احساس میں رہتا ہے جوانی میں نہیں
نشہ ہے خون میں انگور کے پانی میں نہیں

درد الفاظ میں ہوتا ہے کہانی میں نہیں
ہم ہی چلتے یہاں وقت روانی میں

حسن ِجب جھیل میں پلتا ہے کنول بنتا ہے
حسنِ جب شعر میں ڈھلتا ہے غزل بنتا ہے

حسنِ مزدور زمیندار کا پھل بنتا ہے
حسنِ ممتاز کبھی تاج محل بنتا ہے

حسن جب آنکھ میں بس جائے تو بینائی ہے
حسن جب لے میں سما جائے تو شہنائی ہے

حسنِ یوسف کی خریدار زلیخائی ہے
حسن بازار میں بک جائے تو ہر جائی ہے۔(۷)

تقی عابدی کا دوسرا شعری مجموعہ ''جوش مودت'' ہے۔ جو حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ جسکے اشعار ان کی دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ہیں جس میں الفت وعقیدت کا جذبہ پورے جوش وجلال و جمال کے ساتھ موجزن ہے جس طرح پروردگار عالم اور اس کے سید المرسلین رسولؐ اور اہل بیت اطہارؑ کی بارگاہ میں ہدیہ دل پیش کرنا ہمارے شعرا کا شیوہ

ہے جس میں ابو طالبؑ حسانؓ، فرزدقؒ، فردوسیؒ، رومیؒ، حافظؒ، جامیؒ، انیسؒ، محسنؒ کاکوروی، امیرؒ مینائی، علامہ اقبالؒ، بہزادؒ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ بے شمار شعراء کے نام شامل ہیں۔ اس فہرست میں اب ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام بھی، ہمارے اس مذہبی سرمایے میں قابل قدر اضافہ ہے ان کا یہ سرمایہ خدا رسولؐ اور آل رسولؐ سے ان کے جذبۂ عقیدت کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اُن کی ایک نعت کا ایک بند یہاں پیش کیا جارہا ہے:۔

والشّمس بنا جس کے رخ نور کی تنویر
واللیل ہوئی گیسو سرکار کی تعبیر

محفوظ میں محفوظ ہوئی حسن کی تحریر
معبود نے پھر ایسی بنائی نہیں تصویر

جوسروئے چمن غنچہ دھن گل بدلی ہے
وہ میرا نبیؐ میرا نبیؐ میرا نبیؐ ہے۔(۸)

ایک اور نعت کے چند اشعار دیکھئے:

کمال شوق کی ایسی نظر ہو
جدھر دیکھوں نبی ہی جلوہ گر ہو
رُخ انور محمدؐ کا جدھر ہو

نماز عشق کا سجدہ اُدھر ہو
اشارہ اِک انگلی کا اگر ہو
گواہی دینے دو ٹکڑے قمر ہو
محمدؐ فاطمہ حسنین وحیدر
انہی ناموں کے صدقے میں بسر ہو
وہی بعد خدا سب سے بڑا ہے
اگر جامی کا مصرعہ مختصر ہو۔(۹)

تقی عابدی کی خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام میں ادبی محاسن اپنے حسن و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہیں ان کے نعتیہ اشعار دِل کو موہ لیتے ہیں۔اشعار میں اتنی روانی وسلاست ہے کہ ہر ذی علم قاری کو اس کا احساس ہوجاتا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی طرح ان کی حمد نعت اور منقبت بھی قابل تعریف ہیں غزل کی طرح نعت پر بھی انہیں عبور حاصل ہے ۔وہ قاری کا من موہ لینے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں ان کے اشعار پڑھ کر دل پر ایک الگ سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ۔اختصار کے ساتھ ان کی ایک نعت کو یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتی ہوں تا کہ قاری کو اس بات کا اندازہ ہوجائے ہیں کہ اردو شعر وادب میں وہ کس مقام ومرتبہ کے حامل ہیں:۔

نعت محمدیؐ کا گلستان جہاں نہیں
سب کچھ ہے دین میں مگر ایماں وہاں نہیں
رحمت کا اس کی سایا ہے کل کائنات پر
بے سایا جس کو کہتے ہیں بے سائباں
پڑھتا ہوں رات دِن جو درودِ محمدیؐ
یہ وہ نمازِ عشق ہے جس کی اذاں نہیں
یوں رات دِن خیال محمدؐ میں مست ہوں
مجھ کو پتہ نہیں ہیں کہاں ہوں کہاں نہیں
بخشش بغیر مصطفیٰ کیسے ہوسکے
تیری دعا سے فائدہ کیا جب کماں نہیں
الٰہی ہے خوشبو نعت کی گلزار فکر میں
جس کا جواب خلد کا بھی گلستاں نہیں
عشق رسول میں جو فنا ہوگیا وہ دل
ایسی شمع فروزاں ہے جس کا دھواں نہیں
تاکید کی حقوق بشر کی حضورؐ نے
مسلم کا اس سے بڑھ کر کوئی امتحاں نہیں

شہ رگ کا قرب شاہ مدینہ سے ہوگیا
خون کی طرح اب الفتِ جاناں کہاں نہیں
سایا حضورکا بنا عالم کا سائباں
اس واسطے حضورؐ کا سایا یہاں نہیں۔(۱۰)

جہاں تک تقی عابدی کے شاعرانہ لب و لہجے کی بات ہے کہیں پر بھی مشکل تراکیب والفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے اور نہ استعارات و کنایات کا غیر ضروری ابہام ہے بلکہ ایک سچا جذبہ ہے جو خیالات واحساسات کا لفظی پیکر اپنے ساتھ لاتا ہے ۔جس پر قاری داد دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی بنا پر میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ موصوف کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو بہت کچھ کہنا جانتے ہیں اور جن کے پاس کہنے کیلئے بہت کچھ ہے بھی ۔نظم ہو یا مرثیہ ہو یا منقبت ،حمد ونعت ہو یا تغزل ہو پھر تحقیق ہو یا مقالہ نگاری کی بات ہو۔ان کو پڑھ کران کے مطالعے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے مطالعے کی وسعت آئندہ کی نظموں کے لئے مشعل راہ ہے۔

آخر میں اُن کی نظم ''رویا'' کی ایک جھلک یہاں پیش کرتی ہوں۔ جو انہوں نے اپنی بیٹی ''رویا'' کے لئے ''رویا'' کے عنوان سے کہی ہے۔ جو کہ بہت خوبصورت اور مترنم ہے۔ان کی اس نظم پر فیضؔ کی اس نظم کا اثر دکھائی دیتا ہے جو انہوں نے اپنی بیٹی منیزہ کے لیے لکھی

تھی۔جس کے دو مصرعے یوں ہیں:

؎ اک منیزہ ہماری بیٹی ہے
جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے
ہم ہی کب اس کو پیار کرتے ہیں
سب کے سب اس کو پیار کرتے ہیں

نظم ''رویا'' سے چند اشعار:

ننھے ہونٹوں پہ بہاروں کا ترانہ لے کر
برف کے دور میں ساون کا زمانہ لے کر
چاندنی بن کر مرے صحن میں اُتری ہے وہ
بن کے رنگین کنول جھیل میں ابھری ہے وہ
ہے یہ رویا کا اثر مل گئی نور نظر
اس کی تعبیر نہیں ویسی تصویر نہیں
ایسی تحریر ہے وہ جس کی تعبیر نہیں

ماحصل یہ کہ تقی عابدی بہترین محقق طبیب اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔جن کی شعری خدمات کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اگر چہ کہ شاعری میں ان کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں مگر معیار کے اعتبار سے یہ مجموعے کئی مجموعوں پر غالب ہیں۔

حواشی

(۱) تقی عابدی سے موصول ہوئے مواد سے

(۲) تقی عابدی سے ملے ایک پرچے سے

(۳) ماہنامہ شاعر ممبئی اکتوبر ۲۰۱۵ء، شمارہ ۸۰ صفحہ نمبر ۲۵

(۴) تقی عابدی سے موصول ہوئے مواد سے

(۵) ماہنامہ شاعر ممبئی اکتوبر ۲۰۱۵ء، شمارہ ۸۶۰

(۶) ماہنامہ شاعر ممبئی اکتوبر ۲۰۱۵ء، شمارہ نمبر ۸۶، صفحہ نمبر ۴۱)

(۷) ماہنامہ شاعر، بمبئی، اکتوبر ۲۰۱۵ء، شمارہ نمبر ۸۶، صفحہ نمبر ۴۲)

(۸) تقی عابدی سے موصول مواد سے اخذ کیا گیا ہے۔

(۹) تقی عابدی سے موصول ہونے مواد سے اخذ کی گئی ہے۔

(۱۰) تقی عابد سے ملے مواد سے

(۱۱) تقی عابدی سے موصول ہوئے مواد سے

ب۔ تحقیقی خدمات:

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھوج تفتیش دریافت اور چھان بین کے ہیں۔ یعنی تحقیق کے معنی کسی مسئلے یا کسی بات کی کھوج لگا کر اس کی تہہ تک پہنچنا ہے کہ وہ مسئلہ یا بات اصلی شکل میں پوری طرح سامنے آجائے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ تحقیق خواہ ادب کی ہو سائنس کی ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبے کی اس کا کام سچ کو جھوٹ سے صحیح کو غلط سے الگ کر کے اصل حقیقت کو سامنے لانا ہے۔

تحقیق سے متعلق قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

"تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔"(1)

مولانا کلب عابد نے اپنی کتاب عمادالتحقیق میں "تحقیق" کے لفظ کی یہ تشریح کی ہے:

"تحقیق عربی لفظ ہے یہ باب تفعیل سے مصدر ہے۔ اس کے اصلی حروف ح ق ق ہیں اس کا مطلب حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھیرنا ہے۔(2)

جہاں تک اردو ادبی تحقیق کا تعلق ہے اس کا مقصد جن مصنّفین۔ جن ادوار، جن علاقوں جن کتابوں اور جن متفرق تخلیقات کے بارے میں کم معلوم ہے۔ ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا ہے اور جو کچھ معلوم ہے اس کی جانچ پرکھ کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا ہے تاکہ غلط فیصلے صادر نہ کئے جائیں اور حقدار کو اس کا حق دلوایا جائے اس بنا پر

جب ہم ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کو سامنے رکھتے ہیں۔تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے انہوں نے تحقیقی نظریات اور اصولوں کی مکمل طور پر پابندی کی ہے۔وہ اردو کے ان گم شدہ شاعروں اور ادیبوں کو جن کے کلام کو ان کے عہد کے علماء یا مشاہیر نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر فراموش کر دیا ہے کو اردو ادب میں مناسب مقام دلانے کی سعی کرر ہے ہیں۔

تقی عابدی کی اردو کے تحقیقی سرمائے پر بہت گہری نظر ہے۔ادب کے تئیں ان کا جوش جذبہ عزم لگن اور محنت قابل رشک ہے۔انہوں نے تحقیق کے دشوار گذار اور صبر طلب مراحل کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔اردو کی نئ بستیوں میں شعر وادب کے جو نمایاں چراغ روشن ہیں ان میں تقی عابدی کا نام امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے اکثر ان موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے ابھی تک پردہ خفا میں تھے۔ تدوین اور تالیف کے بعد اہم دستاویزات کو منظر عام پر لانے کا سہرا بھی تقی عابدی کے سر جاتا ہے۔ان کی تحقیق ، تدوین تشریح اور تالیف کی فہرست بہت طویل ہے۔مگر یہاں پر ان کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے روشنی ڈالنے کی سعی کی جارہی ہے ان کی تحقیقی کتب کی فہرست کافی طویل ہے۔اردو زبان وادب میں جذبے کے ساتھ ساتھ عقیدت کا جو اظہار آپ نے کیا ہے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے اردو شاعری میں غالبؔ ، انیسؔ ، دبیرؔ کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصی طور پر علامہ اقبالؔ کی شاعری اور شخصیت پر ایک محقق کی نظر سے خامہ فرسائی کرنا قابل ستائش ہے سخن گوئی کے ساتھ ساتھ سخن شناسی کا سچا ذوق آپ کا خاصہ ہے۔آپ کو رثائی ادب کا سچا

مسیحا جانا جاتا ہے تقی عابدی نے بہت ہی کم مدت میں صنف مراثی کے اہم شعرا یعنی میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور رشید لکھنوی پر قابل تحسین اور نا قابل فراموش کام انجام دیا ہے۔ تجزیہ یادگار انیسؔ میں آپ نے میر ببر علی انیسؔ کے صرف ایک مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب'' نے کو جس تحقیقی انداز سے ترتیب دیا ہے وہ کسی شاہکار سے کم نہیں ہے۔ تقی عابدی کو مرثیہ سے ایک قلبی لگاؤ رہا ہے۔ واقعہ کربلا جو کہ ایک عالمی سانحہ ہے۔ اس عالمی سانحے پر میر انیسؔ نے جو کچھ لکھا اس سے آپ بہت متاثر ہیں اور اسی تاثر نے آپ کو مرثیہ نگاری سے جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ تقی عابدی کے ہاں میر انیسؔ کا گہرا مطالعہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ متذکرہ بالا کتاب ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' انیسؔ کے مشہور و معروف مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے کا ژرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ و تنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے چونکہ مراثی انیسؔ میں اسی مرثیے کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے اکثر ناقدین نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیے کے شاعرانہ محاسن اجاگر کئے ہیں۔

1943ء میں نامور محقق پروفیسر مسعود حسین رضوی نے لکھنؤ سے ''شاہکار انیسؔ'' کے نام سے اس مرثیہ کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا تھا۔ پھر لندن سے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے مقدمہ کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ "The Battle of Karbala" کے نام سے شائع کیا جب کہ حسن علی یاسر نے اسے منظوم سندھی کے قالب میں ڈھالا ہے۔

تقی عابدی نے اس ادبی شاہکار کو جنت مکانی خلد آشیانی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

ادیب کے نام منسوب کیا ہے جو بیسویں صدی کے سب سے بڑے انیسؔ شناس تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی انیسؔ کے کلام کی تفسیر، تشہیر، تحلیل اور تحفظ پر صرف کردی اور جن کی تصانیف کے ذوق نے تقی عابدی کو یہ کام انجام دینے کا حوصلہ عطا کیا۔

تقی عابدی نے اس مرثیے کی وجہ تصنیف بیان کرنے کے علاوہ اسکے پڑھے جانے پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے تقی عابدی کی یہ شاہکار کتاب انیسؔ شناسی کے باب میں بے شمار راہیں وا کرتی ہے لہٰذا یہ تصنیف اردو ادب میں بالخصوص مرثیہ کے باب میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

رثائی ادب میں تقی عابدی نے جس عظیم شخصیت پر محنت سے کام کیا ہے وہ مرزا دبیر ہیں ان کے متعلق اب تک آپ کی سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں،۔مرزا دبیرؔ اردو ادب میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے عظیم شاعر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ رباعیات لکھیں اور لغت کا سب سے زیادہ استعمال کیا۔علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''موازنہ انیس ودبیر''میں ان دونوں شاعروں کا موازانہ کیا تو انہوں نے انیسؔ کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کے حق میں انصاف نہیں کیا جس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''افسوس ''موازانہ انیسؔ ودبیرؔ'' میں علامہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ دبیرؔ کے فن حسب نسب کسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کئے گئے ہمیں دبیر کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیسؔ کا رنگ

نظر آتا ہے لیکن میر انیسؔ کے کلام میں دبیرؔ کا پرتو بالکل نہیں۔"(3)

مصحف فارسی (فارسی کلام کا مجموعہ) مثنویات دبیرؔ، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلک سلام دبیرؔ، ابواب المصائب، رباعیات دبیرؔ۔ مرزا دبیرؔ پر تقی عابدی کی یہ کتابیں ان کی علمی دلچسپی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

مجتہد نظم مرزا دبیر: مرزا دبیر کی حیات شخصیت اور فن پر ان کا ایک بہترین کارنامہ ہے ۔189 صفحات پر محیط یہ کتاب چغتائی پبلشرز اردو بازار لاہور سے شائع کی گئی ہے۔ زیر موضوع کتاب کی ابتداء دبیر کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

شاکر ہو دبیرؔ آل نبیؐ کی ہے تائید
تازہ ہے تمامی سخن اور تازہ ہے تمہید
دزدان مضامین پر نہ کر منع کی تاکید
تو مجتہد نظم ہے فرض ان پہ ہے تقلید

اس کتاب کو تقی عابدی نے لسان العصر نابغہ روزگار عادل تنقید نگار مرحوم مفتی عباس صاحب شوستری لکھنوی سے منسوب کیا ہے۔ طالع مہر مرزا دبیر کے غیر منقوط کلام پر مبنی کلام دبیرؔ کی تیسری جلد ہے۔ اس میں دبیر کے کلام کی تحقیق ، تدوین اور تشریح کی گئی ہے۔ 271 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2004 میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔

"سلک سلام دبیرؔ" دبیرؔ کے سلاموں کا مجموعہ ہے "ابواب المصائب" 144 صفحات پر

مشتمل تقی عابدی کی ایک اہم کتاب ہے جس میں انہوں نے معہ مقدمہ مرزا دبیر کی زندگی کی عکاسی کرنے کے لئے زندگی نامہ کے عنوان سے احسن مرقع کھینچا ہے اور کتاب کا انتساب عاشق دبیر امیر کبیر راجہ میسور افتخار الدولہ کے نام کیا ہے جس کے متعلق تقی عابدی نے لکھا ہے کہ وہ ''عشق محمد ؐ آل محمدؐ'' میں ڈوب کر ابھرے تو کشتی اسلام میں نجات ملی ''ابواب المصائب میں مرزا دبیرؔ نے جو ایجادات مرثیے کی صنف میں پیش کی ہیں ان کا ذکر بھی ملتا ہے حالانکہ ان موضوعات کے نقوش مرزا دبیر سے پہلے بھی ملتے ہیں مگر دبیر وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ترتیب اور با ضابطہ طور پر ان موضوعات کو تحریر میں لانا ضروری خیال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مرثیے کے مجددوں میں مرزا دبیر کو قرار دیا ہے۔ ''ابواب المصائب'' کے مقدمہ میں مرزا دبیر کی سوانح پر لکھی گئی اولین کتاب ''شمس الضحیٰ'' کا ذکر بھی ملتا ہے اور دبیر پر لکھی گئی کتابوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جس میں ''افضل حسین ثابت کی ''حیات دبیر'' شاعر اعظم مرزا دبیرؔ۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کی ''باقیات دبیر'' ڈاکٹر محمد زمان آرزدہ کی ''مرزا سلامت علی دبیرؔ'' اور پیام عمل کے مرزادبیر نمبر میں ڈاکٹر محمد حسین فاروقی کا مضمون ''اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ'' اور کئی اقتباسات شامل ہیں۔ تقی عابدی نے ابواب المصائب میں نثر کا موازنہ فسانہ عجائب کربل کتھا اور واعظ حسین کاشفی کی روضتہ الشہدا سے کیا ہے۔ تقابلی جائزہ کرتے ہوئے مرزا دبیر کی تحریری خصوصیات سادگی اور صفائی کو بیان کیا گیا ہے۔

''مثنویات دبیرؔ''بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کی ابتداء بھی مثنوی کے عنوان سے کی گئی ہے ۔صنف مثنوی کی فنی ومعنوی اہمیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مثنوی کی ہیئت اوزان ،بحور،محاسن ولوازم اور معیار نقد پر مختلف ناقدین کی آراء پر بھی بحث کی گئی ہے ۔تقی عابدی نے ان ناقدین اور محققین پر اظہار افسوس کیا ہے جنھوں نے دبیر کی مثنویوں کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ مولانا امداد امام اثر نے تو بے خبری میں دبیر کو مثنوی نگار ماننے سے ہی انکار کر دیا تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق مرزا دبیرؔ نے کل آٹھ مثنویاں لکھی ہیں ۔ان آٹھ مثنویوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

> ''احسن القصص۔معراج نامہ یا ممتاز نامہ ۔ اسناد سورہ الحمد فضائل چہاردہ معصوم،ولادت وفات حضرت چہاردہ ،معصوم غیر مطبوعہ مثنوی۔مثنوی شہادت امیر المؤمنین،مثنوی واقعہ شہادت حضرت علی اکبر۔مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرہ ماہہ شوال کہ روز عقیدت''(4)

مصحف فارسی دبیرؔ کے فارسی کلام پر مشتمل ہے جس میں مرزا دبیر کی 39 رباعیات 7 قطعات ،2 سلام،3 مخمسات،3 مسدسات کے علاوہ مرزا دبیر کے دو غیر مطبوعہ نثری رسائل اور 4 مکتوب بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات دبیر میں علم بیان اور اردو ادب کی اصطلاحات کی مثالیں بھی تلاش کر لی ہیں۔ان کے مطابق دبیر کی رباعیات

میں آسان اور عام فہم تشبیہات مکمل استعاراتی نظام کنایات اور مجاز مرسل کی مکمل چاشنی موجود ہے۔تقی عابدی نے مرزا دبیر کو اردو ادب کا سب سے بڑا رباعی گو قرار دیا ہے۔

''رباعیات دبیر'' مرزا دبیر کی 1300 سے زائد رباعیات پر مشتمل ہے رباعیات دبیر کلام دبیر کی ساتویں جلد ہے جو 2007 میں شائع ہوئی۔ جسے تقی عابدی نے تحقیقی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔اس مقدمہ میں تقی عابدی نے صنف رباعی کا آغاز وارتقاء فارسی اور اردو میں موجود اس وقت تک رباعی کی صورت حال پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی مرزا دبیر کی رباعیات کے ساتھ ہوئی نا انصافی پر احتجاج بھی کیا ہے۔تقی عابدی صنف رباعی میں دبیرؔ کو اس کا حق نہ ملنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خود دبیریوں نے بھی دبیرؔ کی رباعیات کو اس کا صحیح مقام نہ دیا۔ چوہدری سید نذیر الحسن جنہوں نے شبلی نعمانی کے موازنہ کے جواب میں چھ سو دس (۶۱۰) صفحات کی عمدہ کتاب المیزان لکھی۔ اس میں رباعیات دبیر کی وکالت میں 26 رباعیوں کو بغیر کسی تفسیر وتشریح کے پیش کر کے صرف یہ چند جملے لکھتے ہیں ''موصوف شبلی نے میر انیسؔ مرحوم کی چند رباعیاں لکھی ہیں جن میں کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے یا کوئی مضمون بندی اور صفت ہے اسی طرح مرزا کی بھی بہ کثرت رباعیاں ہیں۔جن میں انہوں نے نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ نفیس اور دلکش مضامین اور عقیدت ومعرفت واخلاق کے

مطالب نظم کئے ہیں۔ ہر ایک رباعی میں خوبیِ مضمون کی صفائی شگفتگی نرمی اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ راقم کا سوال یہ ہے کہ کیا یہ چند جملے دبیر کی شاہکار رباعیوں کا ریویو کر سکتے ہیں۔'' (5)

تقی عابدی اکثر دبیرؔ کو ان کا مقام دلانے میں کوشاں رہتے ہیں۔لہٰذا تقی عابدی کا یہ تحقیقی کام جتنا رثائی ادب میں اہمیت رکھتا ہے اُتنا ہی باقی اردو ادب میں بھی اہمیت کا حامل ہے ۔لہٰذا یہ کتاب دبیر کی رباعیات سے متعلق سب سے ممتاز اور جداگانہ کام ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ کے ساتھ ساتھ تقی عابدی اقبالیات کے بھی بہت بڑے قدردان ہیں اس سلسلے میں ان کی تصنیف ''چوں مرگ آید'' قابل دید اور قابل تحسین ہے جو کہ تقی عابدی کی عرق ریزی اور حق شناسی کا ایک نادر تحفہ ہے۔ ''چوں مرگ آید'' انہوں نے اقبال کے ہی مصرعے سے ماخوذ کر کے عنوان کی صورت میں پیش کی ہے۔ جو کہ اعلیٰ پایۂ کی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخص ان کے مختلف خطوط سے اخذ کر کے مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں پیش کی ہے۔ یوں تو اردو ادب میں بے شمار تحقیقی کتابیں علامہ اقبال کی شعری اصناف اور نثری تخلیقات پر موجود ہیں لیکن اس عنوان کے تحت پہلی مرتبہ علامہ کے خطوط میں ان امور کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ جو اقبالؔ شناسی کے باب میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ کن کن معالجین نے اقبال کی دیکھ بھال کی اور کن کن ادویات کو اقبال نے استعمال کیا اور کن سے افاقہ ہوا

سب کو مستند خطوط کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

تقی عابدی نے چوں مرگ آید اقبال کے ہی مصرعے سے ماخوذ کر کے عنوان کی شکل میں پیش کیا ہے جو یوں ہے:۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید نیم برلب اوست

تقی عابدی نے اپنی رقیق نظر سے ایسے موضوع کو نہ صرف تلاش کیا ہے بلکہ علامہ اقبال کی حیات اور امراض کے حوالے سے ان منفی پہلوؤں پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ یہ ایک حوالہ جاتی کتاب بن گئی ہے۔ کتاب کے مقدمے کی ابتداء میں وہ لکھتے ہیں:۔

''علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر گفتگو کی جائے جس سے ان کی ذات کا تعلق تھا۔ اس سے عوام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا اور انتقال کے بعد خود علامہ کو کیا فائدہ حاصل ہوسکتا تھا۔ ان تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب اس کتاب کے ہر صفحہ پر سطور سے زیادہ بین السطور بیاضی سحر کی طرح روشن ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی انفرادیت رکھتی ہے کہ اس میں طبی معلومات بدنی کیفیات ،روحانی اعتقادات کو خاص طریقے سے برتا گیا ہے۔ گفتگو لفظ بہ لفظ خطوں کے آئینے میں مستند حوالوں کی روشنی میں کر کے نتائج اخذ کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے عوام ہی نہیں بلکہ اقبالیات کے خاص طالب علموں کو

بھی معلومات فراہم ہو سکتے ہیں۔"(6)

یہ کتاب تقی عابدی کی پیشہ وارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے جس میں انہوں نے علامہ کی بیماریوں جن میں:

عوارض چشم	**(Eye Problem)**
داہنی آنکھ کی خفیف بصارت	
دونوں آنکھوں میں موتیا اترنا	(Bilateral Immature cataract)
نملی نبض	(Irregular Pulse)
دمہ قلبی	(Dyspnea on Exertion)
ورم بدن (استقا)	(Anasarca)
کمزوری (نقاہت)	(Fatigue)
غشی کے حملے	(Syncope)
جگر کا پھیل جانا	(Passive Congestion of Liver)
۲۔عوارض ریوی۔پھیپھڑوں کے عوارض	**Lung Problems**
خفیف دمہ	Bronhial Asthma
برونکائٹس	Chronic Bronchitis

برونشت	Bronchiectasis
نفس تنگی	Shortness of Breath
نمونیا	Pneumonia
پھیپھڑوں میں پانی بھر جانا	Pulmonary oedema

۳۔عوارض گوارشی:

ورم معدہ	Gastritis
ریح	Gases
سوئے ہاضمہ	Dyspepsia
قبض	Constipation
قولنج	Dysentry
بھوک نہ لگنا	Loss of Apatite
دردگلو	Throat problem
حلق کا درد	Laryngeals
آواز کا بیٹھ جانا	Hoarseness of voice
نزلہ زکام کھانسی	Common Cold
امراض دہان:	**Oral Problems**

مسوڑوں کا پھولنا Gingivitis

دانتوں کا درد Dental Caries

(یا)

کمزور بینائی ۔ درد گردہ۔نقرسGuot قلبی امراض۔ دمہ۔ معدے کی تبخیر۔ گلے کی بیماری دانتوں کے مرض ،ملیریا اورکم خوابی جیسی بیماریوں کو دریافت کیا ہے۔اور بھوپال میں ہوئے برقی علاج پر خاص طور پر بحث کی گئی ہے۔انہوں نے اقبال کے ان 30 سے زیادہ حکیموں اور ڈاکٹروں کی فہرست اس کتاب میں دی ہے جن کی نگرانی میں علامہ کا علاج ہوتا رہا۔تقی عابدی نے نہایت ہی ایمانداری اور محنت سے ان حقائق کوخطوطوں، کتابوں یا تذکروں سے اکٹھا کرکے ان کوترتیب دینے کا فریضہ انجام دیا ہے ساتھ ہی اقبآل کی طب سے واقفیت ، نظام اوقات معمولات ۔ بیماری کی نفسیات اورخود اقبال کی ذہنی کیفیت کوبھی موضوع بنایا گیا ہے۔اقبال نے جس ہمت اور استقلال کے ساتھ ان بیماریوں کا مقابلہ کیا ان پرتقی عابدی نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی انفرادیت حیثیت واقفیت اورغیر معمولی ترتیب وتدوین کے لئے مدتوں دنیائے اقبال شناسی میں یاد کی جائے گی اور سراہی جائے گی ۔

تقی عابدی کا ایک اورکارنامہ ’’ کائنات نجمؔ‘‘ ہے جو بیسوی صدی کے عظیم شاعر علامہ نجم آفندی پرلکھی گئی کتاب ہے نجم اہل بیت کے شاعر ہیں ان پر کام تقی عابدی کا کارنامہ گردانا

جا سکتا ہے۔ یہ کتاب شاعر نجم آفندی کی حیات شخصیت فن اور کلام پر مشتمل ہے۔عہد حاضر کے اس ممتاز محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے پہلی بار اردو ادب کے اس گم شدہ شاعر کو دریافت کرکے کائنات نجم کے روپ میں پیش کیا ہے۔انہوں نے صحیح میں اس کتاب کو کائنات نجم بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تمام غزلوں ، رباعیات ،قطعات ،نعتوں اور سلاموں کو یکجا کردیا ہے۔کائنات نجم دو جلدوں پر مشتمل ہے۔جلد اول میں سات اور جلد دوم میں بھی سات ابواب ہیں جلد اول م۹۴۴اور جلد دوم آٹھ سو چار صفحات پر مشتمل ہے۔جلد اول میں تقی عابدی نے نجم آفندی کی شخصیت حالات زندگی ،تصاویر،خطوط اوران کی ڈائری کے اوراق کو پیش کیا ہے۔ان کا شجرہ نسب بھی اس جلد میں پیش کیا گیا ہے۔نجم آفندی بھی اقبالؔ کی طرح انقلابی شاعر تھے۔جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام مزدور اور کسان کے حقوق کے خلاف آواز اٹھائی۔نجم آفندی جیسے باکمال شاعر اور فنکار سے اردو ادب کے محقق و نقادوں نے اپنی نظریں کیوں چرائیں اور انہیں قابل اعتنا کیوں نہیں سمجھا؟اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خود اس رویے سے کتنے نالاں تھے۔

؎میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخ روزگار مجھے

لہٰذا تقی عابدی نے یہ کام کردکھایا اور نجم جیسے عظیم شاعر کے کلام کو دریافت کرکے اردو ادب کے سرمائے میں اضافے کا کام کیا ہے۔ان کا یہ کارنامہ اردو ادب میں ہمیشہ کے لئے

یادگار رہے گا۔

''رموز شاعری''تقی عابدی کی ایک اور اہم تصنیف ہے جس میں علم عروض، علم قافیہ، علم بیان، حسن کلام، علم بدیع، اقسام نظم ونثر و دیگر مربوط علوم ادب کا بیاں ہے۔ یہ کتاب 230 صفحات پر مشتمل ہے جس کو تقی عابدی نے اردو کے عظیم عروض دان شاعر نقاد ادیب محقق اور شاعر سید حیدر نظم طباطبائی کے نام منسوب کیا ہے۔ حقیقتاً عروض وخواصی پر خامہ فرسائی قدر مشکل دقیق اور مشکل طلب کام ہے مگر تقی عابدی نے نہایت ہی آسان اور انتہائی سادہ زبان ولہجہ اختیار کر کے اس مشکل مضمون کو مشتاق علم کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں دیدہ ریزی اور عرق سوزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں۔

> ''میری شاعری میں چونکہ قدرتی اور فطری ذوق شامل رہا اس لئے کبھی اس فن کو علمی سطح پر پرکھنے کی آغاز شاعری میں میں نے کوششیں نہیں کیں اس لئے شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ ابتداء میں علوم عروض و قافیہ سے بے خبر شعر کہنے سے بعض اوقات تحسین شناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف توجہ کر کے میں نے بذات خود علوم عروض وقافیہ اور شعر وادب سے مربوط دیگر علوم کا دقیق مطالعہ کیا اور آخر کار شعر کی تقطیع میرے لئے مدرسہ کی وہ تختی بن گئی جس پر اطفال حروف

تہجی کی مشق کیا کرتے تھے ۔اس فن پر گرفت حاصل کر کے میں نے ایک آسان کتاب ''رموز شاعری'' تصنیف کی جس میں اردو کے مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی اس کے علاوہ تقطیع ہیجائی بھی اس میں شامل کی تا کہ عالم وعامی یا مبتدی اورمشاق سب شعر صحت سے واقف ہوسکیں۔''(7)

تقی عابدی کی کتاب ''انشاء اللہ خان انشاؔء (حیات شخصیت اورفن) کو انشا فہمی کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ انشاؔء نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں آپ نے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے ان کی ترتیب وتدوین کی ہے تقی عابدی کے مطابق انشاء نے اردو زبان وادب میں بہت اضافہ کیا ہے تقی عابدی نے انشاء پر لکھے گئے اس مقالے میں اُن کی پیدائش سے لے کر وفات اور آغاز شعر سے لے کر جملہ تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب انشاء جیسے انوکھے شاعر کے ساتھ انصاف برتنے کے لئے کافی ہے۔تقی عابدی نے اس کتاب میں ان تمام شعراء کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے عصری عصبیت سے کام لیتے ہوئے ان کے مقام کو عروج پر نہ جانے دیا۔ بلاشبہ انشاء پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔ غالب پر اب تک تقریباً دو ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور ستر سے زیادہ شارحین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔لیکن باوجود اس کے غالبؔ کی شعریات کا ایک خاص حصہ پوری طرح سے نہ تو سمجھا گیا اور نہ سمجھایا گیا۔بعض شارحین نے تو اس کا اقرار بھی کیا ہے کہ غالبؔ کے اشعار

معانی خارج از فہم ہیں بعض نے انہیں مہمل اور کیف مجہول قرار دیا مگر ان تمام مسائل کا غالبؔ کو غم نہ تھا۔

ے نہ ستائش کی تمنا نہ جینے کی پرواہ
گر نہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی شاہکار تصنیف ''کلیات غالبؔ فارسی'' میں نہایت ہی محنت اور عرق ریزی سے مرزا غالبؔ کے فارسی کلام کی تفہیم کو آسان بنادیا ہے۔ دو جلدوں اور 1399 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب غالبیات کے طالب علموں کے لئے کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے۔ تصنیف وتدوین کے علاوہ انہوں نے تنقید وترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے بیسویں صدی کے سب سے بڑے غالبؔ شناس محسن اردو اور ماہر لسانیات امام فن عروض شاعر نقاد مترجم معلم اور مصنف شرح دیوان غالب (اردو) سید علی حیدر نظم طباطبائی کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے غالب کی وفات سے چند روز قبل کی ایک تصویر بھی دی ہے۔ دوسو صفحات پر مشتمل تقی عابدی کا تحریر کردہ مقدمہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ جو تخلیقی نثر کا عمدہ شاہکار ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں تقی عابدی لکھتے ہیں:

''غالب نے فارسی کے عمدہ شاعروں کا مطالعہ کیا اور سب سے کم وزیادہ استفادہ بھی کیا لیکن کسی بھی شاعر کے مقلد نہیں ہوئے۔''(8)

کلیات غالب فارسی (جلد اول دوم) میں غالب کے تمام شعری اصناف کا ذکر کیا گیا

ہے یہ کلیات تقی عابدی کا عظیم تحقیقی تدوینی اور تنقیدی سرمایہ ہے ۔ جس میں تقریباً700 سے800اشعار کا ترجمہ وتشریح موجود ہے ۔اس عظیم سرمایہ کی تالیف میں جن امور کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

''اس کلیات فارسی کی تدوین کے سلسلے میں ہم نے قلمی نسخے اور مطبوعہ کلیات کے حوالوں سے استفادہ کر کے غالبؔ کی فارسی غزلوں کی تصنیف کا زمانہ 1817ء سے 1867ء اور ان کی تدوین کے زمانے کا تعین 1867ء سے 1868ء کیا ہے۔ غزلوں کے زمانہ تصنیف کے ساتھ ساتھ غالب کی غزلوں میں جو اختلافات ہیں ان کو بھی غزلوں کے حاشیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ایک جدول جو ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی نے غزلیات فارسی میں بڑی دقیق دیدہ وری سے مرتب کی تھی اس کلیات میں شامل ہے تاکہ دانش وران تحقیق کی مدد ہو سکے۔''(9)

لہٰذا اردو ادب اور بالخصوص اقبالیات کے باب میں تقی عابدی کا یہ کارنامہ داد وتحسین کا مستحق ہے ۔ جو ان کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے ۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی ایک اور تحقیقی کاوش ''تعشق لکھنوی'' اُن کے شب و روز کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جس میں انہوں نے تعشق لکھنوی کو اردو ادب میں ان کا مرتبہ دلانے کے سعی کی ہے ۔ان کی اس کتاب میں ''تعشق کی حیات شخصیت فن اور کلام کی تحقیق تنقید اور تدوین موجود ہے جو کہ ایک گمنام اور مظلوم شاعر کی مکمل تفسیر ہے۔

''رباعیات رشید لکھنوی اوراحوال پیری'' بھی تقی عابدی کی تحقیقی خدمات کی ایک اہم کڑی ہے۔آج تک کسی بھی شاعر یا ادیب نے بڑھاپے یعنی پیری پر اس قدر اشعار نہیں کہے ہیں البتہ چند ایک نے کچھ اشعار کہے ہیں لیکن پیری پر سو سے زیادہ اشعار پہلی مرتبہ رشید لکھنوی نے کہے ہیں اس لئے تقی عابدی نے پہلی بار رشید کی رباعیات کی تقسیم کی۔ صرف تقسیم ہی نہیں بلکہ تشریح بھی کی مشکل الفاظ کے لئے حل لغات بھی پیش کی۔ رباعیات میں جو محاورے ہیں انہیں واضح طور پر بتایا ہے اور رُباعیات میں جو تشبیہات صنائع اور بدائع ہیں اُسے واضح بھی کیا یہاں تک کہ ہر رباعی کی ایک الگ شناخت بنائی گئی ہے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ رشید لکھنوی کی غزلیات مراثی اور قصائد کا ذکر بھی ہے اردو کے کسی بھی ادیب یا محقق نے رشید کی رباعیات کو جمع نہیں کیا تھا۔اور نہ ہی اس قدر تفصیلی تشریح کی تھی۔ اس لئے تقی عابدی کا یہ کارنامہ اردو ادب کی رباعیات کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ ہوگا۔

روپ کنوار کنواری تنقید، تحقیق، تدوین وتشریح کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ روپ کنوار کنواری کشمیری پنڈت خاندان کی پڑھی لکھی خاتون تھی وہ مداح محمدؐ وآل محمدؐ تھی اور فضل اللہ فضل سہ پہری کی شاگرد تھی روپ نے سلام مرثیے اور قصیدے لکھے جنہیں تقی عابدی نے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ ان کو کتابی صورت میں پیش کیا جو کافی مقبول ہوئی۔

اس کے علاوہ اظہار حق۔ دربار رسالت فکر مطمئنہ خوشہ انجم، دریائے نجف (علامہ نجم آفندی کے قصیدوں اور منقبتوں کا مجموعہ) تاثیر ماتم، نجمی مایا، روش انقلاب، ھوالنجم، ادبی معجزہ

،مسدس حالی، دوتاریخی شاہکار نظمیں ،کلیات حالی، وغیرہ ان کی تحقیقی کتب ہیں۔مندرجہ بالا تمام کتب جوتقی عابدی کی تحقیق تدوین اورتشریح کا نتیجہ ہیں اس باب میں ان تمام کتب کی تفصیل ممکن نہیں تھی چنانچہ تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔البتہ حالؔی سے متعلق تحقیقی وتنقیدی کتابوں کاذکرآئندہ باب میں تفصیل سے کیا جائے گا۔

ماحصل یہ کہ تقی عابدی اپنے آپ میں ایک دفتر ہیں ان کی تحقیقی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے اردوادب میں گراں قدرخدمات انجام دی ہیں جونہ صرف یہ کہ ادوادب میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ بلکہ اردوادب کے طالب علموں کے لئے کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہیں۔ان کی تحقیقی خدمات کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔

ج۔تنقیدی خدمات

ادب کی طرح تنقید کی تعریف میں بھی بہت سارے اختلافات ہیں۔ جو ہر دور میں بدلتی رہتی ہے کسی نے تنقید کو ادبیات کو جانچے اور پرکھنے کا آلہ قرار دیا ہے۔کوئی کہتا ہے کہ یہ تخلیقی ادب پر لعن طعن کرتی ہے تو کوئی کہتا ہے کہ یہ فنی تخلیقات کی اچھائیوں کو اُجاگر کرتی ہے۔فن کو سنوارنے اور فنکار کی اصلاح وراہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے۔کسی کا خیال ہے کہ وہ فنی تخلیقات کی تشریح کرتی ہے۔تو کسی کا ماننا ہے کہ تخلیقی ادب میں جو فلسفیانہ خیالات چھپے ہوئے ہیں ان خیالات کو دریافت کرنا اوران کا نچوڑ عوام کے سامنے پیش کرنا اوران کا تجزیہ تنقید ہے۔

تخلیق اور تنقید انسان کی دو فطری اور بنیادی صلاحتیں ہیں ادب میں اس کی کارفرمائی اسی وقت شروع ہوجاتی ہے جب فنکار کے ذہن میں کسی فن پارے کی داغ بیل پڑتی ہے کوئی بھی فن پارہ اس وقت تک فن کے قالب میں نہیں ڈھل سکتا جب تک فنکار کا تنقیدی شعور بیدار نہ ہو کیونکہ تنقیدی شعور کے بغیر اچھے تخلیقی فن پارے کا وجود ممکن نہیں ہے۔

تنقید اور پرکھ زندگی کے ہر شعبے کے لئے لازم ہے اس کے بغیر انسانی شعور اور مرتبے کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تنقید پرکھ اور معیار قائم کرتی ہے۔زندگی کو کھوکھلا ہونے سے بچاتی ہے۔وہ صرف تنقید حیات ہی نہیں بلکہ تفہیم حیات کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔تنقید بڑے بڑے فنکاروں کے فنی کارناموں کو سمجھاتی ہے اوران پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی

ہے۔ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اُجاگر کرتی ہے ان کے مطالب کی وضاحت کرتی ہے۔ کسی بھی نقاد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہر طرح کے جذبات پر قابو رکھے اور اپنے احساسات کو متوازن انداز میں پیش کرے۔غرض یہ کہ تنقید اپنے اندر کئی پہلو رکھتی ہے۔

عہد حاضر میں ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو ادب میں ایک معتبر اور مستند نقاد کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔ان کا شمار موجودہ عہد کے ان اہم محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔جن کے ہاں علمی تنقید کا اچھا خاصا مواد موجود ہے ان کے تنقیدی سرمائے میں عملی تنقید کو خاص طور پر اولیت حاصل ہے۔انہوں نے علیحدہ علیحدہ شعراء اور ادباء پر تنقید کی ہے اور اپنے تنقیدی مضامین میں قدیم وجدید ہر عہد کے شعراء اور ادباء کو شامل کیا ہے۔امیر خسرؔو، جامؔی، سعدؔی، حافظؔ، انشاؔء، غالبؔ، حالؔی، انیسؔ، دبیرؔ، رشیدؔ لکھنوی، تعشقؔ لکھنوی، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، نجمؔ آفندی وغیرہ کی تخلیقات پر انہوں نے تنقید کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں اور انیسؔ اور دبیرؔ کی پیشتر شعری تخلیقات کی بازیافت کر کے جدید تحقیقی نظریے کو بروئے کار رکھ کر پیش کیا ہے۔جس کے لئے تقی عابدی لائق تحسین ہیں۔

ان کے تنقیدی و تحقیقی سرمایے کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقی عابدی اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے ادب کے بہت بڑے عالموں میں شمار ہوتے ہیں اپنی تصنیفات وتالیفات کے علاوہ انھیں 40 سال سے زیادہ ادبی خدمات کا تجربہ بھی حاصل ہے۔اس سلسلے میں دو درجن سے زیادہ نیشنل اور انٹرنیشنل ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ڈاکٹر تقی عابدی دیار غیر

میں رہ کر جو کام انجام دے رہے ہیں وہ ہمیں نئے سرے سے اردو کی شعری روایات اور شاعری پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے یہی کہنا کافی ہوگا کہ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

انہوں نے علامہ اقبال کی شعری ونثری تخلیقات پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے ہوئے اعلیٰ پائے کے مضامین تحریر کئے ہیں ساتھ ہی جن شعراء وادباء پر مضامین لکھے ہیں ان میں بعض مضامین کی حیثیت تعارف وتجزیہ کی ہے جبکہ بعض پر تنقیدی تبصرے کا رنگ غالب ہے اور بعض میں ترجمہ وتشریح کا عنصر نمایاں ہے۔

تقی عابدی کے تنقیدی مضامین میں کچھ موضوعات ایسے بھی ہیں جن میں ذاتی دلچسپاں رہی ہیں کچھ تاریخی اہمیت کے پیش نظر رقم کئے گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو عام رویوں سے الگ دور ہٹ کر قدر وقیمت کی غرض سے لکھے گئے ہیں یا پھر کسی ادیب یا شاعر کو تاریخ میں مناسب مقام دلانے کے لئے قلم بند کئے گئے ہیں۔

''عروس سخن''،'' ذکر درباران''،'' سبد سخن''،'' اقبال کے عرفانی زاویے''، '' فیض فہمی مصحف تغزل''،''فیض شناسی''، '' حالی فہمی'' وغیرہ وغیرہ اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جن کی تفصیل یہاں پیش کی جارہی ہے۔تا کہ تقی عابدی کی تنقیدی خدمات کا سرسری جائزہ پیش کیا جاسکے۔

''عروس سخن'' تاریخی تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا مجموعہ ہے۔جو 339 صفحات پر مشتمل

ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 2004 میں القمر انٹر پرائز سے شائع ہوئی۔ جو لاہور پاکستان میں ہے ۔تقی عابدی کی اس کتاب میں 50 مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین کتابی شکل میں آنے سے قبل ہفتہ وار ''اردو ٹائمز'' نیویارک میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے تمام مضامین تاریخی دستاویز کے حامل ہیں کیوں کہ ان میں تاریخی تحقیقی اور تنقیدی مباحث شامل ہیں۔ محسن بھوپالی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ عروس سخن اپنے متنوع مضامین اور نئی فکری تحقیقی اور تنقیدی حیات کے سبب اردو تنقید میں یقیناً اضافے کا مقام رکھتی ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد۔ (ڈاکٹر سید تقی عابدی)

۲۔ حرف چند (محسن بھوپالی)

۳۔ عروس سخن ایک تبصرہ (بریگیڈیئر ریٹائرڈ علی طباطبائی راز لکھنوی)

۴۔ عروس سخن (عابد جعفری صدر رائٹرز فورم ٹورانٹو)

۵۔ امیر خسرؔو دہلوی

۶۔ لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی

۷۔ فضائل وشمائل محمدؐ (اردو اشعار کے آئینے میں)

۸۔ اقبال اور عشق علیؑ

۹۔ شرح مرغوب القلوب (اردو نثر کی قدیم ترین کتاب)

۱۰۔ خواجہ نظام الدین اولیاء اور امیر خسروؔ
۱۱۔ قبلہ راست کردیم باطرف کج کلاہی (خسروؔ)
۱۲۔ جمال محمدؐ (اردو اشعار کے آئینے میں)
۱۳۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
۱۴۔ ضمیرؔ جعفری (لاشعوری احساس کا باشعور شاعر)
۱۵۔ لذت گفتار کی سحر آفرینی
۱۶۔ علامہ اقبال کی مثنوی (سورہ اخلاص کا ترجمہ)
۱۷۔ خلاصہ مطالب مثنوی (سورہ اخلاص)
۱۸۔ ہیر و وارث شاہ کا پہلا منظوم ترجمہ
۱۹۔ اقبال عاشق امام حسین
۲۰۔ دیوان حافظ کے تراجم
۲۱۔ دیوان حافظ کا اردو منظوم ترجمہ
۲۲۔ غالب سر سیر خامہ نوائے سروش
۲۳۔ چراغ سخن، شہر کا بجھ گیا
۲۴۔ رثائی رباعیات
۲۵۔ حمیر الرحمٰن کے ایک شعر کا تنقیدی جائزہ

۲۶۔ علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد

۲۷۔ خاندان میر انیس

۲۸۔ علامہ اقبال اور حیدر آباد دکن

۲۹۔ رزمیہ شاعری کے خدائے سخن

۳۰۔ شاعروں کی قسمیں

۳۱۔ سلام بر حسین

۳۲۔ غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی

۳۳۔ اقبال کا تصور زمان و مکان

۳۴۔ علامہ اقبال کی دُعا

۳۵۔ میر تقی میرؔ کا رثائی کلام

۳۶۔ میر انیس اور مرزا دبیر

۳۷۔ سفیر اردو ڈاکٹر انعام الحق جاوید

۳۸۔ قصیدہ بردہ اور علامہ اقبال

۳۹۔ علامہ اقبال کا شاہین

۴۰۔ واقعہ نگاری کا تاجدار سخن

۴۱۔ دیار محمدؐ (اردو اشعار کے آئینے میں)

۴۲۔ انیسؔ کے سلام

۴۳۔ مرزا غالبؔ کا سلام اور مرثیہ

۴۴۔ عرفان عبد ''صنم کدہ'' میں

۴۵۔ جعفر زٹلی سے جعفر رضوی تک

۴۶۔ سحر آشار کی سحر نمائی

۴۷۔ معلم اقبالؔ شمس العلماء میر حسن

۴۸۔ یہی تو حرف معتبر ہے

۴۹۔ اقبال کیسے علامہ سے سر ہو گئے۔

۵۰۔ محسن سفر و ادب

۵۱۔ نظمیہ زنجیر

۵۲۔ رسم رونمائی مجموعہ کلام

۵۳۔ خالد عرفان کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

۵۴۔ صداقتوں کا شاعر

۵۵۔ گلدستہ شہادت عظمیٰ

۵۶۔ ناٹک امیر خسرو اور علم موسیقی

ان تمام مضامین پر تفصیلی گفتگو کی اس باب میں گنجائش نہیں جس کے پیش نظر تفصیل سے

گریز کرتے ہوئے تمام مضامین کے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا انتخاب موضوعات وعنوانات اتنا معیاری اور پائے کا ہوتا ہے کہ جس بھی موضوع یا عنوان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اس پر پورا زور قلم صرف کر دیتے ہیں۔ ''عروس سخن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بریگیڈیر ریٹائرڈ علی طباطبائی راز لکھنوی (کیلیفورنیا) تقی عابدی کو ان کی اس تصنیف پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ع اس سعادت بہ زور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشد

(بارگاررب العزت میں دعا گو ہوں کہ اُفق زبان وادب کا یہ تابندہ ستارہ ایک دن مہر نیم روبن کر چمکے۔)

''ذکر درباران'' بھی تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے۔ جو 2006 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں 38 مضامین شامل ہیں جن کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ کتاب 336 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین تقی عابدی کی علمی تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسمیں بعض مضامین بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ جو یقیناً اردو ادب میں توقعات وامکانات کی جہتیں وا کرتے ہیں عہد حاضر میں منفرد وممتاز نقادوں میں تقی عابدی کا شمار اس لئے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو شعر وادب کے باریک مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے مستقبل اور حال کے قارئین کے نئے توقعات سے زیادہ امکانات کی

صورتیں نظر آتی ہیں ۔اردو کی نئی بستیوں میں رہ کراس طرح کے مضامین قلم بند کرنا اپنے آپ میں بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ان کارناموں کی بدولت ہی ہمیں موصوف کے اردوادب کے تئیں ذوق وشوق اور لگاؤ ومحبت کا اندازہ ہوتا ہے ، اس کتاب میں شامل مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:۔

یہاں اس فہرست کے پیش کئے جانے کا مقصد موصوف کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔

۱۔ انشا کی نعتیہ شاعری
۲۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر
۳۔ لطائف جامی
۴۔ اردو شاعری میں مروجہ اوزان
۵۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے بچپن کی مختصر اردو
۶۔ گورغربیاں ۔گریس ایلجی کا ترجمہ ۔نظم طباطبائی کا شاہکار
۷۔ اردو نعت کا ارتقائی سفر
۸۔ انشاءاللہ جان انشا ۔حیات تصانیف اور شخصیت
۹۔ سرسید کے لطیفے حالی کی زبانی
۱۰۔ ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر (بنے بھائی)

۱۱۔ نیو یارک لائبریری میں دیوان غالبؔ کا نایاب نسخہ

۱۲۔ جوش کی مرثیہ نگاری

۱۳۔ سرسید کے ادبی کارنامے

۱۴۔ گلدستہ مناقب مولا علی

۱۵۔ غالبؔ کے اشعار کے معنی خود غالبؔ سے پوچھیئے۔

۱۶۔ ملا محتشم کاشی کا مرثیہ

۱۷۔ سر محمد اقبال اور سرسید

۱۸۔ قرۃ العین طاہرہ (حیات شخصیت اور نمونہ کلام)

۱۹۔ انشا کا منقبتی کلام

۲۰۔ اردو زبان کی پیدائش

۲۱۔ مظفر شکوہ۔ شمالی امریکہ کا پہلا کلاسیک اردو شاعر

۲۲۔ رباعی ''شاہ است حسین'' کا مختصر تجزیہ

۲۳۔ غالبؔ اور ذوقؔ ادبی معرکہ یا ادبی مغالطہ

۲۴۔ منقبت: تاریخ اور تحقیق کے آئینہ میں

۲۵۔ اردو شاعری کا کیٹس (Keats) مجاز

۲۶۔ انشا کی معرکہ آرائیاں

۲۷۔ عظمت حسین غیر مسلم اردو شعراء کی نظر میں

۲۸۔ اردو فاکس ویڈیو کاسٹ (جاوید خان کا کامیاب تجزیہ)

۲۹۔ علامہ اقبالؔ کی وسعتیں

۳۰۔ غالبؔ غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی مہر سے مغلوب ہوں

۳۱۔ شاعروں نے متروک الفاظ کیوں ترک نہ کئے

۳۲۔ قاآنی شیرازی کا شاہکار مرثیہ

۳۳۔ قبیلہ شعراء وادب کا سردار۔ مرحوم سردار جعفری

۳۴۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کی معرکہ آرائی کا عادلانہ تجزیہ

۳۵۔ انشاؔ اور مصحفیؔ: ادبی معرکہ کی ابتدا کس کی گردن پر اور کس کی انگلی کے اشارے سے شروع ہوئی۔

۳۶۔ یہ مرثیہ میر انیس کا ہے یا نہیں؟ چند بنیادی مباحث

۳۷۔ انشاء اللہ خان انشاؔ کا شاہکار دیوان بے نقط

مندرجہ بالا تمام مضامین جو اس کتاب میں درج ہیں اعلیٰ پائے کے ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ منفرد اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے جو اردو ادب کے تمام قارئین کے لئے یکساں مفید ہے ۔آسان اور سہل زبان کا استعمال کیا گیا ہے ۔تقی عابدی کے نمایاں اسلوب کے مطابق ان میں بھی چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس باب میں ان مضامین کی تفصیل

ممکن نہیں اس لئے تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔ آئندہ کے ابواب میں ان مضامین کا ذکر ضرور آئیگا۔

''سبد سخن'' ڈاکٹر سید تقی عابدی کے 30 تحقیقی وتنقیدی مقالات اور مضامین کا مجموعہ ہے ۔جو کہ 383 صفحات پر مشتمل کتاب ہے ۔موصوف نے اس کتاب کو مرحوم ڈاکٹر شان الحق حقی سے منسوب کیا ہے جس کا تعارف کراتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں کہ جو اردو ادب کی شان کناڈا کی ادبی پہچان محافل سخن کی جان اور اردو معلیٰ کی آن بانہیں۔

؎ تنہا ترے ماتم میں نہیں شیام سید پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی

اس کتاب میں شامل مضامین میں سے بہت سارے مضامین مختلف کتابوں ،رسالوں اوراخبارات وغیرہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔جنہیں یکجا کر کے کتابی شکل دی گئی ہے یہ کتاب کس سن میں اور کہاں سے چھپی کتاب میں درج نہیں ہے۔تقی عابدی نے ''رو میں ہے رخش عمر'' کے عنوان سے اپنا ادبی زندگی نامہ بہت ہی مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کی تصنیفات وتالیفات کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی کا علم بھی ہوتا ہے۔مضمون کی طوالت کا دھیان رکھتے ہوئے کتاب میں شامل تمام مضامین کا خلاصہ یا تعارف یہاں پیش کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے راقمہ نے اس سے گریز کیا ہے ۔البتہ شامل کتاب مضامین کی فہرست یہاں دی جارہی ہے تا کہ قارئین ان کے بنیادی ماخذ سے استفادہ کر سکیں۔

۱۔ غالب ثنائے خواجہ یزداں گزاشتیم (غالب کی نعتیہ غزل کا اجمالی تجزیہ ہے)

۲۔ اردو کا سحبان محمدؐ

۳۔ مثنوی مرزا دبیرؔ، معراج نامہ کا ادبی معیار

۴۔ مرزا دبیر اور دیار نجف

۵۔ روپ کنواری۔ افسانہ یا حقیقت (تشریح اور محاکمہ کی روشنی میں)

۶۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ (نواب مصطفیٰ خان شیفتہ: ایک مختصر جائزہ)

۷۔ علامہ اقبالؔ اور ملک الشعراء گرامی۔ باہم مہربان اور مصائب اور معترف

۸۔ نظم اردو" ناطق لکھنوی

۹۔ میدان رباعی کا شہوار۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ

۱۰۔ عمر خیام، اتنا تو ہمیں جاننا چاہئے

۱۱۔ فانی کا لافانی فن

۱۲۔ علامہ اقبالؔ کا سچا سخن گو

۱۳۔ میر انیسؔ کی جذبات نگاری

۱۴۔ غزل حقی کی حقیقی پہچان

۱۵۔ زہراؑ کی جھلک دبیر کے کلام کی روشنی میں

۱۶۔ حدیث دل

۱۷۔ علامہ اقبال کا جلوس جنازہ

۱۸۔ علامہ اقبال کی آخری رات (کاش آخری خواہش پوری ہوتی)

۱۹۔ جدید مرثیہ میں صبا اکبرآبادی کا منفرد چہرہ

۲۰۔ علامہ اقبال کی تاریخ گوئی

۲۱۔ شبلی کے پیمانوں سے دبیر کی مثنوی ''احسن القصص'' کی ارزش یابی

۲۲۔ رہنا خاموش کیوں میرے دادا کلیم تھے

۲۳۔ ابواب المصائب تصنیف مرزا دبیرؔ

۲۴۔ اقبالؔ کا فلسفہ تقدیر

۲۵۔ مراثی دبیرؔ میں استعاراتی نظام کا ہجوم

۲۶۔ جاوید نامۂ اقبالؔ۔انسان سازی کا زندہ جاوید شاہکار

۲۷۔ کون عبث بدنام ہوا (تخلیقی ادبی دستاویز)

۲۸۔ علامہ اقبالؔ اور علی بخش

۲۹۔ علامہ اقبالؔ کا مقبرا

۳۰۔ حامد امروہوی کی نعتیہ شاعری

اس کتاب میں شامل مضامین تحقیقی وتنقیدی ہونے کے ساتھ ساتھ موضوعاتی سطح پر منفرد ہیں۔عروس سخن ''سبد سخن'' اور ذکر درباران کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے تقی عابدی

لکھتے ہیں۔

''عروس سخن سبد سخن اور ذکر در باران میرے مقالات کے مجموعے ہیں یہ مقالے میں نے مختلف شعر وادب کے موضوعات پر گذشتہ تین دہائیوں میں مختلف اخباروں جلسوں سیمناروں اور میگزینوں کے لئے لکھے جنہیں کچھ کانٹ چھانٹ کران کتابوں میں یکجا کئے ہیں۔ تا کہ ان موضوعات پر بھی موادفراہم ہو سکے۔ جو اردو شعر وادب میں خال خال ہیں۔'' (10)

علامہ اقبالؔ پر تقی عابدی کی مفصل کتاب ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' اُن کی علمی دلچسپی کا شاہکار ہے جس میں انہوں نے اپنی ادبی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اور اقبالؔ کے تمام تر موضوعات کو اس کتاب میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اہل بیت سے اقبالؔ کی عیدت ہو یا اکبر الہ آبادی سے، مہارا جا کشن پرشاد جیسے دوستوں سے تعلق کی وجہ ہو یا استادوں کا ذکر ہو یا ٹیپو سلطان جیسے شیر کا تذکرہ سب کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ قصیدہ بردہ شریف کے خالق علامہ ابو بومیری کا جامع تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کو آپؐ سے کس قدر والہانہ عشق تھا ایک الگ موضوع کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔ مثنوی سورہ اخلاص کے تناظر میں قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ زندہ رُود کے مستند حوالوں کے ذریعے آفتاب اقبال اور اقبالؔ کی ازدواجی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ تصور زماں ومکاں کونہایت ہی فصیح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا گرامی اور داغ دہلوی کے متعلق بھی

مواد ہمیں اس کتاب میں مل جاتا ہے۔ شمس العلماء میر حسن جیسے اقبالؔ کے استاد کا ذکر کیوں نہ اس کتاب میں کیا جاتا علامہ کیسے اقبال سے سر ہوئے ایک مکمل کہانی کے ساتھ تقی عابدی نے اپنی اس کتاب ''اقبال کے عرفانی زاویے'' میں شامل کیا ہے۔ مسئلہ فلسطین سے اقبال کو کافی دلچسپی تھی اسی لئے تقی عابدی نے اقبالؔ کے جذبات کا اظہار مسئلہ فلسطین اور اقبال میں بہت ہی مدلل انداز میں کیا ہے۔ اقبالؔ پر تہمت شرابی نوشی کے تدارک کے لئے تقی عابدی نے مستند حوالوں کے ذریعے اس کتاب میں ثبوت پیش کیا ہے۔ کہ اقبالؔ ہرگز شراب نوش نہ تھے غرض تقی عابدی نے باقی کتابوں میں اقبالؔ کے متعلق مضامین تو شامل کرر کھے ہیں مگر ''عرفانی زوایے'' خالص اقبالؔ کے موضوع پر منفرد کتاب ہے جو ان کے خالص ادبی اور علمی لگاؤ کو ظاہر کرنے کا بین ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فیضؔ اور حالیؔ پر بھی قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں اور نئے گوشے وا کئے ہیں جن کا آئندہ ابواب میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

(د)۔اُردو کی نئ بستیوں کے حوالے سے تقی عابدی کی خدمات

اردو والے جب پردیس گئے تو انہوں نے اپنے ذوق وشوق کے تحت وہاں پر اردو کی نئ بستیاں بسائیں اور انجمنیں قائم کیں اور محفلیں سجائیں جنہیں اردو کی نئ بستیوں سے منسوب کیا گیا ۔اردو کی نئ بستیوں کے حوالے سے سب سے پہلے جو بستی قائم ہوئی وہ Great Britain۔ میں تھی اس کے بعد جو دوسری بستی قائم ہوئی وہ United states of America تھی تیسرے نمبر پر ٹورانٹو چوتھے نمبر پر Middle East اور پانچویں نمبر پر آسٹریلیا آتا ہے۔ ان بستیوں میں اردو ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ذوق کے تحت پروان چڑھی ہے۔اردو کی یہ ہی بستیاں لگا تار بڑھتی جارہی ہیں یہ بستیاں موجودہ وقت میں کئی اہم شخصیتوں کی وجہ سے دنیائے اردو میں مشہور ومعروف ہیں جن میں سب سے اہم نام ممتاز محقق ادیب شاعر نقاد اوردانشور دنیائے اردو میں صفیر اردو کی حیثیت سے جانے جانے والے ہندوستان کے اردو صفیر ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہے۔ جوخود کوادب کا مریض کہتے ہیں۔ ان بستیوں میں موجود شعراء وادباء اردو زبان وادب کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرر ہے ہیں۔جن میں شعری ادب کوفوقیت حاصل ہے۔ان شعری تخلیقات پر متعدد نقادوں نے بے اطمینانی کا اظہار بھی کیا ہے کیونکہ یہاں موجود ہندو پاک کے چند شعراء حضرات اپنی تسکین ذوق کی خاطر مشاعروں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں چونکہ مشاعرے مختلف انجمنوں کے سایہ تلے وجود میں آئے ہیں اس لئے ان میں شعری اصناف کے مختلف زمروں

میں افکار وخیالات کی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے سنجیدہ شاعری کی کمی کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے شعری بلندی معانی ومفاہیم کی بے ربطی سے کسی بھی طرح اردو زبان کا ذی شعور طبقہ مطمئن نہیں ہے۔ حالانکہ یہاں قائم کی جارہی ادبی محفلیں اردو ادب کے فروغ کے لئے کسی امید کے چراغ سے کم نہیں ہیں مختلف پیشوں سے متعلق ہونے کے باوجود شعراء وادبا اپنی تہذیب وثقافت کی خاطر یہ ادبی نشستیں منعقد کرتے ہیں جو انکی اردو ادب سے خاص لگاؤ اور محبت کا ثبوت دیتی ہیں ایسے ماحول میں ایک عرصے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے ان بستیوں کے حوالے سے بڑی جرأت اور مشقت سے کام لے کر ٹھوس ادبی خدمات کا بیڑا اٹھایا ہے اور مسلسل تحقیقی اور فکری مضامین لکھ کر اہل ذوق کے لئے تسکین کے اسباب مہیا کیے ہیں ان کی تحریریں ان کی دیانت داری اور ذمہ داری کا زندہ ثبوت ہیں۔ ان کی انہیں ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوپاک کے معروف ادیب ضمیر جعفری نے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''تقی عابدی نیویارک کے ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔'' اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ علم عروض وعلم بیان اور اردو نظم ونثر کے حوالے سے تقی عابدی کی شناخت اردو ادب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

آج اردو کو دنیا میں زندہ رکھنا بہت بڑا سوال بن گیا ہے۔ کیونکہ جس زبان کے بغیر زندگی کی تمام ضروریات پوری ہوجاتی ہوں جس زبان کے اختیار نہ کرنے سے کسی طرح کی روکاوٹ پیش نہ آتی ہو اس زبان میں دلچسپی کیسے پیدا ہو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں

اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے تقی عابدی نے کہا کہ ''محبان اردو کو اس سمت پیش قدمی کی دعوت دیتا ہوں اردو کی تبلیغ کے دیگر ذرائع میں فلمیں، اردو اخبارات ورسائل کی اشاعت اردو ریڈیو، ٹی وی، میلاد کے جلسے جمعہ کے خطبے اور مجالس وغیرہ اردو زبان کی ترقی وترویج اور اسے زندہ رکھنے میں بہت اہم رول ادا کر رہے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم تو اپنی بازی کھیل چکے ہیں۔اب نوجوان نسل ہی کے شانوں پر اردو کے تحفظ وبقا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اردو زبان کی مضبوطی اور شاندار مستقبل کا راز پرائمری سطح کی تعلیم میں پنہاں ہے اگر پرائمری سطح پر معیاری تعلیم ہوگی تو خود بخود، آگے چل کر اردو کا ماحول بنے گا ہندوستان میں اردو زبان کی ترویج اردو ذریعہ تعلیم سے مربوط ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑتے ہوئے تمام عصری علوم کی اردو زبان میں فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

اردو ٹائمز نیویارک کے تعاون سے تین انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کی جا چکی ہیں جس کی مرکزی کمیٹی کے چیئر مین تقی عابدی تھے۔پہلی کانفرنس 2003 میں نیو جرسی (امریکہ) میں ہوئی جس کا عنوان اقبالیات تھا۔دوسری کانفرنس 2004 میں ٹورانٹو (کنیڈا) میں ہوئی جس کا عنوان غالبیات تھا۔تیسری عالمی کانفرنس 2006 میں شکاگو (امریکہ) میں ہوئی جو شاعری اور تنقید کے عنوان پر تھی یہ کانفرنسیں تین دن پر مشتمل ہوتی تھیں۔ان میں روزانہ مقامی لوگ تقریباً 2000 سے 4000 کی تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ ہر اجلاس کے آخر میں قرار

داد پیش ہوتی تھی میر انیسؔ کانفرنس اور مشاعرے منعقد کیے جاتے رہے ٹورانٹو میں شاہد ہاشمی کے ساتھ مل کر تقی عابدی نے پاکستان قونصلیٹ میں اردو لائبریری قائم کی۔ علامہ اقبالؔ کے کلام فہمی پر اقبالیات کے عنوان سے کئی ادبی نشستیں و کانفرنسیں ٹورانٹو میں منعقد کرا چکے ہیں اور یہ سلسلہ لگاتار جاری ہے۔ اس بارے میں خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

''امریکہ اور کینیڈا میں تین عالمی اردو کانفرنسیں ہوئیں جن کا تعلق نیویارک اردو ٹائمز سے تھا۔ ان کانفرنسوں کی مرکزی کمیٹی کا صدر مجھے بنایا گیا اس بڑی ذمہ داری کی وجہ سے میری خط وکتابت اور بات چیت مختلف شرکائے کانفرنس سے رہی تا کہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ گفتگو اور اس پر سیر حاصل مباحثہ ہو سکے جو کانفرنس کا مقصد بھی تھا۔ چنانچہ ان عالمی کانفرنسوں میں میرا وجود نمایاں رہا۔ ان شمالی امریکہ کی عالمی کانفرنسوں کے علاوہ بھارت پاکستان انگلینڈ مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اردو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا چونکہ میرا تعلق اردو کی نئی بستیوں سے ہے اور ان نئی بستیوں کی حیات کا دارومدار اردو کے گہوارے کے لیے ضروری ہے اس لئے بھی اس ارتباطی پُل کو برقرار رکھنے کی خاطر شرکت مفید ثابت ہوئی۔ شمالی امریکہ کی عالمی کانفرنسوں کے اجلاس کے مضامین اور بحث ومباحثہ کے مطالب نے بھی

ہمیں دوسری عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے لازمی جانا۔(11)

تقی عابدی کی اکثر یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ جس بھی کانفرنس میں شرکت کریں وہاں اپنا مقالہ ضرور پڑھیں ۔ان کے لئے ان عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا مقصد تفریح وسیاحت نہیں بلکہ علمی وادبی کاوش ہوتی ہے۔وہ اپنے کام کے تئیں ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کانفرنسوں میں شرکت کے لئے آنے والے خرچ کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

میں کسی بھی ادارے یا اکادمی سے سفر وحضر کے مطالبات نہیں کرتا اگر کوئی،ان سہولتوں کو مہیا کردے تو شکریہ کے ساتھ قبول کرلیتا ہوں ورنہ یہ کوئی ایسا بھاری پتھر بھی نہیں جس کو اٹھانہ سکوں۔بقول انیس

؎ کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جاکے پھیلاؤں

مرا کریم تو دیتاہے بے سوال مجھے (12)

ان تمام کانفرنسوں کے مختلف اجلاس میں تقی عابدی نے اردو کی بحرانی کیفیت پر زور دیتے ہوئے اردو کے رسم الخط کی حفاظت ادباء وشعراء اوران کے توسط سے اردو کے ایک دوسرے ملک میں ہونے والے پروگرام اوراردو کو پروان چڑھانے جیسے عوامل پر زور دیا بچوں کی بنیادی تعلیم میں اردو کی زبان کی اہمیت کواجاگر کیا،اردو کے پرانے مراکز سے نئے مراکز کے روابط اوراردو کی نئی بستیوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ،تقی عابدی نے اس اہم مسئلہ کوشدت کے ساتھ محسوس کیا کہ سنڈے اسکول میں اردو کی تعلیم کو عام کیا جانا چاہئے

لائبریریوں کا انعقاد ہونا چاہیئے اور اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی اہمیت وافادیت پر بھی زور دیا جانا چاہیئے ۔ ان تمام منصوبوں کو علمی جامہ پہنانے کے لئے مندوبین وحاضرین نے بڑی تعداد میں ووٹنگ کی اور خوشی بھی ظاہر کی ۔

2009 میں حیدرآباد کے قیام کے دوران ہفتہ وار ''گواہ'' کو مختصر انٹرویو دیتے ہوئے جس کا اہتمام ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کیا تھا تقی عابدی نے کہا کہ اردو شاعروں ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ناقدری سے اردو کی نئی بستیوں کو نقصان پہنچ رہا ہے ۔ اردو کی ترویج اور اشاعت کو عام کرنے کی ضرورت ہے مشاعروں سے اردو کی ترقی نہیں ہوسکتی کیونکہ مشاعرے اب آموزشی پلیٹ فارم نہیں رہے کئی شعرا اپنا مقام کھو چکے ہیں وہ اپنی 6 شعروں کی غزل سنا کر 60 بار داد حاصل کر چکے ہیں سستی شہرت کے لئے ایسے حضرات جن کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں رہتا چند ڈالر کے ذریعے ہر وہ شئے خریدنا چاہتے ہیں جن کے وہ حق دار نہیں ، دراصل یہ کاغذی شاعر ہوتے ہیں جن کی اصلیت چند دنوں میں سامنے آجاتی ہے ۔مزید انہوں نے کہا کہ کینڈا میں ناظم الدین مقبول نے سنڈے اسکول کے ذریعے اردو کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں نارتھ امریکہ میں پہلے سنڈے اسکولس کے ذریعے کام ہو رہا تھا مگر اب ان اسکولوں پر دوسروں نے قبضہ کر کے اردو کو نقصان پہنچایا ہے ۔ اب تو جمعہ کے خطبات تک انگریزی میں ہوتے ہیں صرف مجالس اعزا ہی اردو میں ہوتی ہیں انہوں نے کہا کہ والدین کو احساس نہیں کہ کس طرح اپنے بچے کو مادری زبان میں تعلیم دلائی جائے تا کہ

اپنی تہذیب سے ان کا رشتہ قائم رہ سکے نئی نسل نہ تو اردو پڑھتی ہے اور نہ بولتی ہے، جب تک نئی نسل کا رشتہ اردو سے نہیں جوڑا جائے گا اس وقت تک اردو کے مستقبل سے متعلق کچھ کہنا اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینا ہے۔

تقی عابدی نے کہا کہ اردو کی بقا کے لئے اردو کتابیں ضروری ہیں ٹورانٹو میں ایک لائبریری میں سترہ ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں اب آہستہ آہستہ کتابوں کا کلچر ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جو اردو کو ختم کرنے کی کوشش ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ اردو کے کسی بھی خدمت گزار پر تنقید کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہے تنقید برائے تعمیر ضروری ہے۔ مگر اردو کی بنیادوں کو استحکام بخشنے والوں پر غیر ضروری تنقیدیں ناپسندیدہ ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے نومبر 2014ء میں تین روزہ انٹرنیشنل سمینار کا انعقاد کیا۔ اس سمینار میں بعنوان ''اکیسویں صدی: عالمی ادب کے تناظر میں اردو ادب کی نشو نما کی سماجی اور تہذیبی قدروں کی ترقی کے امکانات'' کے تحت تقی عابدی نے لکھا تھا:۔

> ''یونیسکو کے اعداد وشمار کے مطابق اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد پانچ سوملین افراد پر مشتمل ہے اردو زبان دنیا کے تقریباً 70 ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جہاں اردو دنیا کے کئی ممالک میں اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے ساتھ زندہ رہے گی لیکن اس کی زندگی کے لئے ان ممالک کے کلچر کے ساتھ ہم آہنگی بھی ضروری

ہوگی ۔اردو کی تعلیم اور تدریسی تربیت کے لئے ہندوستان سے واپسی پر جان
گل کرسٹ نے 1816 میں انگلینڈ میں اردو تعلیم کا مدرسہ کھولا چنانچہ مغربی
دنیا میں باقاعدہ اردو تعلیم کا آغاز تقریباً دوسو سال قبل ہو چکا تھا ، اگر چہ
یورپ کے کئی دوسرے ملکوں میں اردو شناسی تین سو سال سے کم نظر آتی ہے۔
ہماری تحقیق کے مطابق اردو بحیثیت زبان پھیل رہی ہے لندن میں 1960
میں رالف رسل نے پیشین گوئی کی تھی کہ آئندہ پچاس سال میں انگلینڈ میں
اردو ختم ہوجائے گی۔ یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور آج انگلینڈ میں اردو
بولنے والوں کی تعداد پانچ گنا ہوگئی ہے۔اس لئے حکومت برطانیہ نے اردو کو
انگلینڈ کی چوتھی بڑی زبان قرار دیا ہے۔" (13)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اپنے ایک لیکچر میں تقی عابدی نے کہا کہ آزادی کے بعد بعض گوشوں کی جانب سے اردو کو صرف 50 سال کا مہمان کہا گیا تھا لیکن یونیسکو کے اعداد وشمار کے مطابق اردو آج دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے ۔تقریباً ایک سو برس قبل سے اردو والوں کی نئی بستیاں بننا شروع ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ جدید وسائل جیسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے ہم اس کے فروغ کے لئے کام کریں تو زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو مادری زبان کہنے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں کو اردو سکھانے کا تہیہ کرلیں تو یہ زبان زوال پذیر نہیں ہوگی۔

اردو کی نئی بستیوں میں ابھرتی ہوئی نئی بستی جو اردو بولنے والے ملکوں میں پانچویں یا چھٹے نمبر پر ہے سعودی عرب ہے اور اس ملک کے خوبصورت شہر جدہ میں دو روزہ عالمی اردو کانفرنس جس کے انعقاد کا سہرا مولانا آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کے سر ہے۔ کانفرنس کے اختتامی جلسہ میں مشہور شاعر جناب چندر بھان خیال نے اپنے خطاب میں اس بات کی تائید کی تھی کہ بھارت میں اردو کے فروغ کے تحفظ اور فروغ کے لئے ہر ممکنہ قدم اٹھایا جارہا ہے۔حکومت کی نیت صاف ہے اور وہ اردو کی ترقی کی خواہاں ہے اردو زبان پر کسی فرقہ کا حق نہیں بلکہ ہر مذہب وملت کا باشندہ اس کے پرستاروں میں شامل ہے۔انہوں نے موجودہ حالات میں اردو کی ترقی کے لئے جدید ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کے ساتھ ساتھ روزگار کے ہر مواقع فراہم کرنے کی مثبت کوششوں کا ذکر کیا اور حکومت ہند کے تعاون کا اطمینان دلوایا۔

پروفیسر نارنگ کی معجزہ بیانی اور قادر الکلامی کے سب معترف ہیں اس کانفرنس میں انہوں نے بتایا کہ اردو زندہ زبان ہے۔میری شریعت میں مایوسی حرام ہے۔ میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔اردو پھیل رہی ہے اردو نے ہر دور میں مشکلات کا سامنا کیا ہے اور آج اردو نہ صرف بھارت اور پاکستان بلکہ مشرقی وسطی یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی تیزی سے اپنا مقام بنارہی ہے۔

اختتامی جلسے کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں کینیڈا کے شاعر ادیب

ومحقق ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا اور کہا آج سے سو سال پہلے اردو ترقی بورڈ بنایا گیا اور آج اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت ہے، اردو کسی فرقہ یا قوم کی میراث نہیں یہ حسن یوسف ہے جسے بازار مصر میں پیش ہونا ہے۔ وہ اردو جو دکن میں پیدا ہوئی شمالی مغربی ہند میں گھٹنوں چلی دلی میں جوان ہوئی لکھنؤ میں دلہن بنی جس کا میکہ اردوئے معلیٰ جس کی نسل اردوئے محلّہ میں پھیل گئی وہ اردو جو پنجابی کی بہن کہلائی وہی اردو جب جوان ہوئی تو فارسی نے اپنی سوکن جانا دربار میں آنے کی اجازت نہ دی بازار میں رہی عوام کی خدمت گذار بنی لیکن چونکہ شگفتہ تھی جوان تھی اپنے الفاظ کی دولت سے بھاری تھی آخر دربار پہنچ گئی۔ شاہ عالم اس کے عاشق ہوئے شاہ ظفر اس کی زلفوں کے اسیر ہوئے اسی اردو کو گل کرسٹ نے مسیحیت سکھائی چکبست نے رامائن پڑھائی، انیس نے کلمہ پڑھایا۔ تقی عابدی نے اس اجلاس میں عصری مسائل اور اردو طریقۂ تعلیم اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی پر محققانہ مطالب پیش کئے اور مقالوں پر مختصراً گفتگو کی۔ کانفرنس کے اختتامی اجلاس کی ابتداء تقی عابدی نے کی۔ انہوں نے کہا کہ کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں خصوصاً امریکہ اور کینیڈا میں اردو زبان کی ترقی وفروغ کے حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تقی عابدی کہتے ہیں:

> ''اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے اب اردو صرف اردوئے معلیٰ تک محدود نہیں بلکہ اردوئے محلّہ میں رونق بازار ہے۔ اب اردو کا پرچم اردوئے معلیٰ نہیں بلکہ اردوئے محلّہ پر لہرا رہا ہے۔ دبستان دہلی، لکھنؤ

، آگرہ، حیدر آباد ، پنجاب وغیرہ میں اردو کی نشو ونما کے لئے جدید لسانی تجربات کی ضرورت ہے ۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر اس دور میں فوقیت حاصل نہیں اور اردو ادب عالمی شہرت کا حامل ہے۔ اب داغ کا شعر زمان ومکان کی حدود سے نکل چکا ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

امریکہ اور کناڈا میں آج کل اردو بولنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے ۔ دوسو کے قریب مشاعرے اور سو کے اوپر ہفتہ وار اخبارات کئی اردو ریڈیو پروگرامس کئی عمدہ اردو ٹی ۔ وی چینل کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر ادب عالیہ تحقیق اور تنقید کا کام بھی ہورہا ہے ۔ راقم نے ان ہی ملکوں میں رہ کر اردو کے گیسو کو سنوارنے کی کوشش کی ہے کینیڈا اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے گہوارہء اردو کی طرح یہاں بھی اردو اب کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے آنکھوں کی زبان نہیں رہی جس کے لئے اس کی بنیادی تعلیم کی ضرورت ہے۔''

نوٹ: یہ کانفرنس کے دوران پڑھے گئے مقالے کی تلخیص ہے۔

میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں سچائی یہ ہے کہ اردو زبان کو مسائل درپیش

ہیں اور اردو اس وقت ترقی کی منزل پر نہیں بلکہ تحفظ کے مرحلے پر ہے اردو زندہ ہے زندہ رہے گی اور ہر زندہ چیز کے مسائل بھی ہوں گے ہمیں ابھی سے سوچنا پڑے گا کہ ہماری زبان کو کیا مسائل ہو سکتے ہیں یا ہونے والے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ یہ کانفرنس اسی کی ایک کڑی ہے اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اس لئے اس کا تحفظ ہمارا فرض ہے مجھے خوشی ہے کہ لوگ اردو زبان کا تن من اور دھن سے تحفظ کرر ہے ہیں میں آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ اردو کی ترقی میں نو جوانوں کی ضرورت ہے اور ان کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس اجلاس میں تقی عابدی نے جدہ کو نئی بستی قرار دیا۔

ا۔ **اُردو کی بنیادی تعلیم**: بچوں کو اسکول مکتب، سنڈے اسکول، دینی مدارس اور گھر میں اردو پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دی جائے والدین خود یا کسی معلم کے ذریعے اس فریضہ کو ادا کریں تو اردو کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے۔

2۔ **اردو کے عصری تقاضوں سے متعلق چند مسائل اور ان کا حل**: قومی کونسل (NCPUL) کے تحت منعقد کرائی گئی اردو عالمی کانفرنس میں تقی عابدی نے اردو کے عصری تقاضوں کے متعلق چند مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا حل بیان کیے جو مندرجہ ذیل ہیں:

3۔ **اردو رسم الخط کی حفاظت**: اردو کی بقا اور اردو تہذیب اور ثقافت کا ذخیرہ صرف اس وقت کار آمد ہوسکتا ہے جب جدید نسل اردو رسم الخط سے واقف ہو آجکل اردو

صرف کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اردو رسم الخط اردو کی آن بان جان اور پہچان ہے جس میں کوئی دورائے نہیں۔

اُردو کو روزگار سے جوڑنا: جب تک اردو کو روزگار سے نہ جوڑا جائے گا۔ اردو تعلیم میں مشکلات بڑھتی جائیں گی اردو میں رائج الوقت کورسیز (Courses) چلائے جائیں جس سے روزگار حاصل کرنے میں سہولتیں حاصل ہوں۔

4۔ اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنا: کمپیوٹر اور دوسری سائبر ٹیکنالوجی سے اردو کو ملحق کرنا اردو کی بقا اور ارتقاء کا ضامن ہے۔

5۔ اردو رسم الخط میں آسانیاں (املا، حروف تہجی وغیرہ) پیدا کرنا۔

6۔ اردو کی نئی بستیوں کی رہنمائی اور گہوارۂ اردو سے ان کے ارتباطی مسائل پر عمل کرنا۔

7۔ اردو کو معیاری بنانے اور عالمی ادب سے منسلک کرنے پر غور و خوض کرنا۔

8۔ ریڈیو۔ ٹی وی اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اردو کی تشہیری ترویجی مسائل پر غور و خوض کرنا۔

9۔ اردو کے تخلیقی تنقیدی اور تجرباتی ادب میں نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرنا۔

10۔ عالمی کانفرنسوں دانش گاہوں اور سمیناروں کے انعقاد سے اردو پرستاروں کی تعلیم و تربیت کرنا۔

11۔ اردو صحافت اور جرنلزم سے عوام کو جوڑنا۔

نوٹ: یہ اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکان میں پڑھے گئے مقالہ کی تلخیص ہے۔

اردو ادب کے عظیم سرمائے کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں انہیں متعارف کرانے کی ضرورت ہے اردو شعر وادب کا تعلق اور اس کا ادبی ذوق اور ثقافتی اثر دنیائے ادب کی مختلف چھوٹی بڑی زبانوں سے مربوط ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم اس میدان میں ایشیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں آج فارسی ادب کے عظیم شعرا جن میں مولانا روم۔ عمر خیام حافظ اور فردوسی دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پڑھے جاتے ہیں لیکن برصغیر کے عظیم شعراء میرؔ، اقبالؔ اور فیضؔ صرف چند ملکوں کے ادیبوں دانشوروں اور شاعروں میں مقبول ہیں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں تجربے تجزیے پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا کے جدید تجربوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ مختلف ملکی و عالمی سمیناروں میں تقی عابدی بشمول ہندوپاک کی نئی بستیوں میں اردو زبان وادب کے فروغ اور ترویج واشاعت کے لئے کوشش کررہے ہیں۔آپ نے ہمیشہ اردو ادب کو استفادی اور تعمیری ادب سے تعبیر کرتے ہوئے متعدد تنظیموں اور نشستوں کا اہتمام کیا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے نومبر 2014ء میں سہ روزہ عالمی سمینار جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تحت منعقد ہوا تھا اس میں اردو کی نئی بستیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ یہ بستیاں بستے بستے بس رہی ہیں جن کی تاریخ بھی دوصدیوں پر بکھری پڑی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک جن میں برطانیہ، فرانس، جرمنی،

آسٹریلیا، روس، پرتگال ، ہالینڈ کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ کے کینیڈا اور یونائٹیڈ اسٹیٹ اور امریکہ کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں انجمنوں اداروں کے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں اردو پلی اور بڑھی لیکن اس کی حیثیت ایک خوش نما پودے کی طرح ہے جو باغ کے باہر سنگلاخ زمین میں یک وتنہا زندگی کے دن کاٹ رہا ہو۔ضرروت یہ ہے کہ اردو کی بستیوں کو گھوارہ اردو سے منسلک کردیا جائے یہ سچ ہے کہ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی نشو نما اور اس کی پرستاری ذوقی اورشوقی جذبات سے جڑی ہوئی ہے کیوں کہ کسی سماجی ثقافتی اور اقتصادی دشواری کے بغیر مغربی مما لک میں زندگی گذاری جاسکتی ہے۔اس لئے صرف جذباتی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ صدیوں کے تجربات جو گھوارۂ اردو کے مراکز حاصل کئے ہیں ان سے مدد ضروری ہے ورنہ اس بات کا اندازہ ہے کہ کہیں یہ نہال اردو خشک نہ ہوجائے اردو بستیوں کی بقاءاور ترقی ان کے مسائل کا حل اردو کی قدیم اور کلاسک مراکز سے وابستگی ہے۔ ماحصل یہ کہ تقی عابدی اردو کے تابناک مستقبل کو روشن بنانے کے لئے تقی عابدی غیر مما لک میں نہ صرف یہ کہ کتابیں تحریر کرر ہے ہیں بلکہ ادبی مجالس کا انعقاد کرکے اس زبان کو ترقی دینے میں اہم کردار بھی ادا کرر ہے ہیں۔

تقی عابدی کی اُردو ادبی خدمات اور اردو کے فروغ کے لئے کی گئی ان کی کوششوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کا یہاں میرا مقصد صرف اورصرف یہ تھا کہ قاری کو اس بات سے روشناس کراسکوں کہ اردو زبان کے ساتھ ان کا عشق جنون کی حد تک ہے۔ وہ اس زبان

کوعظیم تہذیبی ورثا سمجھتے ہیں اوراس زبان کی بقاء کے لئے دیار غیر میں ان اردو والوں سے زیادہ کام کررہے ہیں جو ڈھیر ساری تنخواہیں تو لیتے ہیں لیکن جب زبان کے بقا کی بات آتی ہے تو ان کے لب خاموش ہوجاتے ہیں۔اس کے برعکس تقی عابدی اگرچہ پیشے سے ایک ڈاکٹر ہیں لیکن اردو سے جنہوں کی حدتک عشق ہونے کی وجہ سے وہ اس زبان کی آبیاری تن من اور دھن سے کررہے ہیں جس کا ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جن کا ذکر میں اس باب میں کرچکی ہوں۔

باب سوم

تقی عابدی اور انیسؔ فہمی

(الف)۔صنف مرثیہ اور اردو مرثیہ کی روایت

شعری اصناف کے تاریخی پس منظر کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس بیش قیمت سرمائے میں سے صنف ''مرثیہ'' ایک ایسی صنف ہے جسے غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی، کے علاوہ داستان کی طرح خصوصیات حاصل ہیں۔ مرثیہ ایک واحد صنف ہے جس کی ابتدا میں کوئی مخصوص ہیت نہیں تھی ابتداء میں اس میں داستان اور مثنوی کا سارنگ بھی ملتا ہے۔ ساتھ ہی مسلسل داستان کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں مرثیہ میں ڈرامائی رزم و پیکار کے تمام عناصر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ صنف ''مرثیہ'' کو اولیت کا درجہ دینے کے لئے نورالحسن نقوی کے اس قول کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

''شاعری میں جو صنف سب سے پہلے وجود میں آئی وہ مرثیہ ہے۔''(۱)

ان کے اس قول سے ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ کی تاریخ اس زمین پر انسان کے وجود کی تاریخ ہے۔ اپنی آفاقیت کے اعتبار سے ہر زبان اور ہر تہذیب و مذہب کا وسیلہ اظہار بنی۔ چونکہ رنج وغم ایک آفاقی احساس ہے اور انسان کی فطرت میں رچا بسا ہوا ہے اور اسی رنج وغم کے اظہار کا نام شاعری ہے۔ جو مرثیہ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

''مرثیہ'' عربی لفظ ''رثٰی'' سے مشتق ہے جسے انگریزی میں DIRGE ELEGY کہا جاتا ہے۔ لفظ ''رثٰی'' سے مراد مرنے والے کی تعریف و توصیف بیان کرنا کے ہیں۔ نور اللغات میں مرثیہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''مردے کی صفت، مردے کی تعریف، وہ نظم یا اشعار
جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اور مصیبتوں کا
ذکر ہو''۔[2]

لیکن یہ تعریف مرثیہ کے ابتدائی دور کی ترجمانی کرتی ہے جس دور میں شخصی مرثیے لکھے گئے۔ظاہر ہے یہ دور مرثیہ کا ابتدائی دور تھا اور عربی زبان کو یہ وصف حاصل ہے جس کی کوکھ سے مرثیہ نے جنم لیا۔شخصی مرثیہ جیسے کے عربی زبان میں رقاشی نے جعفر برمکی کا مرثیہ لکھا۔اس کے بعد حضرت عمر کے دور خلافت میں ایک عورت نے اپنے بھائی کا مرثیہ لکھا تھا جسے وہ گلی گلی، ڈگر ڈگر اور ہر مجمع میں پڑھتی اور سنا سنا کر روتی اور رُلاتی پھرتی تھی۔ لیکن آج اگر مرثیہ کی بات کی جائے تو ذہن فوراً واقعات کربلا کی طرف جاتا ہے۔چونکہ واقعہ کربلا اتنا دل دوز اور درد واثر رکھتا ہے کہ سننے کے بعد دل پر بے ساختہ اتر جاتا ہے۔ واقعہ کربلا سے پہلے مرثیے ذاتی غم والم کے اظہار کے لئے لکھے جاتے تھے۔کربلائی مرثیہ کے حوالے سے صاحب نواللغات آگے بڑھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ اشعار جن میں شہدائے کربلا کی شہادت کے واقعات و حادثات کا
دردانگیز بیان کیا جائے''۔[3]

واقعہ کربلا تاریخ انسانی کا غیر معمولی واقعہ ہے اس واقعے میں انسان اور انسانیت کے لئے کتنے ہی حیرت انگیز اور اخلاق آموز پہلو موجود ہیں اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو اس

کی تفصیل اور حقائق سے اچھی طرح واقف ہو۔ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مرثیہ کے لئے کوئی مخصوص ہیت مقرر نہیں تھی لیکن اگر ہم اپنی زبان اردو کی بات کریں تو ہمیں ایسے مرثیہ گو نصیب ہوئے جنہوں نے صنف مرثیہ کے لئے ہیت بھی قائم کی اور مرثیہ کو بام عروج پر پہنچایا۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین اپنی کتاب ''اردو کی شعری اصناف'' میں لکھتے ہیں:

> رثائی شاعری میں اردو مرثیے کوفنی نقطۂ نظر سے ایک خاص عظمت ووقار حاصل ہے کیوں کہ صرف اردو کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مرثیے کو ایک منفرد صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کروایا، اس کے فنی اور ہیتی لوازمات کا تعین کیا اور دنیائے شاعری میں رزمیہ نظم نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔''[۴۳]

ابتداء میں مَیں اس بات کا کر چکی ہوں کہ صنف مرثیہ عربی سے فارسی میں داخل ہوا۔ اردو نے جس طرح دیگر شعری اصناف کو فارسی سے مستعار لیا اسی طرح صنف مرثیہ کو بھی قبول کیا اور اس قدر ترقی وترویج دی کے یہ کہنے میں کوئی مغالطہ محسوس نہیں ہوتا کہ اردو زبان نے ہی اس صنف کو جنم دیا ہے۔عربی میں جو بھی مرثیے لکھے گئے یقیناً شخصی مرثیے ہیں، فارسی زبان میں کس نے پہلا مرثیہ کہا یہ ذرا تفصیل طلب بحث ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشہور شاعر فردوسی نے جب ''شاہنامہ فردوسی'' لکھا تو اس میں جب سہراب کی موت پر اس کی ماں کا اضطراب اور غم وگریہ زاری کا اظہار کرنا مرثیہ کی اولین نشانی ہے۔اس کے بعد محمود

غزنوی کی وفات ہو جانے پر فرخی نے جو اشعار کہے ان اشعار کو بھی مرثیہ کے ابتدائی دور کی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ الغرض اگر عربی مرثیہ یا فارسی مرثیہ کی بات کی جائے تو اس موضوع کے حوالے سے ایک کتاب درکار ہے۔ یہاں چونکہ میرا موضوع عربی یا فارسی مرثیہ نہیں ہے۔اس لئے اپنا پہلو بچاتے ہوئے اردو مرثیہ کی تعلق سے بات کرنا ہی بہتر سمجھتی ہوں۔

اردو مرثیہ کی روایت جاننے سے قبل ضروری ہے کہ اردو مرثیہ کی ہیت، اردو مرثیہ کے موضوعات، اردو مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے جس سے اردو مرثیہ کی اہمیت اور کامیابی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ سب سے قبل اگر اردو مرثیہ کی ہیت کو پہچاننے کی کوشش کریں تو اردو مرثیہ کی ہیت بھی عربی اور فارسی مرثیہ کی ہیت کا ہم پلو ہے۔ اردو مرثیہ بذات خود ایک صنف محسوس نہیں ہوتی بلکہ دیگر تمام اصناف کا سنگم نظر آتا ہے۔ اگر ہم مثنوی کی بات کریں تو مثنوی کی تو یہ بنیادی صفت ہے کہ کسی واقعہ کا تسلسل کے ساتھ بیان کرنا، اسی شرط کی کسوٹی پر اگر کربلائی مرثیہ کا جائزہ لیا جائے تو کربلائی مرثیہ بظاہر ایک مثنوی کی صفات لئے ہوئے ہے جس کو مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ اگر قصیدہ کی تعریف کو سامنے رکھ کر مرثیہ کو دیکھا جائے تو ایسی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں جن سے لگتا ہے کہ یہ قصیدہ ہے۔ کیونکہ قصیدہ کے معنی ہیں کسی کی مدح یا ہجو کرنا اور مرثیہ میں بھی یہ گنجائش بدرجہ اتم موجود ہے کہ مرثیہ میں نیک سیرت شخصیات کے نیک افعال کا ذکر کیا جاتا ہے گویا ایک قسم کی مدح ہوئی دوسری طرف متعدد شخصیات کے بد اعمال اور بد کردار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے گویا ان کی

ہجو کی گئی ہو۔ یہی مماثلت مرثیہ کو قصیدہ کے قریب لاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرثیہ کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جن کی ہیئت غزل کی ہیئت ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ کو ڈرامہ کی بھی تمام خصوصیات حاصل ہیں۔ڈرامہ کے دو رخ یعنی ٹریجڈی اور کامیڈی (المیہ اور طربیہ) ہوتے ہیں اگر مرثیہ میں واقعات کربلا کا ذکر ہو رہا ہے تو ابتدا تا آخر پورے واقعات کی منظر کشی اس طرح پیش کی ہوگی کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور شروع سے آخر تک ایک یاسیت اور حزنیہ کیفیت چھائی رہے گی۔

جہاں تک موضوعات کی بات ہے تو اردو شاعری پر چونکہ ابتدا سے ہی یہ الزام حاصل تھا اور بدنعام تھی کہ اردو شاعری کے پاس موضوعات کی کمی ہے۔سوائے حسن و عشق، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے کچھ بھی نہیں ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مرثیہ نے اردو شاعری کے اس تنگ دامنی کو وسعت بخشی۔نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''شاعری کی مختلف اصناف میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر مرثیے میں سما گئیں۔اس نے المیہ سے انسانی مصائب کی پرتاثیر پیش کش کا ہنر سیکھا۔رزمیہ سے حق و باطل کی معرکہ آرائی مستعار لی۔ ڈرامے سے واقعات کی ہو بہو تصویر کشی کا فن لیا، مثنوی کے تسلسل بیان کی پیروی کی، قصیدے کا شان و شکوہ اپنایا، غزل سے حسن ادا لیا اور مرثیے کو فن کاری کے نصف النہار تک پہنچا دیا۔ہمارے مرثیہ نگاروں کے خون جگر سے

یہ صنف اردو شاعری کے لئے سرمایہ افتخار ہوگئی اور بعض اعتبار سے غزل سے
بھی کہیں زیادہ مقبول، اس سے کہیں زیادہ پر اثر اور دل فریب!''[۵]

یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں کہ غم و اندوہ کی لپیٹ میں مجروح انسانی جذبات و احساسات اگر باطنی کیفیت اختیار کر لیں تو ایک فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس فضا کو ختم کرنے کے لئے ایسا موثر طریقہ بیان یا اظہار اپنایا جاتا ہے جس سے رگ رگ کے درد کے چشمے ابلنے لگیں ایسا معلوم ہو کہ خون دل اشک بن کر بہنے لگا اور زبان پر فریاد ہو۔ تاہم درد و اندوہ کا یہ انداز بیان کبھی بے ربط جملوں کی صورت میں زبان پر آتا ہے اور کبھی منظم اور مربوط جملوں میں ڈھل کر نظم کا آہنگ اختیار کر لیتا ہے، جسے ہم اصطلاحاً مرثیہ کہتے ہیں۔ یہ کہنے میں بھی کوئی تحمل نہیں کہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی ہے لیکن جب انسانی ذہن کی قوت علم و فکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ نظم وجود میں آئی تو فریاد کی بھی لے بن گئی اور نظم کی صورت نوحہ اور مرثیہ کہلائی۔

اگر ہم کربلائی مرثیہ ہی کی بات کرتے ہیں تو واقعات کربلا کو ایک ربط و ضبط اور مربوط طریقے سے بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً حسین اور خانوادہ حسین کی سیر و شخصیت، کردار، جذبات، احساسات، اعزاہ سے رخصتی، میدان کا زار میں ان بے سر و سامان فدائیان حسین کی آمد، آلات حرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے کناروں پر یزیدیوں کے پہرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کی زخم خوردہ لاشوں پر بین و بکاہ وغیرہ۔ ان ہی واقعات و بیانات میں ایک منطقی ربط و تسلسل قائم رکھنے کی خاطر مرثیے

کے لئے بعض اوقات آٹھ اجزائے ترکیبی وضع کئے گئے:

ا۔ چہرہ، ۲۔ سراپا، ۳۔ رخصت،

۴۔ آمد، ۵۔ رجز، ۶۔ رزم،

۷۔شہادت، ۸۔ بین

اردو کا طرۂ دستار فضیلت (مرثیہ) جس کا ڈھانچہ میر ضمیرؔ نے بنایا اور اس کے کینوس کو وسعت عطا کی ۔ میر ضمیرؔ کے بعد ان کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیرؔ وغیرہ نے جو اجزاء متعین کئے تھے ان کی پابندی خود ان کے مرثیوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی ۔ مثال کے طور پر مرزا دبیرؔ کا یہ مشہور مرثیہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' یہ مرثیہ 'آمد' سے شروع ہوتا ہے ۔اس کے برخلاف ان کے باقی مرثیے فکری اور فنی اعتبار سے شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں ۔ میر ضمیرؔ کے بنائے ہوئے مرثیے کے خاکہ میں ان کے قابل فخر شاگرد مرزا سلامت علی دبیرؔ اور میر مستحسن خلیقؔ کے مایہ ناز فرزند میر ببر علی انیسؔ نے اپنی قوت تخلیق اور نہایت ارفع و اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں سے ایسے خوبصورت رنگ بھرے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ میر ضمیرؔ کے تخلیق کئے ہوئے کینوس کی بدولت ہر طرح کے مضامین کے لئے اس کی آغوش وا ہوگئی اور مرثیہ تمام اصنافِ سخن کے رنگا رنگ پھولوں سے بنایا ہوا ایک حسین گلدستہ بن گیا ۔ مرثیہ کے ان مختص اجزائے ترکیبی کی وضاحت درج ذیل میں پیش ہے:

چہرہ:۔ مرثیہ کی ابتدا براہ راست موضوع سے نہ ہو بلکہ اصل موضوع سے ہٹ کر کسی

دوسرے موضوع کے حوالے سے اشعار کہے جائیں جنہیں تمہید بھی کہہ سکتے ہیں یا قصیدے کی تشبیب کا مقام بھی دے سکتے ہیں ۔اس میں شاعر حمد، نعت، منقبت، حضرت علی، حضرت امام حسین کے علاوہ مکہ سے سفر، سفر کے پرخطر حالات، گرمی کا موسم، صبح کا موسم بیان کرتا یا پھر اپنی شاعرانہ عظمت، قادر الکلامی، ثنا خوان اور حسین ہونے پر فخر کا اظہار کرتا ہے ۔کبھی پیاس کی کیفیت کا بیان کرتا ہے، موسم گرما میں گرمی کی شدت کا بیان، صبح کا منظر، چڑیوں کی چہچہاہٹ، شبنم کا پھولوں پر گہرا آبدار بن کر چمکنا وغیرہ قسم کے مناظر تشبیہہ و استعارے اور صنائع بدائع کی زرتابی کے ساتھ قلم بند کئے جاتے ہیں۔انیسؔ کے ایک مشہور مرثیے میں صبح کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔:

وہ دشت ، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بہ جا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار (انیسؔ)

سراپا:۔ اس میں مرثیہ کے ہیرو کے کارنامے پیش کرتے ہوئے اس کی عادات و اطوار اور قد و قامت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سراپا لکھنے میں شاعر اپنا زورِ قلم صرف کر دیتا ہے، جس سے شاعر کی اپنی محبت و عقیدت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف باطل یعنی یزیدیوں سے نفرت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سراپا بیان کرتے وقت تشبیہات و استعارات

کے علاوہ صنائع بدائع کے خزانے لٹا دیئے جاتے ہیں۔ دبیرؔ اپنے ایک مرثیہ میں سراپا لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر میں حسین کے رخ کو آئینہ کہوں تو سمجھو کہ میں نے کچھ ثنا نہیں کی، آنکھ کو نرگس کہوں تو ان آنکھوں کے لئے کسر شان ہے کیونکہ نرگس میں نہ پلکیں نہ پتلی نہ بصارت۔ پیش ہیں چند اشعار:

آئینہ کہا رخ کو تو، کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
گر آنکھ کو نرگس کہوں ، ہے عین حقارت
نرگس میں نہ پلکیں ہیں، نہ پتلی ، نہ بصارت

رخصت:۔ لفظ رخصت بذات خود اپنی وضاحت ہے۔ اگر ہم کربلائی مرثیہ کی ہی بات کرتے ہیں تو اس میں ہیرو یا مجاہدین اپنے اہل و اعیال اور احباب و قربا سے اجازت طلب کرتے ہیں اور میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں۔ سر پر کفن باندھے ہوئے جانبازوں کو متعلقین بہ چشم گریاں ، بہ لب لرزاں مگر قوت ایمانی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اس موقع پر جو اشعار کہے جاتے ہیں کافی دل دوز اور دل نا برداشتہ ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسین کی رخصتی کی منظر کشی انیسؔ نے یوں کی ہے:

جب پڑھ چکے شہ بعد فریضہ کی دعائیں
فرمایا کہ رخصت کے لئے بیبیاں آئیں

چھاتی سے پھر اک بار سکینہ کو لگائیں
کچھ بانو بھی کہہ لیویں تو سر دینے کو جائیں
بیووں سے ملاقات کی فرصت نہ ملے گی
پھر عصر تلک بات کی مہلت نہ ملے گی
انیسؔ

آمد:۔رخصت اور رجز کے درمیان یہ جز اہم ہوتے ہوئے مختصر ہوتا ہے جس میں ہیرو کی میدان جنگ میں آمد کی منظر کشی کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ ہیرو کے گھوڑے اور ہتھیاروں کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر دبیرؔ کے مرثیہ سے یہ چند اشعار پیش ہیں:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بہ کف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرز تے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو
دبیرؔ

رجز:۔مرثیہ کی ابتداء عرب سے ہوئی اس سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں خواہ اردو نے

مرثیہ کا ایک ڈھانچہ قائم کیا اور ایک مستحکم وجود بخشا۔ اگر ابتدا عرب سے ہوئی تو اہل عرب کی یہ روایت تھی کہ میدان جنگ میں جب دو ہیرو آمنا سامنا کرتے تو اپنی طاقت کا زبانی مظاہرہ کرتے تھے۔ یعنی اپنے آبا واجداد کی شجاعت، عظمت، قوت ایمانی کا مظاہرہ اس جوش اور جذبے سے کرتے تھے کہ سامنے والا ناتواں ہو جاتا۔ اس منظر کو مرثیہ نگاروں نے بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے۔ رجز کے یہ اشعار پیش ہیں:

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا اُدھر، رخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار ِ قضا و قدر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی
انیسؔ

رزم:۔ مرثیہ کا عظیم الشان اور سب سے اہم جز رزمیہ ہے۔ اس میں جنگ بہ تفصیل اور تمام جزئیات بیان کئے جاتے ہیں۔ میدان جنگ کی تیاری، فوجوں کے ساز و سامان، تلواروں کی چمک، نیزوں کی کڑک اور بے دردی سے لڑنا ان تمام حالتوں اور کیفیتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا جاتا ہے۔ شاعرانہ فکر۔ زور تخیل اور قوت اظہار کے شاہکار اسی حصے

میں نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار پیش ہیں:

اللہ رے زلزلہ کہ لرز تے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے، اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے ، اٹھی برکت اب جہان سے
لو مل گیا زمیں کا طبق آسماں سے
انیسؔ

شہادت:۔مرثیہ کا سب سے دلدوز حصہ شہادت ہوتا ہے کیونکہ اس موقع پر شہید کی جر ات ، بہادری اورفن سپاہ گری کے کمالات کا مظاہرہ، زخموں سے چور چور نڈھال ہو کر گر جانے اور شہادت پانے کا ذکر آتا ہے۔عموماً یہ مرثیہ کا آخری حصہ ہوتا ہے اور رنج والم کے جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے نہایت پراثر ہوتا ہے۔درج ذیل اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں:

ہچکی جو آئی ، تھام لیا ہاتھ سے جگر
انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہ والا کے سامنے

بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

یا پھر حضرت امام حسین کی شہادت کے موقع پر آپ کی بہن بی بی زینب یوں بین کرتی نہیں:

چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی

بہنا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

اردو مرثیہ کا آغاز و ارتقاء:۔عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو تک پہنچنے والی صنف مرثیہ کا سفر بڑا دلچسپ ہے۔عرب میں چونکہ زمانہ قدیم سے ہی مرثیہ گوئی کا رواج عام تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ مرثیہ کی تاریخ گویا انسان کی تاریخ ہے۔انسان کی دنیا میں آمد اور دنیا سے رخصت کا سلسلہ روز اول سے ہے۔روز رخصت دل شکنہ اور دل دوز ہوتا ہے،فطری طور سے ہر عام و خاص کا دل دکھتا ہے اور اس موقع پر دکھے ہوئے دل کا جو اظہار ہوتا ہے وہی مرثیہ ہے۔یہاں یہ تعریف یاد آتی ہے کہ ''زندوں کی تعریف کو قصیدہ اور مردے کی تعریف کو مرثیہ'' کہا جاتا ہے۔یہاں اگر مرثیہ کے دور قدیم سے ارتقائی سفر کی تاریخ کا بیان کریں تو موضوع پھیل جائے گا تاہم اس موقع پر اپنے روئے سخن ''اردو مرثیہ کا آغاز وارتقاء'' کے مطابق بات کرنا مناسب ہے۔

اردو شاعری کے ابتدائی نقوش کو اگر تاریخی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو دکن اہم مرکز رہا ہے جسے اردو شاعری کا منبع قرار دیا جا سکتا ہے۔بہمنی خاندان فرقہ شیعیت کی طرف زیادہ مائل تھا اور اہل شیعیت کا تعلق ایران سے تھا ایران میں فارسی زبان ہی کا چلن

تھا۔ڈاکٹر رشید موسوی لکھتے ہیں:

''دکن میں مرثیہ نگاری کا بنیادی محرک بہمنوں کے آخری زمانے میں حکمرانوں کا شیعت کی طرف رجحان تھا۔ اس دور میں ایران سے کئی علماء دکن آئے۔ان علماء کی وجہ سے سلطنت میں شیعت کا اثر بڑھنے لگا۔''[٦]

ڈاکٹر شارب ردولوی کی کتاب ''اردو مرثیہ'' میں شامل پروفیسر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون ''دکنی مرثیہ اور اس کا پس منظر میں بہمنی دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

''بہمنی معاشرت میں ایرانی اثرات نمایاں تھے۔طرز تعمیر، زبان، علم و ادب اور تمدن کے مختلف شعبوں پر عجمی اثرات کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔''[٧]

مشکل فیصلہ یہ ہے کہ اردو مرثیہ کا پہلا مرثیہ گو شاعر کس کو قرار دیا جائے تو اس حوالے سے بعض مصنفین نے تو اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے اور بعض نے نوری کو پہلا مرثیہ گو کہا ہے۔لیکن اس میں قابل یقین دلیل نصیر الدین ہاشمی کی ہے جنھوں نے اشرف بیابانی کی 'نوسر ہار' (۱۵۰۳ء) کو مرثیہ کا نقطہ آغاز قرار دیا:

''یہ مثنوی شہادت نامہ ہے سنہ ۹۰۹ ہجری یعنی وجہی سے سو سال پہلی کی تصنیف ہے۔اس لئے اشرف کو پہلا دکنی مرثیہ گو قرار دیا ہے۔''[٨]

اب اس بیان سے ایک سوال اور جنم لیتا ہے وہ یہ کہ آیا شہادت نامہ اور مرثیہ ایک ہی صنف ہیں یا دو الگ الگ اصناف ہیں ۔ کیونکہ ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ'' نوسرہار'' ایک شہادت نامہ ہے تو شہادت ناموں کو تو کسی نے بھی مرثیے کے زمرے میں نہیں رکھا۔لیکن اس کے باوجود یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شہادت نامہ میں مرثیہ کا ابتدائی رنگ ملتا ہے۔نوسرہار سے دو یہاں درج میں پیش ہیں:

انکھیا انجھو سب دکھ دھو
لکھیا میں یہ دکھ رو رو
یک یک بول بہ موزوں آن
تقریر ہندی سب بکھان

اسی دور کے شاہ برہان الدین جانم نے بھی مرثیے لکھے۔بعض محققین نے برہان الدین جانمؔ کو اردو کا پہلا مرثیہ گو ثابت کیا ہے ۔ڈاکٹر رشید موسوی لکھتے ہیں:

''لیکن ہمیں شاہ برہان الدین جانمؔ کا بھی ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وجہی اور محمد قلی سے قبل بھی مرثیہ لکھا جا چکا ہے ۔۔۔۔ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطے نمبر ۹۵۷ میں ایک مرثیہ موجود ہے جس پر شاہ برہان الدین جانم لکھا ہوا ہے۔ یہ مرثیہ غزل کی شکل میں ہے جو مرثیہ گوئی کا ابتدائی فارم تھا۔''[۹]

بہنی سلطنت کے بعد قطب شاہی دور کا وجود عمل میں آیا تو اردو مرثیہ کی تقویت میں چار چاند لگ گئے ۔ چونکہ قطب شاہی دور کا پانچواں حکمراں قلی قطب شاہ جنہیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ بذات خود مرثیہ گو تھا اور عشرہ محرم میں مجالس کا باقاعدہ انتظام کرتا تھا۔محرم کے دنوں میں شاہی لباس ترک کر کے ماتمی لباس پہنا جاتا تھا۔ یہ بھی عیاں ہے کہ مرثیہ کی ابتداء اور نشو نما محرم کی مجالس اعزا سے ہوئی۔محرم کے پہلے عشرے میں علم استاد کا اہتمام کیا جاتا تھا اور محفلوں میں مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی کے علاوہ احادیث کا بھی بیان ہوتا تھا۔ڈاکٹر رشید موسوی لکھتے ہیں:

''ایام اعزا میں صبح شام مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں ذاکر واقعاتِ شہادت بیان کرتے اور سوز خاں سوز اور مرثیہ خواں مرثیہ سناتے تھے۔''[۱۰]

شاہی نظام میں اگر اس طرح کا ماحول قائم کیا جاتا تھا تو ظاہر ہے رعایا کا متاثر ہونا بھی لازمی تھا جن میں مسلم وغیر مسلم بھی شریک تھے۔ام ہانی اشرف ان کی مرثیہ گوئی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''محمد قلی کی کلیات میں جو مرثیے ملتے ہیں وہ غزل کی ہیت میں لکھے گئے ہیں ۔ یہ قدیم دکنی زبان کا نمونہ ہیں مگر ان کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ان میں سوز و گداز اور شیرینی بیان موجود ہے۔''[۱۱]

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں کل پانچ مرثیوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ بھی وثوق کے ساتھ

کہا گیا ہے کہ قلی قطب شاہ خود بھی شیعت فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بات سے اگر یہ مان لیا جائے کہ دکن میں مرثیہ شیعت کا جزوِلازم تھا تو کوئی حرج نہیں۔ سفارش حسین رضوی اپنی کتاب ''اردو مرثیہ'' میں قلی قطب شاہ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ اس عہد کا اورنگ نشین حکومت ہی نہیں بلکہ مسند نشین ادب بھی ہے۔ اس کا کلیات جس کا ثبوت ہے۔ مرثیہ کہنے میں اس کا مقام اپنے ہم عصروں سے بہت بلند ہے۔ یہ محض بادشاہی کی بنا پر نہیں بلکہ فن کے معیار اور کلام کے محاسن کی بنیاد پر اس نے پہلے پہل مرثیے میں روایتیں نظم کیں اور بیان میں وسعت اور کلام میں شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش روانی اس کے یہاں بہت ہے۔''[۱۲]

جہاں تک اشرف بیابانی، برہان الدین جانم، قلی قطب شاہ اور وجہی میں سے کسی ایک کو پہلا مرثیہ گو شاعر کہا جائے تو اس کے طے کرنے میں تاریخی شہادت کا قابل اعتبار ملنا ضروری ہے۔ تاہم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو مرثیہ کا ابتدائی رنگ مثنوی ''نوسرہار'' میں ملتا ہے۔ اس کے بعد اگر وجہؔی اور محمد قلی قطب شاہ تو دونوں معاصر تھے جب کہ برہان الدین جانم نے وجہؔی سے ۶۰ برس اور محمد قلی قطب شاہ سے ۸۰ برس قبل شعر کہنا شروع کر دیا تھا اس لئے ہم برہان الدین جانم کو اس بنا پر وجہؔی اور قلی قطب شاہ سے پہلے شاعر تسلیم کرنا چاہیے۔ برہان الدین جانؔم، وجہؔی اور محمد قلی قطب شاہ کے مرثیوں کے انداز میں یکسانیت پائی جاتی

ہے اور یہ مراثی غزل اور قصیدے کی ہیت میں اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ وجہی کے مرثیہ میں سے چند اشعار مثال کے طور پر کئے جاتے ہیں۔

؎ حسین کا غم کرو عزیزاں
انجونین سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہے غم کا
عرش گگن ہور دہرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا ابھی
گریا حسین پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجواں سوں مکڑے
یو غم حسین پر دھو لایا
دلاں میں دو لگی چھوہ نے چٹکیاں
یو غم نے سلگا ابرک لگایا

محمد قلی قطب شاہ کے مرثیہ کے اشعار درج ہیں:

؎ لہو روتی ہیں بی بی فاطمہ اپنے حسیناں تئیں
اورلہو لالی کا رنگ سا تو گگن اپرال چھایا ہے
کیا مہمانی یوں اماماں کا محرم توں

جنگل میں کربلا کے سب بلا یا ں کو بلایا ہے

اسی دور کے دکنی شعر و ادب کے آسمان کے مہر نیم روز اور ماہ نیم روز شاعر بھی سامنے آئے۔جن میں وجہؔی اور غواصؔی نے شہرت عام حاصل کی۔اس دور میں زبان نے کافی ترقی کی اور دوسری صدی (سترھویں صدی) میں متعدد شعرا کے نام لئے جاسکتے ہیں جن میں عبداللہ قطب شاہ،علی عادل شاہ ثانی ،نصرتؔی اور مرزؔا بیجاپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔یہ بھی ماننے میں کوئی اعتراض نہیں کہ اردو مرثیہ کی ابتداء بیجاپور سے ہوئی۔مثال کے طور پر اگر ہم مرزؔا بیجاپوری کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خود کو صرف مرثیہ گوئی کے لئے صرف کر رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کو محض مرثیہ گو شاعر ہی کہا جا سکتا ہے۔مرزؔا بیجاپوری کو مرثیہ کہنے میں اتنی مہارت تھی کہ جیسے مرثیہ وحی کی صورت میں اتر رہا ہو،ساتھ ہی انہوں نے اپنی ایک منفرد روش اختیار کی وہ قابل ستائش ہے بقول:

''مرزؔا بیجاپوری پہلا مرثیہ گو ہے جس نے منفرد مرثیے سے ایک قدم آگے بڑھایا اور مربع مرثیہ کہا، یہ مرثیہ ترقی اور اس کے بیان میں پھیلاو کی طرف پہلا قدم تھا۔''[۱۳]

ضمیر اختر نقوی اپنی کتاب''اردو مرثیہ پاکستان میں'' لکھتے ہیں:

''مرزؔا نے دکنی مرثیے کے ابتدائی دور میں ہی صنف مرثیہ کا معیار درست کر دیا۔انھوں نے مرثیے میں نئے نئے پہلو پیدا کئے۔''[۱۴]

ان کے ہم عصر شعراء میں نصرتی، ملک خوشنود، ہاشمی، ایاغی، مومن، حسینی وغیرہ کے اسمائے گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے خاتمہ کے بعد دکن پر مغل حکمرانوں کا تسلط قائم ہوا۔ اورنگ زیب نے گولکنڈہ اور حیدرآباد کی تمام چہل پہل کو اورنگ آباد منتقل کرلیا۔ اس زمانے کے کئی اور اہم مرثیہ گو شعرا کے نام سامنے آتے ہیں جن میں سید شاہ حسن ذوقی، سید اشرف، شاہ ندیم حسینی ندیم اور یتیم وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ تمام مرثیہ نگار غزل اور قصیدہ ہی کی شکل میں مرثیہ کہتے رہے صرف یتیم احمد کے ہاں مربع کی شکل میں مرثیے ملتے ہیں۔ ان کا زمانہ کم وبیش سودا کا زمانہ ہے۔ ان مرثیہ نگاروں کے علاوہ ہمت علی خاں ہمت، کاظم علی خاں کاظم اور عباس علی خاں احسان کے نام قابل ذکر ہیں۔ جب دکن میں مرثیہ گوئی کے چراغ کی روشنی مدھم ہو رہی تھی تو دہلی میں مرثیہ نگاری کا ایک نیا چراغ روشن ہو رہا تھا۔ اور اس طرح اب دہلی کے مرثیہ نگاروں نے اس صنف کی آبیاری کی۔

اس بات کی وضاحت غیر ضروری سمجھتی ہوں کہ اردو شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ البتہ یہ کہنا لازمی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری دکن سے ہی آئی لیکن دہلی میں جو مراثی کہے گئے ان مراثی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے مرثیہ نگاروں نے دکن کے مرثیہ کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ یہ بھی بجا ہے کہ شمالی ہند کے سامنے اس وقت دکنی اساتذہ کے نمونے موجود تھے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہی نمونے شمالی ہند کے شعرا تک پہنچے۔ نصیر

حسین خاں لکھتے ہیں کہ:

''دکنی یعنی قطب شاہی شہزادے اور امیر زادے ادھر سے اور چیزوں کے ساتھ محرم کی مجلس بھی اپنے ساتھ ادھر لائے۔ اور وہ یہاں رواج پا گئی۔ ان مجلسوں میں یا تو دکنی اردو کے مرثیے پڑھے جاتے تھے یا فارسی نوحے۔''[۱۵]

نصیر حسین خاں کے اس خیال سے ملتے جلتے خیال کا اظہار رئیس امروہوی نے اپنے ایک مضمون ''اعزاداری کی ابتدا اور تدریجی ترقی'' میں یوں کیا ہے۔

''اسی طرح شمال ہند میں اعزاداری کی موجودہ منظم شکلوں اور طریقوں کا رواج اورنگ زیب کے بعد جنوبی ہند آیا۔ عہد فرخ سیر تک شمالی ہند میں محرم کے تعزیے اور شبیہیں اٹھانے کا سراغ نہیں ملتا۔''[۱۶]

مذکورہ بیانات اور خیالات سے یہ عیاں ہو جاتا ہے اور اندازہ لگانے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ دکن کے مقابلے شمالی ہند میں اردو مرثیہ گوئی کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ شمالی ہند میں اردو مرثیہ گوئی کے ابتدائی نقوش کی اگر کھوج کی جائے تو فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' میں ملتے ہیں۔ بہر حال شمال ہند کے اس زمانے کے مرثیہ گو شعرا میں سوداؔ، میر مسکینؔ، حزیںؔ، غمگینؔ، محمد تقیؔ، نظرؔ علی، نعیم علی قلیؔ، ندیمؔ، گداؔ، عاجزؔ، محبؔ، مخزنؔ، جعفر علی حسرتؔ، احدؔ، صوفیؔ اور سکندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مرثیہ نگاروں کا اپنا اپنا ایک مقام ہے لیکن ان میں زیادہ شہرت اور اولیت سوداؔ کو ملی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جس قدر سوداؔ کو اپنے قصائد کی وجہ سے

مقبولیت ملی اس کے مقابلے مرثیے میں بہت کم۔

سوداؔ کو اپنے ہم عصروں میں سے اس لئے الگ پہچان ملی کہ سوداؔ نے اردو مرثیہ کو مسدس کی ہیت سے مستفید کیا۔ لیکن یہ خیال ابھی تک تحقیق کا محتاج ہے اور اختلاف پر مبنی ہے۔ چونکہ بعض محققین نے سکندر کو پہلا مسدس کہنے والا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس لئے تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں کہ:

''سودا کے ہم عصر میاں سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے اور لکھنو میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس لکھا، جو آج تک مقبول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ادو زبان میں یہ پہلا مسدس ہے۔'' [۲۷]

سکندر کا یہ بہت ہی مشہور مرثیہ مسدس کی شکل میں ہے۔ جو آج بھی مقبول ہے۔ اس کا موضوع عام مراثی سے مختلف ہے۔ اس میں جناب صغریٰ اپنے والد امام حسین کے نام قاصد سے ایک خط بھجواتی ہیں۔ قاصد میدان کربلا میں اس وقت پہنچتا ہے جب امام حسین کے سوا سب شہید ہو چکے ہوئے ہیں۔ کربلا میں ان فشانیوں کا حال دیکھ کر قاصد واپس لوٹتا ہے اور جناب صغریٰ سے آنکھوں دیکھا حال سناتا ہے۔ یہ مرثیہ اکسٹھ بند پر مشتمل ہے اور جذبات رنج والم کا ایک بھرپور خاکہ ہے۔

لیکن محققین کی زیادہ سے زیادہ اکثریت سوداؔ کے حق میں ہے یہاں تک کہ شبلی نعمانی بھی

اپنی مشہور تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' میں لکھتے ہیں :

''غالباً سب سے پہلے سوداؔ نے مسدس لکھا جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔ اردو کی وسعت اور ترقی کا یہ پہلا قدم تھا۔'' ۱۸

پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں :

''سوداؔ کے زمانے سے مرثیے کی دنیا میں انقلاب آنا شروع ہوا۔ ان کے مرثیے مختلف ہیئتوں میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار مسدس کو بھی مرثیے کے لئے اختیار کیا۔ آگے چل کر میر ضمیرؔ نے مرثیے کے لئے اسی کو مخصوص کر دیا۔'' ۱۹

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اپنی کتاب اردو کی شعری اصناف میں لکھتے ہیں :

''سوداؔ نے مسدس کی ہیت میں مرثیہ لکھا جو بعد میں میر خلیق اور میر ضمیر کی کوششوں سے مرثیہ کی ہیت قرار پایا۔'' ۲۰

سودا نے مسدس کے علاوہ فرد، مستزاد، مثلث، مربع، مخمس، ترکیب بند اور ترجیع بند میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ ان کے مرثیوں کی خصوصیت ان کے خلوص اور عقیدت کے جذبات تو ہیں لیکن ان میں مرثیہ پن کچھ کم ہی پایا جاتا ہے۔ نورالحسن نقوی لکھتے ہیں :

''سوداؔ کے مرثیوں میں وہ بات تو نہیں جو ان کے قصائد میں ہے لیکن پھر بھی ان مرثیوں کی اہمیت ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سوداؔ جیسے مشہور

شاعر کا کلام ہے ۔ دوسرے اس لئے کہ اس دور کے دیگر شعراء کی طرح
حصول ثواب کی خاطر مرثیے کو اپنانے کے باوجود انھوں نے اس کے ادبی
پہلو کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔''[۲۱]

غزل کے مشہور شاعر میر تقی میرؔ نے بھی مرثیے کہے ہیں لیکن ان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ اس دور کے دیگر مرثیہ گو شعرا میں شاہ مبارک آبروؔ۔ مصطفےٰ خاں یکرنگؔ، شاہ حاتمؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا میں خان آرزوؔ فارسی زبان کا شاعر تھا لیکن دہلی میں اردو شاعری کی ایک نئی تحریک اور چرچہ سن کر متاثر ہوا اور بطور تفنن طبع اردو میں بھی شاعری کی۔ ان کے ایک مرثیہ کے دستیاب ہونے کے حوالے سے ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں:

''خان آرزوؔ کا جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ مربع نہیں بلکہ مسدس ہے۔
غالباً آرزوؔ نے سوداؔ سے متاثر ہو کر مسدس میں مرثیہ کہا ہوگا۔''[۲۲]

خان آرزوؔ کے مسدس مرثیہ کا پہلا بند پیش ہے:

تم کو خبر ہے آیا محرم اے موموناں
دیکھو قمر شفق میں ہو غم سے خونفشاں
اندوہ گیں زمین ہے غمناک آسماں
کیونکر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ہو رواں

یہ کیا ستم ہے مومنو روؤ بہ شور و شین
گھوڑوں پہ یہ شامیاں علم پر سرِ حسین

یک رنگؔ ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی مرثیہ گوئی کا تذکرہ خدائے سخن میر تقی میرؔ جیسے شاعر نے ''نکات الشعرا'' میں کیا ہے۔ ان کا مرثیہ جو غزل کی ہیئت میں ہے۔ اس مرثیے کے چند اشعار دیکھئے:۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی ستی مہمان ِ کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمع شبستان ِ کربلا

اس زمانے کے ایسے شاعر جو ایک صوفی منش بزرگ تھے جن کا نام شاہ حاتمؔ ہے اور جنھوں نے خود کی پہچان کرواتے ہوئے، کسی بھی مسلک سے تعلق نہ ہونے کی صفائی اپنے ایک شعر میں اس طرح دی:

؎ میں نہ سنی نہ شعیہ نہ کافر
لیک لعن ِ یزید کرتا ہوں

شاہ حاتمؔ کے اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا انداز بیان صاف اور سادہ ہے۔ ان کے کلام کا فنی پایہ دہلی کے ادبی معیار کے عین مطابق ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ دکن اور گجرات کے بعد جب دہلی میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تو اس کا ادبی معیار گرا نہیں بلکہ کچھ اور بلند ہوگیا۔

میر تقی میرؔ نے مرثیہ مسدس، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند اور منفردہ میں لکھے ہیں جن میں مربع زیادہ ہیں۔ میر تقی میرؔ نے اپنے مرثیوں میں گریہ خیز پہلو پیدا کئے ہیں اور کربلا کے واقعات میں سے درد انگیز مناظر کا انتخاب کر کے انھیں بار بار نظم کیا مثلاً حضرت علی اصغر کا حال، امام حسین کی شہادت، امام حسین اور حضرت زینب کی گفتگو، بعد شہادت اہل حرم کے مصائب، حضرت عابد بیمار کی اسیری، حضرت قاسم کی شادی وغیرہ۔ ان کے مرثیوں کا ایک اہم پہلو مقصد شہادت کا احساس ہے۔ مرثیے کو صرف بیان مظلومی تک محدود نہ رکھ کر انہوں نے اسے قزن اور ادبیت عطا کی۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں اپنے عہد کے رسوم اور معاشرت کے عناصر بھی داخل کئے ہیں جن سے ان کے زمانے کی اعزاداری کے متعلق بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اب غالباً متروک ہوگئی ہیں۔ مسیح الزماں نے اپنی تصنیف ''مراثی میر'' میں میر کے مرثیوں کی جملہ تعداد ۴۱ بتائی ہے اور لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے مرثیوں میں درد و تاثیر ہے۔ ان کے لہجے میں گداز اور سوز بھی ہے لیکن اس کے باوجود ان میں وہ نشتریت نہیں ہے جو ان کی غزلوں کی

خصوصیت ہے۔''۲۳

سوداؔ اور میرؔ کے بعد ان کے شاگردوں اور مقلدوں نے مرثیے کے فروغ میں حصہ لیا۔ ان میں قائمؔ بہت اہم مرثیہ گو ہیں جنہوں نے سوداؔ کے بعد مرثیہ کو ادبیت عطا کی۔ ان کے کلیات میں چار مرثیے موجود ہیں جو مربع شکل میں ہیں۔ میرؔک کے شاگردوں میں راسخؔ کے مرثیے اہمیت کے حامل ہیں اور ان کے دیوان میں تین مرثیے مسدس کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مرثیہ نگاروں میں جراتؔ، مصحفیؔ، حسرتؔ، رنگینؔ، افسوسؔ، حیدریؔ وغیرہ نے بھی مرثیہ کہے۔ اس دور کے ایک اہم ہم عصر شاعر میر دردؔ کا نام آتا ہے جو بذات خود سید تھے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں کہیں ایسے اشعار نہیں ملتے جن کو مرثیہ کہا جائے جب کہ ان کے شاگردوں کی کافی تعداد مرثیہ کہتی تھی۔

دہلی شاعری کا یہ دور عہد زریں کا دور ہے جس میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ممنونؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ جیسے قادرالکلام شعرا پیدا ہوئے۔ غالبؔ کی مرثیہ نگاری کے جوہر فارسی میں کھلتے ہیں اردو میں انہوں نے کل تین مرثیے کہہ کر قلم روک لیا۔ مومنؔ نے اس طرف توجہ نہیں کی صرف ذوقؔ کے مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس دور کے چند اشعار دیکھئے:۔

یہ کہہ کے آیا گود میں سجاد کے وہ سر
منہ، منھ پہ رکھ کے خوب سا رویا وہ نوحہ گر
زینب کو پھر سر سلطان بحر و بر

کہنے لگا کہ لو پھوپھی اماں ملے پدر
غصے جو مجھ کو دیکھا تو تشریف لائے ہیں
بابا حسین آپ محبت سے آئے ہیں

یہ دور دہلی کے اجڑ جانے کا دور ہے اور شعرا دہلی کی بد حالی سے بدزن ہو کر لکھنو کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے۔ دہلی سے ادبی مرکز لکھنو منتقل ہو گیا تو لکھنو کی سرزمیں اردو مرثیہ کے لئے زیادہ راس آئی۔ لکھنو (اودھ) کے حکمران اثنا عشری تھے اور تعزیہ داری کا رواج عام تھا۔ لکھنو کے دیگر مرثیہ نگاروں میں ایک اہم نام گدؔا کا ہے جنہوں نے طویل عمر پائی اور سوؔدا، میرؔ، ناسخؔ وغیرہ کے مرثیوں سے مختلف مرثیے لکھے۔ ان کے مرثیوں میں ہندوستانی رسموں کا بیان تو ملتا ہے لیکن بیانات میں سادگی اور روانی ہے۔

لکھنوی مرثیہ کی تاریخ میں سب سے اہم نام میر ضمیرؔ اور میر مستحسن خلیقؔ کے ہیں۔ اس دور کو محققین نے تعمیری دور کا نام دیا ہے چونکہ ان دو مرثیہ نگاروں نے اردو مرثیہ کے ڈھانچے میں تبدیلیاں کیں اور اس میں نئے عنصر داخل کئے۔ ان سے قبل بھی لکھنو میں مرثیہ خوانی کی جاتی تھی اور مرثیہ نگار بھی موجود تھے لیکن وہ مرثیہ نگاری میں کوئی انقلاب نہ لا سکے۔ ام ہانی اشرف اپنی کتاب ''اردو مرثیہ نگاری'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت کو میر ضمیر اور میر خلیق نے نہ صرف یہ
کہ پورے طور پر اپنایا بلکہ مرثیے کو شاعرانہ محاسن بھی بخشے۔ میر ضمیرؔ کا یہ

کارنامہ ہے کہ انھوں نے مرثیے میں ربط وتسلسل پر زور دیا۔''۲۴

ڈاکٹر رشید موسوی ''تعارف مرثیہ'' سے یہ خیال نقل کرتے ہیں:

''میر ضمیر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مرثیہ کو تحت لفظ منبر پر بیٹھ کر پڑھا۔''۲۵

شبلی نعمانی اپنی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' میں میر ضمیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جس شخص نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت بنایا، وہ میر ضمیرؔ، مرزا دبیر کے استاد ہیں۔انھوں نے مرثیے میں جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ رزمیہ

۲۔ سراپا

۳۔ گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے

۴۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔''۲۶

میر ضمیر سے قبل ہی اردو مرثیہ کے عناصر ترکیبی کا تعین کیا جا چکا تھا لیکن میر ضمیرؔ نے ان عناصر کو ایک متعین شکل دی اور چہرہ اور سراپا نگاری کا اضافہ کیا۔لیکن ڈاکٹر مسیح الزماں اپنی کتاب ''اردو مرثیے کی روایت'' میں لکھتے ہیں:

''مرثیے کے اجزا کا تعین ایک دن میں نہیں ہوا اور نہ یہ کسی ایک فرد کا

کارنامہ ہے اس کی تشکیل ارتقائی طور پر ہوئی ہے۔ مرزا سے ضمیر تک اردو کا
مرثیہ گو ہیئت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔''[۲۷]

مرثیہ نگاری کے اس تعمیری دور اور لکھنوی مرثیہ کے دوسرے دور کے بڑے شاعر میر خلیق کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باجود شومئی قسمت یہ رہی ہے کہ ان کے مرثیوں کا اب تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا جب کہ ان کے مرثیوں کی کل تعداد ۲۰۰ بتائی جاتی ہے۔ میر خلیق کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محاورہ بندی کے زیادہ پابند تھے اور زبان و بیان کے حوالے سے آپ ایک مثال تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے یہاں جایا کرو۔ نیر مسعود اپنی کتاب ''مرثیہ خوانی کا فن'' میں لکھتے ہیں:

''اس لئے کہ ضمیر کے یہاں رزمیہ اور بیانیہ عناصر خلیق سے زیادہ اور
خلیق کے یہاں رثائی عناصر ضمیر سے زیادہ ہوتے تھے۔''[۲۸]

میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد لکھنوی مرثیہ نگاری کا تیسرا دور مرثیہ کی تاریخ کا اہم دور ہے اور اس دور کو اردو مرثیہ کے عروج کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے دو بڑے نام میر خلیق کے بیٹے انیس اور میر ضمیر کے شاگرد دبیر ہیں جنہوں نے میر ضمیر اور خلیق کی قائم کی ہوئیں نئی راہوں پر چراغ روشن کیے۔ مسعود حسن رضوی انیس و دبیر کے وجود کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''اگر ضمیر نہ ہوتے تو نہ دبیرؔ کا وجود ہوتا اور نہ انیسؔ کا۔'' ۲۹

پرفیسر خواجہ محمد اکرام الدین انیسؔ اور دبیرؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آسمان مرثیہ میں ایک چاند ہے تو دوسرا ستارہ۔ انھوں نے اپنے فن کے تمام تر کمالات کا اظہار اسی صنف میں کیا ہے اور مرثیہ کو معراج تک پہچایا ہے۔'' ۳۰

ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں:

''انیسؔ و دبیرؔ کو مرثیے کے میدان میں وہی رتبہ حاصل ہے جو آتشؔ و ناسخؔ کو غزل کی صنف میں۔'' ۳۱

یہاں بلا جھجک ہم یہ بات کر سکتے ہیں کہ انیسؔ اور دبیرؔ کو مرثیہ گوئی کا فن وراثت میں ملا۔ اس فن کی آبیاری انہوں نے اپنے خون جگر سے کی ہے۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ کے مرثیوں کی کل تعداد کا ابھی تک حتمی سراغ نہیں مل سکا لیکن کہا جا تا ہے کہ اگر ان کے دفتر ماتم کے تمام مرثیوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ۴۰۰ سے زیادہ تعداد ہوگی۔ ان کے بعض مرثیوں کے مطلعے درج ذیل ہیں:

ع۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

ع۔ قید خانہ میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے

ع۔ جب حرم قلعہ شریں کے برابر آئے

ع۔ بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے

ع۔ ذرہ ہے، آفتاب در بوتراب کا

ع۔ ہم ہیں سفر میں اور طبیعت وطن میں ہے

دبیرؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کے مرثیوں میں صنائع و بدائع، لفظی و معنوی خوبیوں کا استعمال فیاضی سے ملتا ہے۔ بعض مرثیوں میں تو دبیر نے تمام صنعتیں ایک ساتھ نظم کر دی ہیں۔ جذبات نگاری اور شوکت الفاظ کو دبیرؔ کا امتیازی وصف قرار دیا جاتا ہے۔ سراپا نگاری اور رزم نگاری کے اعلیٰ نمونے دبیرؔ کے یہاں ملتے ہیں اور تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق دبیرؔ اردو کا وہ شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ اشعار کہے ہیں۔ انیس کو الفاظ کا بادشاہ کہا جاتا ہے ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ موجود تھا جس کا استعمال انہوں نے کھل کر کیا ہے۔

دبیرؔ کے ہم عصر انیسؔ جن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا اور وہ حسب ضرورت ان میں استعمال کرتے تھے۔ زبان صاف ستھری، مصرعے رواں رواں اور انداز بیان بیحد دلکش تھا۔ انیسؔ نے سیرت نگاری اور کردار نگاری میں بھی اہم مقام حاصل کیا ہے۔ المختصر یہ کہ انیسؔ کو اردو زبان کے پہلے اور بعد کے مرثیہ گو شعرا میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

لکھنو میں مرثیہ نگاری کا چوتھا دور نہایت اہم ہے یہ دور انیس و دبیرؔ کے بعد کا ہے اس عہد میں مرثیہ گوئی میں نہات اہم اضافے کے لئے اس دور میں تقریباً سو مرثیہ نگار تاریخ مرثیہ نگاری میں نئی راہوں کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ایک طرف میر انیسؔ

کے مرثیہ نگار ہیں جن میں ان کے تین بیٹے میر نفیس، میر رئیس اور میر سلیس ہیں دوسری جانب مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج ہیں اور مرزا دبیر کے بے شمار شاگرد ہیں ۔جنھوں نے مرثیے کو نئے انداز سے سجانے کی کوشش کی ۔اس عہد کے بعد لکھنو میں مرثیہ گوئی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے ۔اس عہد میں میر عارف دولھا صاحب عروج ،مودب۔ پیارے صاحب رشید، رفیع ،صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، قدیم لکھنوی، منے صاحب ذکی علی میاں کامل وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔اس کے علاوہ لکھنو سے الگ برصغیر ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف مرثیہ نگار مرثیہ نگاری کرنے لگے۔ ملک میں بکھرے جدید مرثیہ نگاروں کا کوئی دبستان نہیں بن سکا لیکن لکھنو میں ''بزم مرثیہ خوانی'' کا قیام جب عمل میں آیا تو اس بزم نے مرثیے کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے۔

مرثیے کی مندرجہ بالا روایت صرف کربلائی مرثیوں تک ہی محدود رکھی گئی ہے۔شخصی مرثیوں کی اپنی ایک الگ روایت ہے جو تفصیل کی متقاضی ہے۔لہذا موضوع کو طوالت نہ دیتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ اردو میں شخصی مرثیہ نگاری ایک علحیدہ مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔اس لیے اسے کسی دوسرے مقالے میں موضوع بحث بنایا جائے گا۔یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتی ہوں کہ میرے اس تحقیقی مقالے کا عنوان تقی عابدی کی تنقیدی خدمات ہے اور انھوں نے اردو مرثیے کی جو تنقید یا تحقیق کی ہے وہ کربلائی مرثیوں کے حوالے سے ہے۔اسی لیے اس ذیلی باب میں میں نے مختصراً کربلائی مرثیوں کی روایت کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔

حواشی

ا۔	ام ہانی اشرف:	اردو مرثیہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء ،ص ۳۲
۲۔	نوراللغات (حصہ چہارم)	حلقہ اشاعت لکھنو ۱۹۱۷ء، ص ۵۲۰
۳۔	ایضاً	
۴۔	خواجہ اکرام الدین ، ڈاکٹر:	اردو کی شعری اصناف، زاہدہ نوید پرنٹرس، لاہور ۲۰۱۴ء، ص ۵۹
۵۔	سنبل نگار، ڈاکٹر:	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاوس ، علی گڑھ ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۶
۶۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۴۸
۷۔	شارب ردولوی، ڈاکٹر (مرتب):	اردو مرثیہ، اردو اکادمی دہلی ،۱۹۹۱ء، ص ۱۸

۸۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنو، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۳، مشمول، دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ۱۹۸۹ء
۹۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۵۶
۱۰۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۵۴
۱۱۔	ام ہانی اشرف:	اردو مرثیہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص ۸
۱۲۔	رضوی، سفارش حسین:	اردو مرثیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۰۱۲ء، ص ۱۵
۱۳۔	ایضاً ص ۱۷	
۱۴۔	نقوی، ضمیر اختر:	اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، ۲۱ اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۴۱
۱۵۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۸۰
۱۶۔	رئیس امروہوی:	مضمون ''اعزاداری کی ابتدا اور تدریجی ترقی'' سید الاخبار، ہفتہ وار ۱۸ دسمبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۱
۱۷۔	تعارف مرثیہ:	ص ۱۸

۱۸۔	شبلی نعمانی:	موازنہ انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۴
۱۹۔	نقوی، نوالحسن:	تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۶۴
۲۰۔	خواجہ اکرام، ڈاکٹر:	اردو کی شعری اصناف، زاہدہ نوید پرنٹرس، لاہور ۲۰۱۴ء، ص ۶۵
۲۱۔	نقوی، نوالحسن:	تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱
۲۲۔	نقوی، ضمیر اختر:	اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، ۲۱ اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۴۵
۲۳۔	مسیح الزماں، ڈاکٹر:	مراثی انیس، اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۳ء، ص ۳۹
۲۴۔	ام ہانی اشرف:	اردو مرثیہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱
۲۵۔	رشید موسوی، ڈاکٹر:	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۸۴
۲۶۔	شبلی نعمانی:	موازنہ انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۶
۲۷۔	نقوی، ضمیر اختر:	اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، ۲۱ اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۸۷
۲۸۔	نیر مسعود:	مرثیہ خوانی کا فن، ذکی سنز پرنٹرز، کراچی ۲۰۰۵ء، ص ۲۲

۲۹۔	مسعود حسن رضوی:	مقدمہ شاہکار، مطبوعہ، نظامی پریس لکھنو، ۱۹۴۳ء
۳۰۔	خواجہ اکرام، ڈاکٹر:	اردو کی شعری اصناف، زاہدہ نوید پرنٹرس، لاہور ۲۰۱۴ء، ص ٦٦
۳۱۔	نقوی، ضمیر اختر:	اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، ۲۱ اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۹۱

ب۔ انیسؔ فہمی کے نئے زاویئے

جہاں تک انیسؔ فہمی کے نئے زاویوں کا تعلق ہے تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ کے کلام کو کن نئے زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ اور کن نئے گوشوں کو وا کیا ہے۔ تاکہ انیسؔ شناسی کے باب میں کچھ اضافہ ہو سکے ڈاکٹر عابدی کو اپنی اوائل عمر سے ہی میر انیسؔ کے ساتھ والہانہ محبت اور عقیدت رہی ہے اور اس کا انکشاف انھوں نے خود اپنی مشہور و معروف کتاب ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' میں کیا ہے۔ یہ ان کی محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے مراثی انیسؔ کا انتخاب کرتے ہوئے ان کے شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک شاہکار صحیفہ ترتیب دیا ہے اس کے علاوہ ''دیوان رباعیات انیس کی تحقیق تدوین اور تشریح کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جلد ہی ''سلام کلامِ انیس'' کے عنوان سے ایک نئی کتاب منظر عام پر آنے والی ہے۔ اکثر ان شخصیات پر کام کرنا جن پر کسی وجہ سے بہت کم توجہ دی گئی اور جن پر پوری طرح کام نہیں کیا گیا پر تحقیق و تدوین جیسا کارنامہ انجام دینا تقی عابدی کا خاصہ ہے لہٰذا انیسؔ شناسی کے حوالے سے ان کا کام نہایت ہی اہم اور قابل ستائش ہے۔

میر انیسؔ کا شمار ان چار عظیم شعرا میں ہوتا ہے جن میں میر تقی میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ شامل ہیں یہ وہ شاعر ہیں کہ جن کا کلام ساری دنیا میں کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ آج میر انیسؔ کے انتقال کے سوا سو سال گذرنے کے بعد بھی ان کا کلام نہایت ہی

خوش اسلوبی اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔

یہ انیسؔ کے کلام کی خصوصیات کی کشش ہی ہے کہ آج بھی یہ قاری کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے چونکہ تقی عابدی کو انیس اور ان کے کلام سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ انہوں نے میر انیسؔ کے کلام ان کی شخصیت کو الگ انداز سے دیکھنے اور کچھ مخفی گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے اگر ان کے شاہکار تجزیہ یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کی بات کریں تو اکثر محققین و ناقدین نے اس پر گراں قدر کام کیا ہے مگر تقی عابدی نے اسے اپنے انداز سے دیکھنے اور پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اول تو اس کتاب کا ظاہری حسن ہی قابل تعریف ہے جو قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ظاہری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باطنی خوبصورتی میں بھی یہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر عابدی نے اس پر بہت زیادہ محنت صرف کی ہے۔ جس کا بین ثبوت ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہے۔ تقی عابدی کا یہ اہم کارنامہ علامہ شبلی کی معرکتہ آرا کتاب ''موزانہ انیس، دبیر کے اسی سو سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ شبلی کے کلام میں جو تشنگی محسوس کی جا رہی تھی اس کتاب نے اس خلا کو پر کر دیا ہے۔ تقی عابدی نے عام روش سے ہٹ کر اس مرثیے کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے انیسؔ کے اس مرثیے ''جب قطع کی مسافت شبِ آفتاب نے'' کے الفاظ کا شمار کر کے اس میں استعمال ہوئے اردو، عربی اور فارسی الفاظ کی تعداد بتائی ہے۔ ان میں کل الفاظ کی تعداد بشمول تکرار ۹۴۹۳

بتائی اور اردو کے ۶۷۷۵ الفاظ بتاتے ہیں۔ساتھ ہی ان الفاظ کا تناسب بھی لکھا ہے۔یعنی
عربی الفاظ ۱۹ فیصد، فارسی الفاظ ۲۰ فیصد اور اردو الفاظ ۶۱ فیصد۔

اسی طرح زیرنظر مرثیے میں ۲۵ سے زیادہ جانوروں کا ذکر کیا ہے نہ صرف ذکر بلکہ ان سے مربوط خصوصیات کو بھی مضمون شعر سے ایسا ربط دیا ہے کہ قاری کو نئی معلومات سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔یہاں تک کہ چیونٹی کی بھی عجیب کیفیت بیان کی ہے۔

میں نے چونکہ مذکورہ تمام جانوروں کے نام ایک ذیلی باب میں درج کئے ہیں لہٰذا تکرار سے بچنے کے لئے میں یہاں دہرانا مناسب نہیں سمجھتی ہوں۔

انیسؔ نے مرثیہ میں تیرکمان کے جزیات کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی تعداد بھی تقی عابدی نے سترہ (۱۷) سے زیادہ بتائی ہے اور علیحدہ علیحدہ نام بھی درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ مذکورہ مرثیہ میں جنگی لوازمات کی تعداد پچاس سے زیادہ بتائی ہے اور ان کے نام بھی درج کئے گئے ہیں۔

انیسؔ کے مرثیہ میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے اصحاب کے نام کتنی بار آئے ہیں اس کا بھی شمار کر کے ان کی تعداد ۳۴۴ بتائی ہے، یہاں تک کہ ان کے دشمنان کے نام کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ نام (۷) با اس مرثیے میں نظر آتے ہیں۔

تقی عابدی نے انیسؔ کے اس مرثیے کے اشعار میں بہتر (۷۲) اشعار منتخب کیے ہیں پھر انہی منتخبہ اشعار میں سے ''نورتن انتخاب کئے'' ہیں ساتھ ہی انیسؔ کے (۳) مطبوعہ مراثی کے

ٹائٹل کا عکس مع چند بندوں کے نقل کئے ہیں تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ یہ مرثیہ کب کہاں سے اور کتنی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان پا کیزہ ہستیوں کے نام ان کا مقام اور کنیت بھی بتائی ہے اور ان کی تعداد ۳۳ بتائی ہے۔ ساتھ ہی دشمن فوج کے سرکردہ افراد کے نام بھی دیئے ہیں اور علیحدہ علیحدہ وضاحت بھی کی ہے۔ پھر ان معترضین کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جنہوں نے اس مرثیے پر اعتراض کئے تھے۔ جن میں پہلا نام عبدالغفور نساؔخ اور دوسرا نام پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے۔

مرثیے کے تجزیاتی نمونے کے حوالے سے مختلف اہل قلم کے بیانات کو نقل کر کے ساتھ ہی مرثیے کہ واقعہ منظر نگاری، سیرت نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری تشبیہ کی ندرت صنعتوں کا استعمال تجزیات وتبصرہ پر تقی عابدی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

انہوں نے انیؔس کے شاہکار مرثیے میں استعمال کی گئی کل اضافات کا شمار کیا ہے اور انکی تعداد ۵۸۷ بتائی ہے۔ جس میں اچھی اور نئی تراکیب کی کافی اچھی تعداد موجود ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے انیؔس کے شاہکار مرثیہ میں منظر نگاری واقعہ، جذبات نگاری، رزم نگاری، ڈرامہ نگاری نفسیات نگاری، تمثیل نگاری، تسلسل اور ہم آہنگی حفظ مراتب، اعلی انسانی اقدار، سماجی عناصر اور المیہ مضامین کی اہمیت اور عظمت اشعار انیؔس سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مذکورہ نکات کے حوالے سے چند مثالیں یہاں پیش کر رہی ہوں۔

میر انیؔس کی منظر نگاری کے حوالے سے تقی عابدی لکھتے ہیں۔

'' مناظر قدرت کی مصوری میں یورپ کے شاعروں خاص طور پر ورڈسورتھ کے بعد شاعروں نے جس شگفتگی اور دل کشی سے کام لیا اس کی بہترین مثال اردو ادب میں صرف انیسؔ کے مرثیوں میں نظر آتی ہے انیسؔ نے اپنے مشاہدہ سے ان مناظر کی جو منظر کشی کی ہے انکے نقش آج بھی تر و تازہ ہیں۔ وقت کے سیلاب سے یہ تصاویر دھندلی نہ ہوسکیں کیوں کہ انیسؔ اپنے قلم سے صرف ان الفاظ کو استعمال کر رہے تھے جن کے رنگ لعل و یاقوت وزمرد کی طرح ذاتی تھے''۔ا

انیسؔ کی منظر کشی کے حوالے سے چند اشعار دیکھئے:۔

؎ وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
وہ جابہ درختوں پہ تسبیح خواں طیور
ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک
ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک
پھولوں سے سر سبز شجر سرخ پوش تھے
اٹھنا وہ جھوم جھوم کر شاخوں کا باربار ''(۲)

انیسؔ کی واقعہ نگاری کے حوالے سے تقی عابدی لکھتے ہیں۔

'' حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں واقع نگاری کی بنیاد صرف مرثیہ

گوئیوں نے ڈالی ہے۔اور اس کو میر انیسؔ نے معراج کمال تک پہنچایا جس کی نظیر فارسی میں بھی ملنا مشکل ہے۔ معمولی طور پر کسی واقع کو نظم کرنا بڑی شاعری نہیں بلکہ واقع کے تمام جزئیات اور حالات کی کیفیات کو نظم کرنا صحیح شاعری ہے جس کے لئے شاعر کو نہ صرف قادر الکلام ہونا ضروری ہے بلکہ شاعر کو فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا چاہئے۔ میر انیسؔ چونکہ فطرت کے بڑے راز دار تھے اس لئے چھوٹے سے چھوٹا نکتہ ان کی نظر سے بچ نہ سکا۔''(۳)

اس حوالے سے چند اشعار دیکھئے:-

نو دس برس کے سن میں یہ جرائت یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے
اقبال کیوں کر ان کے نہ قدموں سے منہ ملے
کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے
بے شک یہ ورثہ دار جنابِ امیر ہیں
پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں(۴)

مرقع نگاری:- واقعہ نگاری ،منظر نگاری جب کمال کے درجے پر پہنچ جاتی ہے اسے مرقع نگاری کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر انیسؔ کے یہ اشعار

؎ غصے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھئے
بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھئے

سانچے میں جوڑ بن کے ڈھلنے کو دیکھئے
تھم کر کنوتنوں کے بدلنے کو دیکھئے
سارا چلم خزام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلہن کا ہے چہرہ پری کا ہے"(۵)

انیسؔ کی مرقع نگاری کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے یاں ایک گھوڑے کی تصویر سامنے نہیں آتی بلکہ گھوڑے کی ذاتی خوبیوں جیسے جرار۔ سبک رو۔ بردبار۔ خوش گو۔ خانہ زاد۔ جواد۔ دلدل نژاد۔ وفا شعار۔ ستم درع پوش وغیرہ قاری/سامعہ کے دل میں گھوڑے کے مقام ومنزلت کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ یہ وہ تمام خوبیاں ہیں جنہیں تقی عابدی نے اپنی تحقیق کے بعد سامنے لایا ہے۔

اسی طرح تمام معجزات کو معہ مثالوں کے پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقی عابدی نے ہر بند اور ہر بند کے ہر شعر کو کئی زاویوں سے پڑھا سمجھا اور تشریح کر کے کسی نہ کسی نئے پہلو کی نشاندہی بھی کی۔

ڈاکٹر عابدی نے میر انیسؔ کے شعری محاسن کو موضوع بناتے ہوئے ایک طویل فہرست بیان کی ہے۔ انیسؔ کے یادگار مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" میں جو شعری محاسن ومعنوی اور علم صنائع و بدائع کے ساتھ علم عروض کا استعمال کیا ہے غالباً اس سے مفصل کسی اور تحریر میں شائد ہی ملے گی۔ تقی عابدی نے اس ایک مرثیے میں محاورات کی تعداد

۵۹۶علم بیان کے محاسن کی تعداد ۲۵۱ ،علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد ۱۲۸۶ یعنی کل محاسن اور صنعتوں کی مجموعی تعداد ۲۱۲۹ بتائی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کو مرثیہ کا خدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کے یہاں سلاست شگفتگی، اور روانی ہے اور الفاظ و معنی کا بحر ذخار ہے۔ علم معانی و بیان علوم مرثیہ میں نہایت سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔ کیونکہ اس فن کا سورج کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں سے غروب ہو چکا ہے مگر اب خوش قسمتی سے ڈاکٹر عابدی کی بدولت مغرب میں طلوع ہونے لگا ہے۔ انہیں صنائع بدائع کے استعمال کی وجہ سے علماء ادب نے انیسؔ کو تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ خود میر انیسؔ کو بھی اپنے اس فن پر ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

ع کسی نے تیری طرح اے انیسؔ
عروس سخن کو سنوارا نہیں

تقی عابدی نے ایک ''فہرست کامل'' تیار کر کے ان نو ہزار پانچ سو سترہ (۹۵۱۷) الفاظ کو جو تکرار کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کو کھوج کر ایک فہرست تیار کر دی ہے اور ان الفاظ کو عربی، فارسی اور اردو تین زمروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں کے ان الفاظ کو جو کثرت استعمال کی وجہ سے اردو کے الفاظ ہو گئے ہیں انہیں بھی اردو کے زمرے میں رکھا ہے، ان زبانوں میں سنسکرت انگریزی، ترکی، عبرانی، سریانی، یونانی ، پرتگالی، لاطینی ،فرنچ پالی، برہمی، مالاباری اور ہسپانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تقی عابدی نے اس کام کو

جس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اسے دیکھ کران کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ صبر آزما کام تقی عابدی ہی انجام دے سکتے تھے۔ کتاب کی فہرست سے ہی اندازہ لگ جاتا ہے کہ تقی عابدی نے اس کام کودن رات کرکے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہوگا۔

تقی عابدی نے محاسن مرثیہ کوسمجھانے کی خاطر ایک علیحدہ باب رقم کیا ہے جس میں نہ صرف علم بیان اور علم بدائع کی تعریف کی ہے بلکہ مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی بھی اہم اور کامیاب کوشش کی ہے صنعت مرثیہ کے باب میں ان کا یہ کارنامہ عظیم ہے کیوں کہ اکثر لوگ محاسن کلام سے نظر بچا کے نکل جاتے ہیں۔ مگر تقی عابدی نے ایک ماہر استاد کی طرح ان محاسن کوسمجھایا ہے تا کہ ہر خاص و عام مرثیے سے استفادہ کر سکے اسے سمجھ سکے اور پڑھنے میں دقت کا سامنا نہ ہو۔ میرے خیال میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور اہم کام بھی ہے۔

کلام انیسؔ کے حوالے سے تقی عابدی کا سب سے اہم کام تجزیہ کامل یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا تجزیہ ہے جو انہوں نے منفرد انداز میں کیا ہے اور جو اپنی نظیر آپ ہے۔ مرثیے کے پورے ۱۹۷ بند ہیں۔ ہر بند کے سامنے والے صفحے پر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ اس میں استعمال شدہ تمام عربی، فارسی اور اردو کی تعداد بتاتے ہوئے اس میں استعمال ہوئی ہر صنعت کے متعلق بتایا ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقی عابدی نے مرثیے کے اسرار و رموز کو علم کلام و بیان کی روشنی میں بڑی ماہرانہ، چابک دستی اور فنی دسترس کے ساتھ آشکار کیا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور معتبر ہے۔ انہوں نے سب سے

علیحدہ تحریر کرکے انیس شناسی کے باب میں ایک اہم اضافہ بھی کیا ہے۔ایک منفرد انداز بھی اپنایا ہے۔

تقی عابدی نے عام روش سے ہٹ کر انیسؔ کا جو زندگی نامہ پیش کیا ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے، انہوں نے ہر لحاظ سے انیسؔ کا مکمل خاکہ کھینچا ہے۔اور حیاتِ انیسؔ کے عنوان کے ذیل میں ۳۳ ذیلی عنوانات ترتیب دے کر ان کی زندگی اور فن کی تصویر کشی موٴثر انداز میں کی ہے۔مختصراً یہ کہ ولادت سے وفات تک کی جملہ تفصیلات فراہم کرکے تقی عابدی انیسؔ شناسوں کی صف میں نہ صرف شامل ہوئے ہیں بلکہ اپنی جداگانہ حیثیت بھی منوادی ہے۔ ۴۸ صفحات پر مشتمل انیسؔ کے زندگی نامہ میں جتنا کچھ لکھا جا سکتا تھا۔تقی عابدی نے لکھ دیا ہے اور آئندہ کے لئے شاید ہی کوئی گنجائش باقی رہی ہوگی۔

ڈاکٹر عابدی نے انیسؔ کی رباعیات کا دیوان مرتب کر کے سب سے اہم کام جو کیا ہے وہ یہ کہ ایک تو اس کے مطالعے سے صنف رباعی کی مکمل تاریخ کا پتہ چلتا ہے دوسرے مختلف دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ رباعی ایرانی الاصل ہے۔اور اس کی اولیت کا سہرا قدیم ایران کے ترانہ کی ارتقائی صورت کے سر جاتا ہے۔اردو کے کن کن شعرا نے رباعی کہی اور کن کن شعراء کے کلام میں کتنی رباعیات درج ہیں اس کا بھی مکمل احاط کیا ہے اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ رباعیات شاہ غمگین دہلوی نے کہی ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے اور صدیوں سے یہ رائے عام ہے کہ میر انیسؔ مرثیہ کے شاعر ہیں مگر

ڈاکٹر تقی عابدی نے ''دیوان رباعیات انیسؔ'' کی تحقیق تدوین اور تشریح سے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ میر انیسؔ کی شخصیت مرثیے تک ہی محدود نہیں ہے بل کہ رباعی گو کی حیثیت سے بھی انہوں نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں ان کو پڑھنا سمجھنا اور پرکھنا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان کے مرثیوں کو۔ صرف بحیثیت مرثیہ گو ہی انھیں پڑھنا ان کی شخصیت کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔

انیسؔ کی رباعیات کے حوالے سے تقی عابدی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انیسؔ کی رباعیات کے حوالے سے ایک فہرست ترتیب دی ہے جس سے آسانی سے پتہ چلتا ہے کہ رباعیات انیسؔ کا سب سے پہلا مجموعہ اور اسی طرح باقی مجموعے کب کہاں سے اور کس نے شائع کئے اور ان میں شامل رباعیات کی تعداد کتنی ہے واضع رہے کہ ابھی تک اس حوالے سے سب سے زیادہ رباعیات ''تقی عابدی کے مرتب کردہ ''دیواب رباعیات انیسؔ'' میں شامل ہیں جن کی تعداد ۵۷۹ ہے۔ یہ دیوان ۲۰۱۲ میں شاہد پبلیکیشنز دلی سے چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے ان کی رباعیات کے تمام مضامین کو تحقیق وتنقیدی مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کے مضامین بھی بتائے ہیں ساتھ ہی ان میں استعمال ہونے والی صنعتوں اور بحروں کا مکمل تدارک بھی کیا ہے۔ میر انیسؔ کی قدر دانی پر ایک مکمل تبصرہ بھی کیا ہے جس سے انیسؔ کی رباعیات کی معنوی وفنی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ نادر اور جدید تراکیب اور اضافات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان رباعیات میں جو نعتیہ کلام ہے اس کی

بھی نشاندہی کی ہے۔ اُنہوں نے انیس کے کلام پر کئے گئے اعتراضات کا جواب بھی خوش اسلوبی سے دیا ہے۔

مختصراً یہ کہ تقی عابدی نے سب سے ہٹ کر اور جداگانہ طریقے سے میر انیسؔ کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اور مختلف زاویوں سے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے انہوں نے نئے اور سائنسی علوم کی روشنی میں میر انیسؔ کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اور فنی وشعری محاسن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا ہے۔ کافی اہم ہے۔ ایک ماہر عروض دان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس نسبت سے ان کے کلام کے ہر گوشے کا تجزیہ فنکارانہ انداز میں کیا ہے اور نئی نئی باتیں سامنے لاکر ان پر گرے پردوں کو ہٹایا ہے جن کی خصوصیات کی بنا پر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تقی عابدی ایک اعلیٰ پایۂ کے محقق ونقاد ہونے کے علاوہ ادب کے بڑے قدر شناس بھی ہیں۔

حواشی

(۱) ''تجزیہ یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' از تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۸۷)

(۲) ایضاً صفحہ نمبر ۱۹۷

(۳) ایضاً۔ صفحہ نمبر ۱۹۹

(۴) ایضاً صفحہ نمبر ۲۰۱

(۵) ایضاً

(ج) تقی عابدی کی تنقید انیس کا مجموعی جائزہ:

جب اور جہاں کہیں بھی مرثیہ کا ذکر آتا ہے تو ہمارے ذہن میں سب سے پہلے مرثیہ کے دو بلند میناروں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے یہ دونوں مرثیے کے فلک کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ دونوں عظیم مرثیہ گو ہیں مگر دونوں کا رنگ جداگانہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اردو مرثیہ میں میر انیسؔ کے کلام کو جتنا سراہا گیا مرزا دبیرؔ کے کلام پر اتنی توجہ نہیں دی گئی بقول تقی عابدی کے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ میں علامہ شبلی نے دبیرؔ کے ساتھ انصاف نہیں کیا''۔ دبیرؔ کو ان کا صحیح مقام دلانے میں تقی عابدی نے جو کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اب تک دبیرؔ پر ان کی آٹھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اس حوالے سے ایک انٹرویو کے دوران پوچھے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ یوں کہتے ہیں:

> ''مرزا دبیر اردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے
> سب سے زیادہ اشعار کہے سب سے زیادہ
> رباعیاں لکھیں سب سے زیادہ الفاظ اردو میں
> استفادہ کیے لیکن افسوس موازنہ انیسؔ و دبیرؔ میں
> علامہ شبلی نے انصاف نہ کیا دبیر کے فن حسب
> نسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کیے۔''(۱)

چوں کہ اس باب میں میر انیسؔ کے حوالے سے بات کرنا مقصود ہے تو ہم انیس کے حوالے سے تقی عابدی نے جو کام کیا ہے کا ہی جائزہ لیں گے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ کے حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے جو انیسؔ شناسی کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا اور سراہا جائے گا میر انیسؔ پر ان کی تین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں دیوان رباعیات انیس، تجزیہ یادگار انیس (جب قطع کی مسافت شب آفتاب

نے)اور سلام کلام انیس''وغیرہ شامل ہیں مگر اس باب میں ان کی پہلی اردو کتابوں کا مجموعی جائزہ پیش کرنے کی سعی کی جارہی ہے

دیوان رباعیات انیس (تحقیق تدوین اور تشریح):

اس دیوان کی ابتدامیر انیس کی رنگین تصویر سے ہوتی ہے دوسرے صفحے پر میر انیس مرحوم کی خواب گاہ کی رنگین تصویر ہے جس کے نیچے میر انیس کا ایک شعر درج کیا گیا ہے جو یوں ہے:

؎ خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے
(انیسؔ)

اگلے چار صفحات پر میر انیسؔ کی عکسی تحریریں محیط ہیں جو تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں پانچویں صفحے پر میر انیسؔ کی رباعی درج ہے جو انہوں نے مرزا اسد اللہ خان کی وفات پر کہی تھی۔

ڈاکٹر عابدی نے اپنی اس کتاب ''دیوان رباعیات'' کو انیسات کے ماہر پروفیسر سید نیر مسعود رضوی کے نام منسوب کیا ہے اور علامہ اقبال کا ایک شعر بھی درج کیا ہے جو انتساب کے ضمن میں بالکل صادق آتا ہے۔

؎ شراب روح پرور ہے محنت نوح انسانی کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا

(اقبالؔ)

''تقی عابدی نے رو میں ہے رخش عمر'' کے عنوان سے اپنا زندگی نامہ تحریر کیا ہے۔ ساتھ میں اپنی تحقیقی وتنقیدی تصنیفات وتالیفات کو بھی پیش کیا ہے جن سے ان کی زندگی اور ادبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی ہے تقی عابدی نے حیات فن اور شخصیت میر انیسؔ کے عنوان سے میر انیسؔ کا زندگی نامہ پیش کیا ہے جو ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے جس سے میر ببر علی انیس کی ادبی خانگی سماجی اور معاشرتی زندگی وصورت حال کا پتہ چلتا ہے، کسی بھی انسان کی شخصیت کو ابھارنے میں اس کا زندگی نامہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انیسؔ کی شخصیت بھی ان کی زندگی کے اہم واقعات سے نکھرتی ہے ان ہی واقعات وحادثات کو تقی عابدی نے

کچھ اس انداز سے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی زندگی ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔اسی انسائیکلوپیڈیا کو تقی عابدی نے جس فنی مہارت سے پیش کیا ہے اس سے ان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تقی عابدی انیسؔ کے پورے دور پرنظر رکھے ہوے ہیں یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کی شخصیت اور فن کو موضوع بحث بنا کر انھوں نے بعض اہم نکات کو پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق اردو شعر وادب اور تذکروں میں خدائے سخن کا عنوان دو عظیم شاعروں کے لیے استعمال ہوا ہے ایک میر تقی میرؔ جن کا میدان غزل تھا اور دوسرے میر انیسؔ جو ظاہر ہے کہ مرثیے کے حوالے سے سرفہرست آتے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کا خاندان بھی مدح آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار تھا اسی لیے انھوں نے فخریہ انداز میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

؎ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

انیس خاندانی شاعر تھے ان کے خاندان میں آٹھ مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں اور اس خاندان نے صدیوں تک شاعری کی خدمت بھی کی ہے اور پھر اس خاندان کی زبان اتنی معتبر و مستند تھی کہ شیخ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھی کہ بھئی زبان سیکھنی ہو تو میر خلیق کے یہاں جایا کرو ان کے جد اعلی میر امامی موسوی ہروی حضرت امام موسی کی نسل سے تھے میر امامی کے صاحب زادے میر عزیز اور ان کے صاحب زادے میر ہدایت اللہ کے صاحب

زادے میر غلام حسین ضاحکؔ فارسی اور اردو کے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔

متذکرہ بالا تمام شخصیات کا تفصیلی ذکر تقی عابدی نے فارسی اور اردو اصناف کے ضمن میں اس کتاب میں کیا ہے جس سے انیسؔ اور ان کے خاندان کی ادبی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان تمام شخصیات کے شعری مجموعوں پر بھی تفصیل گفتگو کی ہے۔

میر انیسؔ کی ولادت کے حوالے سے کافی اختلاف پایا جاتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں تقی عابدی نے شبلی نعمانی، مسعود حسن ادیب نیر مسعود اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی بتائی ہوتی تاریخ پیدائش کو ہی ترجیح دی ہے جو کہ 1218 ہجری ہے اس کے علاوہ میر انیسؔ کی زندگی کے دیگر پہلووں پر بھی تفصیلی روشنی ہے مثال کے طور پر میر انیسؔ کا حلیہ وضع اور لباس فنون سپہ گری پابندی اوقات اخلاق و کردار وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، تقی عابدی نے انیس کے زندگی نامے میں انتخاب بحر، مرثیوں کے مطلع، نظام الاوقات، شعراء کی قدر دانی، تقلید طرز مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ ممبر پر نشست، خطبہ پڑھنے کا انداز، پہلی مجلس، مجلس چہلم، اہلیہ میر ضمیر، مجالس عظیم آباد میر انیس حیدر آباد میں، آخری مجلس بیماری کے ذیل میں، میر انیسؔ کی زندگی کے تمام پہلووں پر مدلل و مفصل وتنقیدی بحث کی ہے میر انیسؔ کی وفات 29 شوال 1291ھ مطابق 10 دسمبر 1874 میں جمعہ کی شب ہوئی اور ان کی تدفین ان کے ذاتی باغ (جو سبزی منڈی میں واقع ہے) میں ہوئی، اس مناسبت سے انھوں نے کیا خوب شعر کہا ہے۔

پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیسؔ

اب دیکھیے لحد کی رات کیوں کر گزرے

تقی عابدی لکھتے ہیں کہ مرزا دبیرؔ نے پرنم آنکھوں سے میر باقر سودا کے امام باڑہ کی مجلس میں یہ شعر پڑھا پورے شعر سے ۱۸۷۴ء نکلتے ہیں اور مصرع ثانی سے ۱۲۹۱ھ برآمد ہوتے ہیں اس کی تفصیل تقی عابدی نے کتاب میں پیش کردی ہے شعر یوں ہے:

آسمان بے کامل سدرہ بے روح الامین

طور سینا بے کلیم اللہ ومنبر بے انیسؔ

تقی عابدی نے میر انیسؔ کے کچھ کلام کے تلف ہو جانے پر دکھ کا اظہار کیا ہے کیوں کہ ان کا کلام کسی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا اور خاندان کے کسی فرد نے بھی اسے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی امجد علی اشہری نے حیات انیسؔ میں انیسؔ کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں بتائی ہے مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں انیسؔ کے مرثیوں کی تعداد دس ہزار بتاتے ہیں امیر احمد علوی یادگار انیسؔ میں مرثیوں کی تعداد لگ بھگ چودہ سو بتاتے ہیں شاد عظیم آبادی فکر بلیغ میں لکھتے ہیں کہ میر انیسؔ نے ہزار سے زیادہ مرثیے نظم کیے اسی قدر یا اس سے کچھ کم سلام ورباعیات پھر مرثیہ بھی زیادہ تر دو دو سوا کثر تین تین سو بند۔

رباعیات انیسؔ کا اجمالی تذکرہ اور تجزیہ کے عنوان سے تقی عابدی نے بہت ہی اہم تجزیہ کیا ہے جس کے ابتدا میں انھوں نے رباعیات کی ابتدا اور ارتقاء کے حوالے سے ایک علمی

تحریر لکھی ہے جسے یہاں مختصر طور پر پیش کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ رباعی کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر عابدی کی یہ تحریر کافی اہم ہے رباعی دراصل ایرانیوں کی ایجاد ہے اس پر تقی عابدی نے محققین کی آراء کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رباعی ایرانی لاصل صنف ہے لہذا اس تعلق سے چند دانشوران ادب کے قول کو نقل کیا جارہا ہے:

''ڈاکٹر پرویز نائل نے اپنی شاہکار تصنیف تحقیق انتقادی اورعروض فارسی میں لکھتے ہیں کہ'' اصل

این وزن فارسی است درعرب چنین وزنی بنودہ عرب ہا آن راازایرانیاں آموختہ اند''۲

(ترجمہ: رباعی کا اصل وزن فارسی ہے اورعربی میں ایساوزن نہ تھا عربوں نے اسے ایرانیوں سے سیکھا ہے)

تاریخ ادبیات فارسی کی مستند المعجم میں بن رازی لکھتے ہیں کہ'' جوز جافات وزن رباعی میں موجود ہیں ان کا عربی اشعار میں وجود نہ تھا'':۔

''زحاضی کہ دریں وزن (رباعی) مستعمل است دراشعار نہ بودہ است''۳۔

اوج لکھنوی نے مقیاس الاشعار میں لکھا ہے:

''اور باعی کا وزن پہلے کے عربی شاعری میں نہ تھا''۴

حدائق البلاغت کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

''رباعی راشعرائے عجم اختراع نمودہ اند''۵

مولوی علی حیدر طباطبائی نے ''تلخیص عروض وقافیہ'' میں لکھا ہے کہ:

''رباعی اصل میں فارسی والوں کا نکالا ہوا ایک وزن ہے''۔٦

پروفیسر محمد شیرانی نے تنقید شعر العجم میں لکھا ہے:

'اصناف شاعری میں رباعی ایرانیوں کی ایجاد تسلیم کی جاتی ہے''۔٧

نجم الغنی بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں:

''عرب میں رباعی کا دستور نہ تھا یہ شعرائے عجم نے بحر ہزج سے نکالی ہے''۔٨

اسی طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اردو رباعی میں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رباعیات انیس میں علی جواد زیدی نے اور درجنوں دیگر ارباب عروض وتنقید نے رباعی کو ایرانیوں کی ہی ایجاد تسلیم کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے رباعی کو عربی نثر ادب بنانے کی کوشش کی ہے چناں چہ وہ اپنی تصنیف خیام میں عوضی کی تصنیف لباب الالباب جلد دوم سے حنظلہ بادغی کی دوبیتی لکھ کر اسے قدیم ترین رباعی کہہ کر رباعی کی ایجاد کو ادب کی دین اور طاہر یہ خاندان کی پیدائش بتاتے ہیں لیکن تقی عابدی اس تعلق سے یوں لکھتے ہیں:

''اگر ہم مولانا ندوی کے پیش کردہ چار مصرعوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ رباعی کے چوبیس میں نہیں اس لیے یہ پہلی رباعی نہیں ہوسکتی۔

یارم پسند اگرچہ برآتش ہی فگند

از بھر چشم تاسز سرحرد راگذسند

اوراسپند وآتش تاید ہمی بکار

باروی ہمچو آتش وباخال چون سپید''۹؎

ان تمام تحقیقی دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے تقی عابدی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رباعی ایرانی الاصل ہے اس لیے عربی الاصل ہونے کی دلیل درست نہیں ہے انھوں نے فارسی رباعی کی اولیت کا سہرا قدیم ایران کے ترانے کی ارتقائی صورت کو قرار دیا ہے اس کے بعد فارسی کے اولین رباعی گو شعراء کا تذکرہ اور اشعار بھی درج کیے ہیں۔

رباعی کے فن پر بات کرتے ہوئے تقی عابدی یوں لکھتے ہیں:

''عام رباعی میں اگر چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو اسے غیر خصی کہتے ہیں یہ مستحسن ہے لیکن اس کا رواج قدیم تھا اور آج کل یہ عمل متروک ہے جب تیسرے مصرعے میں قافیہ نہ ہو تو اسے خصی کہتے جو رباعی کی مقبول ترین قسم ہے اگر رباعی کے ہر مصرعے کے ساتھ ایک ایک فقرہ رباعی کے وزن کا ملحق کردیں تو اسے رباعی متضاد کہتے ہیں''۱۰؎

رباعی بحر ہزج میں کہی جاتی ہے ہزج لغت میں اچھی آواز اور گانے کی آواز کو کہتے ہیں بحر ہزج مفاعلین کی چار بار تکرار سے پیدا ہوتی ہے روضیوں نے بحر ہزج سالم سے دس ارکان نکالے اور رباعی کے لیے مخصوص کردیے ہیں ان میں ایک سالم ہے اور باقی نو زحافات کے ساتھ آتے ہیں رباعی کے ہر مصرعے میں تقی عابدی نے ابن قیس کے ذریعے پیش کیے گئے چوبیس اوزان اور دو شجرے کو احزاب اور اخرام کی شکل میں پیش کیا ہے جس

سے پتہ چلتا ہے کہ اخرام کے تمام اوزان مفعول سے اور اخرام کے تمام اوزان مفعولن سے شروع ہوتے ہیں تقی عابدی نے اس کتاب میں رباعی گوشعراء اور رباعی کے ارتقاء کے علاوہ فارسی رباعی کی ابتدااور ارتقاء پر مختلف علمائے ادب وکتب کے ذریعے تفصیلی گفتگو کی ہے ساتھ ہی اردو کے رباعی گوشعراء اور اردو میں رباعی کے ارتقاء کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی ہے جس کا نچوڑ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

اردو کا پہلا رباعی گوشاعر اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کوتسلیم کیا جاتا ہے جن کے دیوان میں انتالیس رباعیات شامل ہیں دوسرا رباعی گوشاعر ملاوجہی ہے جس کی دو رباعیات ملتی ہیں اس کے بعد سراج اورنگ آبادی میرتقی میرؔ مرزامحمد رفیع سوداؔ، میرحسنؔ ،میر عبدالحی تاباںؔ، جعفر علی حسرتؔ، دہلوی نظیرؔ اکبرآبادی ، مصحفیؔ ،سعادت یارخان رنگینؔ رباعیات کے باب میں بہت اہم نام ہیں ان کے علاوہ بھی ایسے کئی شاعر ہیں جن کے کلام میں رباعیات بھری پڑی ہیں واضح رہے کہ تقی عابدی نے اردو میں مذکورہ تمام شعراء کی ایک ایک رباعی بطور مثال درج کی ہے جن سے براہ راست استفادہ کیا جاسکتا ہے جن جن رباعی گوشعراء کا بیان اوپر کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ رباعیات شاہ غمگین دہلوی نے تخلیق کی ہیں ان کی رباعیات سے متعلق تقی عابدی نے لکھا ہے کہ:

''اردو میں سب سے زیادہ رباعیات شاہ غمگین دہلوی متوفی ۱۲۶۸ ہجری نے لکھی اگرچہ شاہ غمگینؔ نے ان رباعیات کو ظاہر نہیں کیا تھا اور مرزا غالبؔ سے بھی ایک خط میں ان رباعیات کو چھپا رکھنے کا

وعدہ لیا تھا لیکن بہر حال وہ مجموعہ رباعیات دریافت ہوا چناں چہ مکاشفات الاسرار جو رباعیات کا مجموعہ ہے اس میں اٹھارہ سو رباعیات ہیں اس کے علاوہ تقریباً سو رباعیات ان کے غزلوں کے مجموعے" مخزن الاسرار" میں موجود ہیں چناں چہ شاہ غمگین نے اردو میں سب سے زیادہ یعنی ۱۹۰۰ رباعیاں لکھیں ہیں جن میں متصوفانہ خمیریہ عشقیہ اور اخلاقی مضامین نظم ہوئے ہیں"۔۱۱

میر انیسؔ کی رباعیات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں کہ میر انیسؔ کے کلام کی تاثیر ایسی ہے کہ ان کی چند رباعیات کے بعض شعر اور مصرعے ضرب المثل یا مقولوں کی شکل میں مشہور ہوئے جن کو تقی عابدی نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے مثال کے طور پر یہ چند مصرعے دیکھیے !

ع۔کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

ع۔جو ظرف خالی ہے آپ صدا دیتا ہے

ع۔جس طرح چراغ آگے تابیناک

ع۔نادان ہے جو آپ کو دانا سمجھے

ع۔اس ہاتھ کو اس ہاتھ کا محتاج نہ کر

ع۔ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

زیرِ مطالعہ کتاب میں تقی عابدی نے انیسؔ کی رباعیات کے حوالے سے شکوہ کیا ہے کہ انھوں نے جتنی توجہ مرثیے پر صرف کی اتنا وقت رباعیات پر صرف نہیں کیا یہاں تک کہ کئی

رباعیات تو مجلس اور محافل میں فی البدیہ کی تھیں لیکن میر انیسؔ کی پختہ عمر کی رباعیوں میں اس قدر سلاست شگفتگی کمال اور اخلاقی اقدار ہیں کہ وہ ضرب المثل بن گئی ہیں ساتھ ہی میر انیسؔ اور مرزا دبیر کی ان رباعیات کو پیش کیا ہے جو متحد المضمون ہیں ڈاکٹر عابدی لکھتے ہیں:

''میر انیسؔ اور مرزا دبیؔر کے مراثی سلام اور رباعیات میں ایسے مقام بھی نظر شمار کیے جاتے ہیں جو بلاارادہ تو اردو کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں یا ان کو ایک دوسرے کا جواب الجواب کہا جاسکتا ہے''(۱۲)

ساتھ ہی ان نگارشات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان دونوں شاعروں کی رباعیات متحد المضمون ہونے کی وجہ سے کچھ مرتبین کو دھوکا ہوا؛ کیوں دونوں اساتذہ نے ایک ہی مضمون پر رباعیات کہی تھی ڈاکٹر عابدی لکھتے ہیں:

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میر انیس اور مرزا دبیر کا کلام پیش کر کے یہ بتایا جائے کہ یہ دونوں عظیم شاعر آپ اپنی مثال ہیں سچ تو یہ ہے کہ میر انیسؔ کے کلام میں دبیؔر کے کلام کی چھاپ نہیں اس لیے ہمیں دبیر کے کلام کے مطالعے کی سخت ضرورت ہے انیسؔ اور دبیؔر کے سلاموں اور مرثیوں میں بھی مضامین کی تکرار نظر آتی ہے مثال کے طور پر چند اشعار یہاں پیش کیے جارہے ہیں جو تقی عابدی نے تحریر کیے ہیں:

میر انیسؔ:

''وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں ہیں وہ تاج

جواوج پہ تھے زیرزمین آج ہیں وہ

قرآن لکھ لکھ کے واقف جوکرتے تھے
اک سورہ الحمد کے محتاج ہیں وہ

مرزا دبیرؔ:

دنیا کا عجب کارخانہ دیکھا
کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پر چتر زریں
تربت پہ انکی شامیانہ دیکھا"[۱۳۱]

اس طرح تقی عابدی نے ۱۱۶۷ اشعار اتحاد مضامین کے پیش کیے ہیں جس سے ان دونوں بزرگوں کی رباعیات میں شارحین کو یا مولفین کو غلط فہمی ہو جاتی ہے میر انیسؔ کی کتنی رباعیات تھیں اور کتنی ضائع ہوگئیں یا دوسروں کے نام منسوب ہوگئیں اس کی تعداد معلوم کرنا آج کے محققین کے لیے ناممکن تھا لیکن تقی عابدی نے زیر مطالعہ دیوان میں ۵۷۹ رباعیات جمع کی ہیں تعداد کے لحاظ سے یہ پہلا مجموعہ رباعیات ہے جس میں سب سے زیادہ رباعیات انیس موجود ہیں۔

تقی عابدی نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ علی جواد زیدی نے رباعیات انیس میں اگر چہ رباعیات کی تعداد ۵۸۳ بتائی ہے لیکن اس میں بعض قطعات اور بعض رباعیاں دبیرؔ اور مونسؔ سے منسوب ہیں تقی عابدی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رباعیات انیسؔ کے

سن طباعت کو پیش نظر رکھ کر مجموعوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جس سے رباعیات انیس کی تعداد کا صحیح اندازہ ہوتا ہے فہرست یوں ہے:۔

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	سن طباعت	مطبع	تعدادا
۱	مراثی انیسؔ (چھ جلدیں)		۱۸۸۵	نولکشور لکھنو	۴سو رباعیات
۲	مجموعہ رباعیات	سید علی حسین	۱۹۰۱	یوسفی پریس دہلی	
۳	رباعیات انیسؔ	سید محمد حسین بلگرامی	۱۹۰۹	لکھنو	۱۴۵
۴	انیسؔ الاخلاق	سید محمد عباس	۱۹۹۳	لکھنو	۹۵ رباعیات
۵	رباعیات انیسؔ	سید محمد عباس	۱۹۴۷	لکھنو	۵۱۴ رباعیات
۶	مراثی انیسؔ	....	۱۹۲۴	نظامی پریس بدایوں	۹۸ رباعیات
۷	رباعیات انیسؔ	عالم حسین		نظامی پریس لکھنو	۱۹۲ رباعیات
۸	مراثی انیسؔ	عمر فیضی			
۹	مراثی انیسؔ	عمر فیضی	۱۹۵۸	لاہور	۲۸۲ رباعیات
۱۰	مراثی انیسؔ	عمر فیضی	۱۹۶۱	بکر لینڈ کراچی	۳۶ رباعیات
۱۱	مراثی انیسؔ	عمر فیضی	۱۹۶۷	غلام علی لاہور	۱۱۳ رباعیات

۱۲	رباعیات انیسؔ	علی جوادزیدی	۱۹۸۴	سپر پرنٹر دہلی	۵۷۸رباعیات
۱۳	دیوان رباعیات انیسؔ	سیدتقی عابدی	۲۰۱۲	شاہد پبلی کیشنز دلی	۵۷۹ رباعیات

انیس کی ان کتابوں اور مجموعوں کے علاوہ بھی ان کی رباعیات مختلف رسالوں ان کے نمبروں اور مضامین میں کم وبیش شائع ہوتی رہی ہیں تقسیم ہند سے قبل انیسؔ کی رباعیات اسکولوں اور کالجوں کے اردو نصاب میں شامل تھیں لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ نصاب مرتب کرنے والوں نے رباعیات انیسؔ سے اجتناب کر کے اردو ادب وتہذیب پر ظلم کیا ہے اور شعریت پر مجرمانہ رویہ روا رکھا ہے جیسا کہ مذکورہ فہرست میں تقی عابدی نے رقم کیا ہے کہ سید محمد عباس لکھنوی نے میر انیسؔ کی رباعیات کا پہلا جامع مجموعہ مجموعہ رباعیات میر انیسؔ کے نام سے اگست ۱۹۴۷میں شائع کیا جس میں ۵۱۴رباعیات موجود ہیں سید محمد عباس نے انیسؔ کی رباعیات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کو خانوں میں جگہ دی ہے۔

مذہبی رباعیات جن میں حمد، مناجات، نعت ،رسائی اور اعتقادی مضامین شامل ہیں اخلاقی رباعیات جن میں وعظ وپند اخلاق حسنہ کی ترغیب اوراعمال بد سے اجتناب کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ذاتی رباعیوں میں میر انیس کے حسب نسب فن شخصیت وغیرہ پر مضامین ملتے ہیں۔

تقی عابدی نے میر انیسؔ کے نواسے میر عارف کے فرزند سید یوسف حسین کے قلمی

خاندانی مستند نسخوں سے مطبوعہ رباعیات میں جو اغلاط نکالیں ہیں ان کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور اس دیوان میں استفادہ بھی کیا ہے خود یوسف حسین نے بھی لکھا ہے کہ:

''مراثی انیس مطبوعہ نولکشور پریس کی ایک جلد اول میں ۸۱ رباعیات ہیں جن میں سے ۱۹ رباعیاں غلط ہیں''(۱۴)

تقی عابدی نے غلط مصرعوں کے ساتھ میں صحیح مصرعوں کی نشاندہی بھی کی ہے مثال کے طور پر یہ دو مصرعے جو تقی عابدی نے تحریر کیے ہیں ملاحظہ کریں:

غلط مصرعے	صحیح اور مستند مصرعے
ع۔ بے زادِ سفر کوچ کی تیاری	ع۔ لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
ع۔ یہ قبر کی منزل بھی عجب بھاری ہے	ع۔ یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے
ع۔ چل کر گلزار کربلا میں ڈھونڈیں	ع۔ صاحب گلزار کربلا میں ڈھونڈیں

اس دیوان میں تقی عابدی نے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ انیسؔ کی چند رباعیوں کے دوسرے زبانوں میں ترجمے بھی ہوے ہیں فارسی میں ڈاکٹر امیر عباس حیدری استاد کیمرج یونیورسیٹی انگریزی میں امیر امام حر، شاکر علی جعفری اور غلام عباس نے عمدہ تراجم کیے ہیں تقی عابدی نے ان تراجم کے نمونے بھی اس کتاب میں شامل کیے ہیں، یہاں پر بطور نمونہ ایک بند کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

اردو:

ماں باپ سے بھی سوا شفقت تیری
افزوں ہے تیرے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کرکے دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

انگریزی:

:the love (for humanity)exceeds parental love they beneficence exceeds thy wrath grant me paradise burn me in hell(whatever the thy will)for the former would be mercy the later justice,,,,(imam hur)

استاد حیدری:

فارسی	اردو
گرخوی تو نیک است ترا باکی نیست	ہموار ہے گرتو کچھ تجھے باک نہیں
سرکش اگر بہراز اادرا کی نیست	سرکش ہے اگر تو عقل وادراک
جزغم بنودنصیب آتشخو را	پاسانہیں تندخوکدورت کے سوا
دردامن گرباد جز خاکی میت	دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

انیس کی رباعیات پرتبصرہ کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

''انیس نے بڑی خوب صورت حمد یہ رباعیات کہہ کر معرفت کے دفتر

کھول دیے ہیں انھیں حمد یہ رباعیوں میں تصوف کی جھلک مل جاتی انداز
بندگی کی بے بسی کوتاہی گاہے گاہے حیرانی گاہے پشیمانی غرض گونا گوں
عجز وانکساری کے ساتھ ساتھ شان کریمی اور عظمت ذوالجلال کا اقرار مصرعوں
سے ہوتا ہے۔" (۱۵)

اگر چہ میر انیسؔ بحیثیت مرثیہ گو شاعر معروف ومقبول ہیں مگر انھوں نے سلام اور بڑی تعداد میں رباعیات بھی کہی ہیں جس طرح وہ اول درجے کے مرثیہ نگار ہیں اسی طرح اول درجے کے رباعی گو بھی ہیں۔

انیسؔ کی رباعیات میں تصوف کے مضامین مثلاً فلسفہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشھود اور واقعہ کربلا دنیا کی بے ثباتی اور درجنوں اخلاقی مضامین ملتے ہیں ڈاکٹر عابدی نے ان تمام کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے انکی انیسؔ کی رباعیات پر مکمل دسترس کا پتہ چلتا ہے میر انیسؔ نے درجنوں اخلاقی رباعیات میں عارضی حیات اور مستقل حمایت کی تاکید کی ہے کہ یہ جو زندگی ہے یہ آنی فانی ہے اور دنیا ایک مسافر خانہ ہے جہاں سے سفر کرنا ہے اور یہ بات کہنے میں بھی کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا کی بے ثباتی پر جتنی عمدہ رباعیاں انیسؔ کے دیوان میں ملیں گی اتنی شاید ہی کسی دوسرے اردو شاعر کے دیوان میں موجود ہیں ایک رباعی کو بطور نمونہ یہاں پیش کر رہی ہوں:

؎ گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
پیانہ عمر اک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کرلے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

تقی عابدی نے میرانیس کی رباعیات کا فنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی رباعیات میں استعمال ہونے والی صنعتوں اور بحروں کا مکمل تدارک کیا ہے نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش کررہی ہوں جس سے ان کی دیدہ ریزی اور لگن کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک ایک لفظ کوانھوں نے باریک بینی سے پڑھا اور تجزیہ کیا ہے:۔

''ا۔تشبیہ سے نکالا کیا عمدہ مضمون دیکھیے!

عریاں ہوں لباس عاریت سے جوں ''سرو''
ے خاک نشینی میں بلندی مجھ کو

اس شعر میں ''سرو'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔تلمیحات سے تراشا گیا مضمون دیکھیے!

''جم'' کا ہے نہ جام اور نہ ''دارا'' کا شکوہ
احوال سکندر کا تو آئینہ ہے

اسی طرح ایک اور شعر دیکھیے!

انداز کلام حق سمجھتا ہے کلیم
موسیٰ سے ''رموز لن ترانی'' پوچھو!''١٦

تقی عابدی نے میر انیس کے کلام کی قدر دانی پر بھی ایک طویل اور مستند تبصرہ کیا ہے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

''یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے عظیم ہنر مندوں اور تخلیق کاروں کو اپنے دور کے لوگوں سے شکایتیں رہیں کہ انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے چناں چہ بعضوں نے خود کو عندلیب گلشن ناآفریدہ کہا تو کسی نے اپنے آپ کو شاعر فردا اور کوئی ہمسفر ان کہن سے مایوس اور نا امید رہا میر انیسؔ نے بھی چند اشعار میں اس ناقدری کی شکایت کی ہے سچ یہ بھی ہے کہ چند سخن شناس اور اہل کمال جو میر انیسؔ کے ہم عصر تھے وہ انیسؔ کے کلام کے ایسے قدر دان تھے کہ آج تک کوئی ان کا ہم پلہ پیدا نہ ہو سکا یوں تو ہر دور میں انیسؔ کے کلام پر نقد تبصرہ ہوتا رہا لیکن اس تنقید کی رسائی جو محدود تھی جو ناقدین کے ذوق سخن اور سخن شناسی پر محیط تھی۔'' (١٧)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ناقدری جیسے المیے سے انیسؔ شناسی بھی دوچار رہی ہے۔ میر انیسؔ کو صرف مرثیے کا شاعر کہہ کر ان کی باقی شاعری پر زیادہ دھیان نہ دیے جانے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

''اردوادب کا کوئی شاعر محاورہ بندی میں میر انیسؔ کا مقابلہ نہیں کرسکتا میر انیسؔ کے مرثیے سلام اور رباعیات صحیح محاوروں سے بھرے پڑے ہیں کئی جدید محاورے ایسے ہیں جنھیں شاعروں نے ہاتھ بھی نہ لگائے تھے حیف کہ میر انیسؔ کو مرثیہ کا شاعر کہہ کر ان کی شاعری سے منہ موڑ لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب کا دامن ان جواہرات سے مملو ہونے کے باوجود تہی دامن رہا''۱۸

تقی عابدی کی اکثر یہ کوشش رہی ہے کہ ہر شاعر کو اس کا جائزہ مقام ومرتبہ دیا جائے ان کے کلام کو نظر اندازی جیسے المیے سے بچایا جائے اور ان کو ان کا مناسب مقام دلانے کے لیے منصفانہ رویہ اختیار کیا جائے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اکثر اُن شعراء پر قلم اٹھایا ہے جن پر کام یا تو نسبتاً کم یا سرے سے ہوا ہی نہیں ہے وہ اکثر کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور نکال لیتے ہیں جو اکثر دوسروں سے اوجھل رہ گئی ہو یہی ایک عمدہ تحقیق ہوتی ہے جس پر تقی عابدی کھرے اترتے ہیں۔ یہی ان کی انفرادیت بھی ہے میر انیسؔ کی قدر دانی کے حوالے سے کیے گئے اس تبصرے سے انیس کی رعبات کی معنوی وفنی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔

انیس نے اپنی رباعیات میں محاوروں کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے جس کا نمونہ زیر مطالعہ دیوان میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ساتھ ہی انیسؔ کی نادر اور جدید ترا کیب اور اضافات الفاظ کا ذکر بھی موجود ہے یہاں تک کہ انیسؔ کے نعتیہ کلام پر بھی اس دیوان میں

بحث کی گئی ہے۔

خدائے سخن میر انیسؔ کے کلام پر کافی اعتراضات بھی ہوئے ہیں جن کے جوابات تقی عابدی نے اپنے تحقیقی نقطۂ نظر سے کماحقہ دیا ہے جس سے معترضین انیس کی غلط فہمیوں کاازالہ ہوتا ہے۔

''میر انیس مشاہیر شعرادب کی نظر میں'' کے عنوان سے تقی عابدی نے مرزا غالبؔ، شیخ ناسخ، خواجہ آتشؔ، مرزادبیرؔ، محمد حسین آزاد، مفتی میر عباس لکھنوی، الطاف حسین حالیؔ، شیخ عبدالقادر، نوبت رائے، مجاز دہلوی، شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، امجد اشہری، احسن لکھنوی، حامد علی خان بیرسٹر لکھنوی، امداد امام اثر ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر گراہم بیلی۔ نظم طباطبائی، عبدالحی ندوی، پنڈت دندر نارائن مشران، برج نارائن چکبست ذکاءاللہ امیر احمد علوی، عبدالحلیم شرر سرتیج بہادر سپرو، محمود اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، پرفیسر مسعود حسن ادیب، جعفرعلی خان، ابوالکلام آزاد، پروفیسر احتشام حسین، موالا ناعبدالسلام ندوی، ڈاکٹر اعجاز حسین پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری، شاعر اہل بیت نجم آفندی، پروفیسر ایس جی عباس صالحہ عابد حسین، گوپی چند نارنگ، شبیرالحسن، رام بابو سکینہ، سفارش حسین رضوی، نسیم امروہوی سردار جعفری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ؛اور کوثر نیازی وغیرہ کے علاہ دیگر ادباء ناقدین کے تاثرات کواس دیوان میں جگہ دی ہے جس کا مقصد میر انیسؔ کی شخصیت اور شاعری کی ہمہ جہتی کو پیش کرنا ہے.

ماحصل یہ کہ میر انیس کی حمدیہ رباعیات کی تعداد اس دیوان میں ۱۳۴ اور نعتیہ رباعیات کی تعداد ۱۸ اور منقبتی رباعیات کی تعداد ۱۵ اور اخلاقی رباعیات کی تعداد ۱۵۴ اور ذاتی رباعیات کی تعداد ۸۳ جبکہ سماجی رباعیات کی تعداد ۹۸ ہے ان تمام رباعیات کا فکری وفنی تجزیہ تقی عابدی نے اس دیوان میں بہت ہی جامع اور مفصل طور پر بیان کیا ہے ۔ جو ان کی تحقیقانہ صلاحیتوں کو بھی اُجاگر کرتا ہے

حواشی

(۱) ماہنامہ شاعر ممبئی اکتوبر 2015 شمارہ 86 جلد 59 صفحہ نمبر 16

(۲) بحوالہ دیوان رباعیات انیسؔ 2012 سید تقی عابدی صفحہ نمبر 76

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵)) ایضا صفحہ نمبر ۷۷

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً صفحہ نمبر ۷۸

(۱۰) ایضاً صفحہ نمبر ۸۰

(۱۱) ایضاً صفحہ نمبر ۸۹

(۱۲) ایضاً صفحہ نمبر ۹۴

(۱۳)ایضاً صفحہ نمبر ۹۵

(۱۴)بحوالہ دیوان رباعیات انیسؔ ۲۰۱۲ سید تقی عابدی ۲۰۱۲ صفحہ نمبر ۱۰۳

(۱۵)ایضاً صفحہ نمبر ۱۰۹

(۱۶)ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۷

(۱۷)ایضاً صفحہ نمبر ۱۵۲

(۱۸)ایضاً صفحہ نمبر ۴

۲:-"تجزیہ یادگارِ انیسؔ"

("جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" ترتیب تحقیق وتنقید)

صنف مرثیہ کے ساتھ تقی عابدی کو قلبی لگاؤ رہا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب واقعہ کربلا اور اہل بیت سے محبت ہے۔ مگر تقی عابدی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں میں شمار نہیں ہوتے جو مرثیہ کانوں سے سن کر آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔ بلکہ تقی عابدی نے مرثیوں کو سُنا پڑھا اور انھیں مظلوم و بے بس حالات سے لڑنے اور ظالم کے سامنے کبھی سر نہ جھکانے کا پیغام دیا۔ اسی لئے مرثیوں پر وہ روئے مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ رو کیوں رہے ہیں ان کا ذہن محسوسات کا تجزیہ بھی کرتا ہے اورانھوں نے یہ یقین بھی کرلیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے اس عالمی سانحہ پر میر انیسؔ نے جو کچھ لکھا اس سے تقی عابدی کافی متاثر ہوئے۔ اسی تاثر نے انھیں مرثیہ نگاری سے جوڑا اور میر انیسؔ کا مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا۔

میر انیسؔ اُردو زبان کے ایسے محسن اعظم ہیں کہ انھیں دنیائے شاعری میں "خدائے سخن" اور "شاعرِ عظیم" کے القاب سے پکارا جاتا ہے اردو زبان اور اردو شاعری کو وسعت و رفعت بخشنے میں اُن کا حصہ اوروں سے بہت زیادہ ہے۔ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے میر انیسؔ جیسا شاعر پیدا کیا۔ ہماری تحقیق و تنقید میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری تک محدود رہتی تھی حالانکہ اس عظیم شاعر نے مرثیہ نگاری کے پردے میں انسانی زندگی کی ابدی گہرائیوں کو سراغ

لگانے کی ایسی کوشش کی ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے مگر تقی عابدی نے انھیں صرف بحثیت مرثیہ گو ہی نہیں بلکہ رباعی گو اور سلام و کلام پیش کرنے والے شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی زیرِ مطالعہ کتاب ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' (جب قطع کی مسافت شبِ آفتاب نے) ہے۔

یہ کتاب خُدائے سخن میر ببر علی انیسؔ کے اس یادگار مرثیے کے تجزیے پر مشتمل ہے جسے اردو کے معروف محقق پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے بجا طور پر ''معجزاتی صحیفہ ادب'' قرار دیا ہے۔

تقی عابدی کی یہ کتاب ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' ۸۰۴صفحات پر مشتمل ہے جس میں اردو متن ۷۶۲ صفحات پر اور انگریزی متن ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا سائز 9*12 انچ ہے پوری کتاب فائن آرٹ پیپر پر پانچ خوبصورت رنگوں اور زرد زمین پیپر ماشی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ عموماً فائن آرٹ کا کلچر اردو میں نہیں ہے۔ گویا تقی عابدی اب اس کتاب کے بعد اس کے موجد ہوئے۔ کتاب کے باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن بھی اس کی وجہ سے دوبالا ہوگیا ہے۔ یہ کتاب سرینگر میں مرثیہ فاونڈیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر اکبر حیدری کی نگرانی میں میں ترتیب دی گئی اور پھر ۲۰۰۲ میں دلی سے شائع ہوئی کتاب میں مرثیے کے ۱۹۷ بند ہیں ہر بند کے سامنے ۳۲ سے ۴۰ سطور میں تجزیہ کیا گیا ہے اور آخر میں ۴۲ صفحات پر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے ''The battle of karbala'' کا منظوم مرثیہ انگریزی ترجمے کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سید العلماء مولانا سید علی نقی قبلہ

مرحوم کا ۳۰ بندوں پر مرثیہ کا منظوم عربی ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیب نے '' شاہکار انیسؔ کے نام سے ۱۹۴۳ میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب ایڈیشن لکھنوء سے شائع کیا تھا لندن سے مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ The battle of Karbala کے نام سے شائع کیا جبکہ ''حسن علی ٹالپر'' نے اسے منظوم سندھی کے قالب میں ڈھالا۔

کتاب کے ابتدائی صفحے پر خدائے سخن میر انیسؔ کی تصویر ہے اس کے بعد میر انیسؔ کے مزار کی تصویر ہے مزار کی تصویر کے بعد کتاب کے ٹائٹل کا رنگین عکس ہے۔ اس کے بعد اگلے صفحے پر خود ڈاکٹر سید تقی عابدی کی رنگین تصویر ہے۔ ایک صفحے پر جہاں انتساب تحریر کیا گیا ہے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی رنگین تصویر ہے اور اس کتاب کا انتساب بھی جنت مکانی خلد آشیانی پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے نام کیا گیا ہے جو بیسویں صدی کے سب سے بڑے محقق انیسیات ہیں۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی انیسؔ کے کلام کی تفسیر تشہیر تحلیل اور تحفظ پر صرف کردی۔ جن کی تصانیف کے ذوق مطالعہ نے تقی عابدی کو اس عظیم کام پر معمور کیا۔ بعد ازاں ایک صفحے پر ڈاکٹر نیر مسعود کا گرامی نامہ تاریخ کامل انیسؔ و تجزیہ یادگار انیسؔ (سید باقر علی زیدی امریکہ) سید عاشورہ کاظمی (لندن) کا مکتوب گرامی اور حسین انجم (مدیر طلوع افکار کراچی) سید اقبال کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی) کا منظوم نذرانہ عقیدت اور نظمیں درج ہیں۔

ایک صفحے پر میر انیسؔ کا عکس تحریر ہے جو ایک مرثئے کے چار بندوں پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے۔:

؎ جب حُرؓ کو ملا خلعت پر خونِ شہادت

اور ایک صفحے پر پروفیسر اکبر حیدری کی رنگین تصویر دی گئی ہے۔ ساتھ ہی اُن کا اہم مقدمہ بھی درج ہے۔ ''رو میں ہے رخش عمر'' کے عنوان سے ایک صفحے پر ڈاکٹر تقی عابدی کے ذاتی کوائف درج ہیں۔ تا کہ قارئین مرتب کتاب سے کسی قدر متعارف ہو جائیں۔

کتاب کا مقدمہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے لکھا ہے جو گیارہ سے چودہ صفحے پر یعنی چار صفحات پر محیط ہے۔ اس میں انہوں نے کتاب کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ اس شاہکار تحقیقی و تنقیدی تصنیف کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور اپنے تاثرات بھی پیش کئے ہیں کتاب سے ایک اقتباس یہاں پیش کر رہی ہوں تا کہ تقی عابدی کی اس شاہکار تصنیف کے متعلق پروفیسر حیدری کے تاثرات کا اندازہ لگایا جا سکے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''ڈاکٹر عابدی کی تازہ ترین تصنیف '' تجزیہ یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' اُردو لٹریچر خاص کر رثائی ادب میں ایک عظیم کارنامہ ہے جو علامہ شبلی کی معرکہ آرا کتاب موازنہ انیسؔ و دبیرؔ کے تقریباً ایک سو سال بعد منظر عام پر آرہا ہے۔ کتاب دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو کمی پیشی موازنہ میں محسوس کی جا رہی تھی اُسے ڈاکٹر صاحب نے نہ

صرف پورا کیا بلکہ اپنی کاوش فکر کو شبلی سے بہت آگے بڑھا دیا ہے شبلی نے جا بجا انیس کے متعدد مرثیوں پر تبصرہ کیا اور محدود صنائع بدائع کی مختصر خوبیاں بیان کیں برعکس اس کے ڈاکٹر صاحب نے انیس کے صرف ایک مرثیے میں صنائع لفظی و معنوی کی تقریباً ایک سو خوبیاں تلاش کر کے نمایاں کی ہیں۔ یہ کام انتہائی مشکل ہے اور اس کا تصور آج تک کسی کے دماغ میں نہیں آیا''(۱)

کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵ پر تقی عابدی نے پیش لفظ تحریر کیا ہے جو تین صفحات پر محیط ہے۔ تقی عابدی نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کتاب کی تصنیف کا اصلی محرک بھی بتایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پیش لفظ سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

''اس کتاب کی تصنیف کا اصلی محرک پروفیسر ادیب مرحوم کے ''شاہکار انیس'' کا مقدمہ ہے فرماتے ہیں کہ:

''اگر کوئی شخص انیس کا صرف ایک ہی مرثیہ پڑھنا چاہتا ہے تو اُس کو اسی مرثیہ (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے) کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس مرثیے میں پورا معرکہ کربلا مختصراً پیش نظر کر دیا گیا ہے اس میں انیس کے ہر طرح کے کلام کے نمونے موجود ہیں اور انیس کے بیشتر محاسن جمع ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو مرثیے کے متعلقات پر کافی اطلاع نہیں جنھوں نے انیس کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ زاویہ نگاہ اور

اندازِ فکر پیدا نہیں کر لیا ہے جو کلام انیسؔ کے محاسن کو بخوبی سمجھنے کے لئے
ضروری ہے وہ بھی اس مرثیہ سے لطف اٹھا سکتے ہیں اور انیسؔ کی شاعری کے
بلند مرثیے کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں آج کی مصروف دنیا میں تمام مرثیوں
کا مطالعہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ چنانچہ میں نے عوام اور خواص کے
لئے اس مرثیے کا مکمل تجزیہ کیا ہے"۔(۲)

ڈاکٹر عابدی کا تحریر کردہ پیش لفظ عجز وانکسار کا ثبوت ہے جو میر انیسؔ سے عقیدت مندی
کا آئینہ دار ہے جیسا کہ خود بھی فرمایا ہے:-

"مجھے اوائل سے میر انیسؔ کے ساتھ والہانہ محبت وعقیدت رہی ہے اور
ہمیشہ ان کے کلامِ شریں کی خاک کو بصارت افروزی کیلئے سرمے کے طور پر
لگاتا ہوں"۔۳

پیش لفظ کا آخری جملہ ڈاکٹر تقی عابدی کی عجز وانکسار کی واضح دلیل ہے لکھتے ہیں:-

"آخر میں صاحبانِ علم سے گذارش ہے کہ اگر انھیں تجزیہ یادگار مرثیہ
میں کوئی خامی نظر آئے تو ازراہِ علمی دوستی مجھے مطلع فرمانے کی زحمت
کریں"۔(۴)

ڈاکٹر تقی عابدی کا تجزیاتی مقالہ چودہ (۱۴) ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں اس مرثیے
کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ باب اول "حیات میر انیسؔ" (صفحہ ۱۸ تا ۶۵) ۴۸ صفحات پر پھیلا

ہوا ہے۔ میر انیسؔ کی حیات کے ذیل میں ڈاکٹر عابدی نے ۳۴ ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔جن میں میر انیسؔ کی زندگی اورفن کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔اوراس سلسلے میں راہ پا گئی چند غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔

ذیلی عناوین اس طرح ہیں:-۱) تعارف- میر انیس کی ولادت-تعلیم وتربیت- شاعری کی ابتدا-فنون سپہ گری- حلیہ- وضع اور لباس- پابندی اوقات- اخلاق و کردار- نازک مزاجی-غزل -میر انیسؔ کا شعری ذخیرہ۔ انتخاب بحر-مرثیوں کے مطلعے - نظام اوقات شعر کی قدر دانی -تقلید طرز مرثیہ- تلامذہ اقامت گاہیں- ذاتی امام باڑہ-منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز-منتخب مجالس- پہلی مجلس-مجلس چہلم-اہلیہ میر ضمیر- میر انیس کی تاریخی مجلس- مجلس سرائے عالی خان-مجلس میاں مداری-مسجد چوک کی مجلس-مجالس عظیم آباد- بیماری - وفات۔مذکورہ ذیل عناوین کے تحت ولادت سے وفات تک کے تمام معاملات درج ہیں ساتھ ہی اختلاف تاریخ پیدائش بھی اس باب کا اہم حصہ ہے جس کے متعلق گذشتہ ذیلی باب میں وضاحت کر دی گئی ہے لحاظ اس کی تفصیل سے گریز کیا جا رہا ہے اس باب میں انیسؔ اور ان کے خاندان کی مکمل صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔اور ساتھ ہی انیسؔ کی ادبی تصنیفات و تالیفات کے ساتھ دیگر علمی معلومات اور کوائف مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔میر انیسؔ کی شعری اصناف میں طبع آزمائی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی ان کی غزل گوئی سے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگر چہ اردو ادب کے دامن میں میر انیسؔ کے دوسو سے زیادہ مراثی ۔ صدہا سلام اور چھ سو کے قریب رباعیات موجود ہیں لیکن غزلوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ادب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں میں میر انیسؔ کی صرف ۴۴ غزل کے اشعار مختلف تذکروں بیاضوں اور مرثیوں کی جلدوں سے جمع کئے گئے ہیں ۔ یعنی چار پوری غزلیں ایک آدھی غزل اور پانچ منفرد شعر میر انیسؔ کے تغزل کے نمونے ہیں ۔ اگر چہ یہ تمام اشعار میر صاحب کا غیر منتخب کلام ہے لیکن اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میر انیسؔ کو غزل گوئی میں دستگاہ تمام اور قدرت کامل حاصل تھی" ۔ (۵)

تقی عابدی کی پیش کردہ میر انیسؔ کی غزلوں سے کچھ اشعار یہاں پیش کئے جارہے ہیں تا کہ بحثیت غزل گو شاعر ان کی شاعری کا اندازہ ہوسکے :-

لکھ کر زمین پہ نام ہمارا مٹا دیا
ان کا ہے کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
انیسؔ دم بھر کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کر کہاں سامنے ہوا کے چلے
بتوں سے آنکھیں لڑا چکے ہیں
عقب کے صدمے اٹھا چکے ہیں

ہوئی ہے برباد زندگانی

کئے کو ہم اپنے پا چکے ہیں

میر انیسؔ کی انتخاب بحر کے متعلق تقی عابدی نے لکھا ہے کہ انہوں نے مرثیوں کے لئے چار بحروں کے اوزان مقرر کر لئے تھے۔ چنانچہ اس بابت وہ یوں رقم کرتے ہیں۔

''میر انیسؔ نے مرثیوں کے لئے (۴) بحروں کے اوزان مقرر کر لئے تھے۔ چنانچہ مطبوعہ مرثیوں میں بحر ہزج کے اوزان اخراب مکفوف ومحذوف میں (۸۷) مرثیے۔ بحر مضارع کے اوزان اخراب مکفوف و محذوف میں (۵۲) بحر رمل کے اوزان میں مجنون اور محذوف میں (۵۳)مرثے اور بحر متجث کے وزن مجنون ومحذوف میں تین چار مرثیے موجود ہیں''۔(۶)

تقی عابدی نے ایک اور انکشاف جو میر انیس کے مرثیوں سے متعلق کیا ہے وہ یہ ہے کہ انیسؔ کے (۶۷) سے زیادہ مرثیے ''جب'' سے شروع ہوتے ہیں جن میں کئی شاہکار مرثیے شامل ہیں۔

دوسرا باب ''میر انیسؔ مشاہیر شعر وادب کی نظر میں'' (صفحہ ۶۶ تا ۸۱) یعنی ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں تقی عابدی نے عہد انیسؔ سے لے کر عہد جدید تک کے کل ۷۶ منتخب مشاہیر کے بیانات کا احاطہ کیا ہے۔ جو میر انیسؔ کے متعلق ان اہم شخصیات نے رقم کیے ہیں۔ تقی عابدی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ابتداء مرزا غالبؔ سے کی ہے اور اختتام

ڈاکٹر ہلال نقوی پر کی ہے۔ ان حضرات کے نام یہاں درج کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے کیونکہ ان حضرات کا ذکر ''دیوان رباعیات انیسؔ کے حوالے سے آ چکا ہے مذکورہ حضرات کی آرا سے میر انیسؔ کی قدر دانی کا بخوبی انداز ہو جاتا ہے۔

تیسرا باب ''یادگار مرثیے کے متعلقات'' کے عنوان سے (۸۲ تا ۱۱۵) یعنی ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں مرثیے کے متعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں مرثیے کی تاریخ تصنیف کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے (تقی عابدی) نے بتایا ہے کہ مرثیے کی درست تاریخ معلوم نہیں ہے کیوں کہ تاریخ اور کُتب کے حوالے سے اسکا صحیح علم نہیں ہو سکا ہے۔ کہ یہ مرثیہ کب تصنیف کیا گیا ہے لیکن مرثیہ کے آخری بند میں مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ میر انیسؔ کے ضعیفی کے زمانہ کا ہے۔ آخری بند کہ مصرعے اس طرح ہیں۔

بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند لفظ ہیں سلطان پسند بند
یہ فعل اور یہ عزم عزا یادگار ہیں
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے (۷)

اس کے علاوہ انہوں نے (تقی عابدی) نے اس یادگار مرثیہ کی وجہ تصنیف بھی بیان کی

ہے۔اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مرثیہ کب اور کہاں پڑھا گیا ہے۔اس حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے ۔جس کے مطالعہ سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ پٹنہ عظیم آباد میں دو بار پڑھا گیا۔پہلی بار ۱۸۵۹ء میں اور دوسری بار ۱۸۷۰ء میں پڑھا گیا۔تقی عابدی نے مرثیے کے بندوں اور مطلعوں میں اختلافات کے حوالے سے اس کی تفصیل معتبر دلیلوں اور مستند قلمی نسخوں سے پیش کی ہے اس مرثیہ کی اشاعت سے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مرثیہ سب سے پہلے زیور طباعت سے نول کشور نے مراثی انیسؔ میں آراستہ کیا پھر دبدبہ احمدی لکھنو پھر اس کے بعد نظامی پریس بدایوں میں شائع ہوا۔

مرثیہ ''جب قطعہ کی مسافت شبِ آفتاب نے'' بحر مضارع کے وزن میں ہے۔مرثیہ واحد ایک ایسی صنف ہے جس میں رزم بزم تسلسل بیان۔پند و وعظ۔اخلاق و کردار۔رفتار و گفتار۔مکالمہ نگاری۔سوز و گداز۔بین اور گریہ کے مضامین ایک ہی بحر میں نظم ہوتے ہیں۔اس مرثیے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کے تمام بند مردف ہیں یعنی ردیف رکھتے ہیں اس کے ۴۷ بند مکمل مردف ہیں یعنی ۲۹۰ اشعار مردف اور ۲۹۸ غیر مردف اشعار ہیں اس مناسبت سے عربی فارسی اور اردو وغیرہ کے الفاظ کے متعلق تقی عابدی لکھتے ہیں۔

''اس مرثیے کی ایک خصوصیت میر انیسؔ کی زبان و بیان پر قدرت ہے بلکہ اس ایک ۱۹۶ بند کے مرثیے میں کل الفاظ جس میں تکرار شامل ہے ان کی تعداد ۹۴۹۳ ہے عربی الفاظ کی تعداد ۱۷۶۹ فارسی الفاظ کی تعداد ۱۹۴۸ اور

اردو الفاظ کی تعداد ۶۷۷۵ ہے اردو الفاظ میں ہندی کے الفاظ بھی شامل ہیں ۔ ہم نے اُن کو اردو اور ہندی میں اس لئے جُدا نہیں کیا کیونکہ اردو خود ہندی نژاد ہے اس مرثیے میں ۶۱ فیصد الفاظ اردو میں ۲۰ فی صد الفاظ فارسی میں اور انیس ۱۹ فی صد الفاظ عربی کے ہیں۔ انیسؔ نے مرثیوں، سلاموں ،رباعیوں،قصیدوں اور نوحوں میں کتنے الفاظ استعمال کئے اس کا تعین کرنا آسان نہیں''۔(۸)

اس کے متعلق خود میر انیسؔ نے بھی اپنے ایک مرثیہ میں کہا ہے کہ جسکا مطلع ہے۔

'' جب شاہ کو فرصت نہ ملی طوف حرم کی

'' کر لیجئے شمار اس کا محاسب نے یہ چاہا

جو کچھ تھا مہندس کا طریقہ وہ بنایا

دی کلک نے آواز کہ ہاں عقل نبایا

لشکر کی سیاہی سے لکھا جائے سیایا

تحریر خط و خال کا ب دھیان نہیں ہے

ذروں کا یہ گننا ہے کچھ آسان نہیں ہے

اورفرماتے ہیں:-

لاکھوں میں بھی تعداد نگار اس کا نہ ہو گا

بے روز حساب آئے شمار اس کا نہ ہوگا (۹)

میر ببر علی انیسؔ نے اس مرثیے میں بیس سے زیادہ قرآنی آیات کے حصے یا مرکب الفاظ یا عربی کے تلمیحات اس خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی اجنبیت یا غیر مانوسی ظاہر نہیں ہوتی ہے۔نمونے کے طور پر چند اشعار دیکھئے جو زیر نظر کتاب میں درج ہیں:۔

صف میں ہوا نعرہ " قد قامت الصلوۃ

بسم اللہ آگے جیسے ہوں یوں تھے شہ حجاز

"یاحی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار

" سبحان ربنا " کی صدا تھی علی العموم

حقا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد

دنیا سے اٹھ گیا وہ قیام اور وہ قیود

تقی عابدی میر انیسؔ کی منظر کشی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میر انیسؔ الفاظ کے بادشاہ تھے۔منظر کشی جب خود منظر بن جائے تو اسے مرقع کشی کہتے ہیں۔انیسؔ الفاظ کے ذریعے سہہ سعبدی (three Dimensional) کیفیت پیدا کرتے تھے۔چنانچہ سننے والے کو منظر دکھائی دینے لگتا۔خود فرماتے ہیں۔

خود برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
دکھلاؤں ہر ورق مرقع لڑائی کا
مصرعہ ہر اک دکھائی برش ذوالفقار کی
قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کہ پتنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی" (۱۰)

اس مرثیے میں میر انیسؔ کی معجزہ بیانی عروج پر دکھائی دیتی ہے اس ایک مرثیے میں انھوں نے ۲۵ سے زیادہ جانوروں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان سے مربوط خصوصیات کو بھی مضمون سفر سے ایسا ربط دیا ہے کہ اس میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے:۔

؎ شعبے صدا میں پھنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں (۱۱)

اوران جانووں کے نام یوں ہیں:

شیر۔ دراج۔ تیتو۔ طاؤس ۔ مرغا۔ قمریوں۔ کوکو۔ ساہی۔ چیونٹی۔ ہرن۔ پروانہ۔ مچھلیوں۔ سمندر۔ کبک۔ چیتے۔ نہنگ۔ اونٹ۔ گھوڑے۔ عقاب۔ بلبل۔ گرگ ۔ گاؤ۔ اژدہا۔ شاہین اور سیمرغ وغیرہ۔

انیسؔ کے یہاں ہر ذی روح کی وقعت پائی جاتی ہے پھر چاہئے وہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو۔ان کے مشاہدے کی وسعت ان کے اس شعر سے بیان ہوتی ہے جس میں انہوں نے ایک چیونٹی کو بھی ذی حیات سمجھا ہے:۔

؎ کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے (۱۲)

انیس کا کمال تشبیہات میں بھی خالص طور سے نمایاں ہے۔انھوں نے اس میدان میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔جس کی واضح مثال تقی عابدی نے ان کے اس شعر سے دی ہے۔

؎ یوں تھے خدنگ ظلِ الٰہی کے جسم پر
جس طرح ہار ہوتے ساہی کے جسم پر

یہاں انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے جانور کو تصویر کشی کے لئے سامنے لایا ہے جس کی طرح کا کوئی دوسرا حیوان موجود نہیں ہے یہاں یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ اردو شاعری میں رزم نگاری کے شہسوار بھی انیسؔ ہی ہیں حالانکہ کچھ شعرا نے ان کے کلام سے فائدہ اٹھا کر کامیاب تجربے بھی کئے مگر پھر بھی وہ ان کے کینوس سے کبھی باہر نہیں نکل سکے۔ زیرِنظر مرثیہ میں گھوڑے کے بیان میں صرف دو تین بند ہیں ،لیکن ان تین بندوں کے آٹھ نو اشعار میں انہوں نے دس سے زیادہ گھوڑوں کے نام کے ساتھ ان اسم خاص کو بھی بیان کیا

ہے۔ جیسے۔ براق ۔فرس۔دلدل۔ اسپ۔ توسن۔ ذوالجناح۔ ابلق۔راہوار۔ سرنگ۔ گھوڑا۔اور ہرنے وغیرہ۔تقی عابدی کے الفاظ میں'' جس مصرعہ میں رفتار دکھانا مقصود تھا اسے ''براق'' کہہ دیا۔

؎ اُترا ہے پھر زمین پر براق آسمان سے

اور جہاں عظمت اورنسب دکھانا تھا اسے دلدل اورذوالجناح کہہ دیا:

؎ تصویر ذوالجناح پہ تھی بو شراب کی
خوش خو تھا خانہ زاد تھا دلدل نژاد تھا (۱۳)

اسی طرح انیسؔ نے اس مرثیے مین تیر کمان اوراس کے جزئیات کے لئے سترہ سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں جیسے:- تیر۔ برچھی۔ سنان۔سوفار۔ پیکان۔خدنگ۔سیسر۔ سری۔نوک۔ تین بھال وغیرہ۔

اس مرثیے میں جنگی لوزمات کے ناموں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور قاری تقریباً تمام لوازمِ حرب سے آگاہ ہوجاتا ہے۔

انیسؔ نے مرثیے کے چہرے میں صبح کی دلکشی اتنی موثر انداز میں پیش کی ہے کہ اس میں ۴۵ سے زیادہ عنوانات سے وادی منیوا ساس کو مزین کیا گیا ہے۔ جیسے سبزہ۔ درخت۔ پھول۔ برگ گُل ۔سبدگل ۔گل گلشن ۔گل آفتاب کانٹا۔غنچہ۔پنکھڑی۔باغ۔ بہار۔نسیم نخل۔ بلبل ۔شاکوں۔خوشبو۔کلی۔ پتے۔ثمر۔شجر۔ مہک۔خار۔ چنار۔سبزہ۔چمن ۔زار۔شبنم۔

اور سارے الفاظ اس طریقے سے استعمال کئے گئے ہیں ایک کو بھی آگے پیچھے کر دیا جائے تو شعر کا کمال جاتا رہتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفیقوں کے لئے استعمال کئے گئے باوقار الفاظ کی بابت تقی عابدی لکھتے ہیں۔

> ''میر انیسؔ نے سچے اور باوقار الفاظ استعمال کر کے امام حسینؑ اور انکے رفیقوں کی سیرتوں میں اخلاق حسنہ کی انتہا ان کے اعمال و افعال کے ذریعہ سے دکھائی ہے اس کی وجہ سے وہ حسن اخلاق کے محض خیالی معیار ہو کر نہیں رہ گئے، بلکہ لوگوں کیلئے قابل تقلید نمونے بن گئے۔''(۱۴)

یعنی ۱۷ اشعار میں (۴۹) اوصاف حمیدہ کو اس طرح جمع کیا ہے کہ انسان پر فرشتوں کا گمان ہوتا ہے۔ تقی عابدی کی زرف نگاہی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے امام حسینؑ ان کے خاندان اصحاب اور پیغمبر اسلام کے نام اور القاب روغیرہ کا شمار بھی کیا ہے۔ جو تعداد میں کل ۳۴۴ ہیں اور ساتھ ہی دشمنان اور ظالمان میں بھی (۷) ناموں کا ذکر کیا ہے۔

چوتھا باب بعنوان ''مرثیہ کے منتخب اشعار'' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے زیر نظر مرثیہ سے (۷۲) اشعار منتخب کر کے نقل کئے ہیں۔ جو کہ مرثیے کہ ۵۸۸ اشعار میں سے چنے گئے ہیں۔ جنھیں تقی عابدی نے ''بہتر جواہر'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حسن انتخاب اشعار سے تقی عابدی کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ خود بھی شاعر ہیں۔ اس لئے انتخاب

کافی بہترین ہے۔اور ان بہتر (۷۲) اشعار میں سے نو (۹) اشعار بطور نورتن انتخاب کئے ہیں۔ جو ان کے ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس سلسلے میں آخر میں ایک شعر بھی نقل کیا ہے جسے حاصل مرثیہ کہا ہے اور اپنے آپ میں ایک مرثیہ کی حیثیت رکھتا ہے شعر ملاحظ کریں۔

ے جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وامحمدؑ(۱۵)

پانچواں باب بعنوان ''نمونہ جات مطبوعہ مراثی'' میں تقی عابدی نے میر انیسؔ کے تین مطبوعہ مراثی

(۱) مرثیہ انیس (جلد رابع) مطبوعہ منشی کول کشور لکھنو
(۲) جدید جلد ششم مرثیہ ہائے میر انیسؔ صاحب مرحوم مطبع شاہی لکھنو
(۳) مراثی انیسؔ (جلد اول) مطبوعہ نظام پریس بدایوں ۱۹۳۵ء

کے ٹائٹل کا عکس مع چند بندوں کے کتاب میں شامل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا مرثیہ کب اور کہاں سے شائع ہوا اور کس نے مرتب کیا وغیرہ۔

چھٹا باب بعنوان ''اشخاص مرثیہ'' ان پاک اور پاکیزہ ہستیوں کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے جن کے نام اس مرثیے میں نظم ہوئے ہیں۔ان پاک ناموں کے علاوہ یزید کی فوج کے سرکردہ افراد اور قاتلان شہدا کے ناموں کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کا مختصر تعارف بھی دیا ہے۔ تاکہ ایسے قارئین جنھیں واقعات کربلا سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔انھیں اس مرثیہ کو سمجھنے

میں آسانی ہو سکے۔تقی عابدی کے اس کارنامے کی وجہ سے مرثیے کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ساتھ ہی مختلف کرداروں کو سمجھنے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔جن سے اکثر قاری واقف نہیں ہوتے۔

ساتواں باب بعنوان ''مرثیے پر اعتراضات'' میں تقی عابدی نے جہاں ایک طرف اس مرثیے کے نایاب گوہروں پر زور قلم صرف کیا ہے وہیں دوسری طرف کلام انیسؔ پر اعتراض کرنے والے معترضین کو بھی اس باب کا موضوع بنایا ہے۔جن میں پہلا نام عبدالغفار نساخؔ کا ہے اور دوسرا نام کلیم الدین احمد کا ہے۔اس میں نساخؔ کی زد میں جو قابل قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ کلیم الدین احمد کی کتاب ''میر انیسؔ'' کے جواب میں مستند حوالوں کی روشنی میں دندان شکن جواب لکھ رہیں ہیں۔

آٹھواں باب:-بعنوان ''مرثیے کے تجزیاتی نمونے'' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری پر دیگر ناقدین کی تنقیدی و تجزیاتی تحریروں کا تذکرہ کیا ہے اور حوالے دیئے ہیں۔اور ان کے بیانات کو قلم بند کیا ہے۔کیوں کہ زیر نظر مرثیہ کے متعلق زیادہ بیانات ملتے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے انھیں اس کتاب میں شامل کیا ہے خود لکھتے ہیں:۔

''اگر چہ میر انیسؔ کے چند مرثیوں پر بعض اہل قلم حضرات نے تجزیاتی بیانات تحریر کئے ہیں جو ہمیں مختلف رسالوں اور کتابوں میں نظر آتے ہیں

لیکن سب سے زیادہ اقتباسات اس مرثیے کے ذیل میں ملتے ہیں'' (۱۶)

نواں باب :-'' مرثیے کے تجزیے کا طریقہ کار'' صفحہ (۱۶۴ تا ۱۸۴) یعنی ۲۱ صفحات پر محیط ہے مرثیے کے تجزیے کے طریقہء کار کے حوالے سے تقی عابدی نے لکھا ہے کہ:-

'' میر انیسؔ کے مرثیے کو اچھی طرح سے سمجھنے اور اس کے محاسن کو پرکھنے کیلئے اس کے ہر مصرعہ اور ہر بند کو فصاحت۔ بلاغت۔ علم بیان کے تشبیہات۔ استعارات ۔مجاز۔ مرسل۔ کنایات۔ صنائع ۔لفظی صنائع۔ معنوی۔ روز مرہ محاورات۔ تمثیلات۔ آہنگی او رصوتی کیفیات اخلاقی۔ آفاقی۔ سماجی اور معاشرتی اقدار۔ اسلوب۔ حسن بیان۔ ترتیب و تسلسل۔ اعتدال و تخیل۔ انتخاب الفاظ و حسن۔ بندش۔ روانی شگفتگی۔ صفائی عمدگی۔ زور دگوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ میں منظر نگاری۔ واقعہ نگاری۔ تمثیل نگاری۔ جذبات نگاری۔ المیہ بیان۔ حفظ مراتب۔ کا خیال اور سماجی عناصر کا تفصیل سے جائزہ لینا پڑھے گا جس کو ہم نے اس مرثیہ کے ذیل میں کسی حد تک کیا ہے یہاں یہ وضاحت بھی لازم ہے کہ اوپر بیان کئے گے مطالب کے حدود ایک دوسرے سے ملے ہوے ہیں یعنی ان کو مکمل خانوں میں تقسم نہیں کیا جاسکتا اسی لئے مختلف علمائے ادب نے انھیں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔'' (۱۷)

مذکورہ بیانات کی روشنی میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فصاحت اور بلاغت اور جدید الفاظ۔ اصطلاحات اور ترکیبات کے حوالے سے لے کران کی نمایاں خصوصیات اور قادرالکلامی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔محاورات بندشاور ترکیبات کی مثالیں دی ہیں۔انہیں کے کلام میں محاورات کے استعمال کے متعلق ڈکٹر عابدی نے لکھا ہے کہ:

''انیس کے ایک مرثیے میں چھ سو سے زیادہ محاورات نظر آتے ہیں ،مرثیہ کے دقیق تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب روز مرہ فصاحت بلاغت محاورات تمثیلات تشبیہات استعارات صنائع لفظی اور معنوی کے علاوہ گفتگونہیں کرتے زیرنظر مرثیہ محاورات سے بھرا ہوا ہے'' (۱۸)

بعض جگہوں پر انہیں سے ایک بند میں چار چار محاورے بھی استعمال کیے جس سے ان کی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے مثال کے طور پر دو مصرے:

؎ گرمی میں ساری رات یہ گھٹ گھٹ کے روئے ہیں

؎ تھرائے آسمان ہلا عرش کبریا۔

آسمان کا تھرانا۔عرش کا ہلنا۔گھٹ گھٹ کے رونا روزمرہ کے محاوروں کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے جس کا تجزیہ دقیق نظر سے تقی عابدی نے اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔

پھر جہاں تک بندش اور ترکیبات کی بات ہے تو بقول تقی عابدی صرف اس مرثیے میں کل اضافات ۵۸۷ سے زیادہ ہیں جن میں ایک اچھی تعداد نئی ترکیبات کی شامل ہے جس

کی اپنی ایک علیحدہ اہمیت ہے ،غرض یہ کہ اس باب میں کی گئی بحث اعلی درجے کی حامل ہے جس کی اپنی ایک علیحدہ اہمیت ہے اس کے علاوہ تقی عابدی نے کچھ اہم شخصیات جن میں شیخ امام بخش ناسخ ،نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ،محمد رضا معجز شاگرد ناسخ ۔مولانا محمد حسین آزاد مولانا الطاف حسین حالی ۔علامہ شبلی نعمانی ،پروفیسر رام بابو سکینہ ڈاکٹر اعجاز ڈاکٹر ابواللیث ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری ،جناب امیر احمد علوی اور پروفیسر انور سدید کے اقوال بیانات اور تحاریر کے حوالے دیئے ہیں ۔

دسواں باب ''معجز بیانی'' ہے اس میں تقی عابدی نے حالی کی ایک طویل تمہید رقم کی ہے ہے جس میں خواجہ الطاف حسین حالی کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے کہ حالی نے شاعری میں کمال حاصل کرنے کیلئے دو قوتوں کی نشاندہی کی ہے یعنی قوت تخیل ،مطالعہ فطرت اور قدرت الفاظ ۔اس حوالے سے تقی عابدی کی سیر حاصل تمہید سے ایک اقتباس رقم کر رہی ہوں ؛

''اگر یہ قوت تخیل غضب کی ہو اور پھر مشاہدہ اور تجزیہ جو باریک بنی علم اور مطالعہ سے زیادہ ہو تو وہ شخص بڑا شاعر ہوتا ہے یہی چیز میر انیس کے کلام میں موجود تھی ۔چنانچہ جیسے ہی اچھوتا طائر خیال فضائے ذہن میں ظاہر ہوتا ہے میر صاحب کی قوت متخیلہ اسے الفاظ کا پیکر دے کر گلشن سخن میں اتار دیتی تھی ۔مثال کے طور پر درختوں کے تنے کے اطراف جو پھولوں پر جو شبنم کے قطرے پڑے ہوتے ہیں یا درختوں کے پر جو اوس کے قطروں کی چمک سورج کی شعاع سے پیدا ہوتی ہے اس کو خوبصورتی سے نظم کیا ہے ملاحظہ کریں :

؎ پھولوں سے سرسبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدگل فروش تھے
خواہاں تھے زیر گلشن زہراؑ جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

شاعری میں کمال کی دوسری قوت مطالعہ کائنات ہے یعنی شاعر جتنا دقیق اور باریک بینی سے مناظر قدرت اور انسانی فطرت کا مطالعہ کریگا وہ ذہن میں ذخیرہ کی صورت میں حواس خمسہ کے دروازں سے جمع ہوگا اور اسی مسئلہ کولیکر اس کی قوت متخیلہ دنیائے سخن میں کہیں سنگ مرمر کا تاج محل تو کہیں لال پتھر کا لال قلعہ تو کہیں مٹی کے تو دوں سے بی بی کا مقبرہ تعمیر کرتی ہے،اس مرثیہ میں جہاں جن وانس چرند۔پرند۔نباتات۔جمادات۔غرض کائنات کے ہر چیز کو میر انیسؔ خدا کی تسبیح اور حمد میں مصروف بتاتے ہیں وہاں ان کے باریک بینی چیونٹی کی حرکت کو بھی دقیق نظر سے دیکھتی ہے جب وہ اپنی سامنے کے پیر میں دانہ لے جاتے وقت زمین پر نہیں ٹکتی بس ادہر ذہن میں یہ طائر خیال پرواز کیا ادھر اسے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر یوں ظاہر کیا ہے:۔

؎ چیونٹی بھی ہاتھ اٹھاکے یہ کہتی تھی باربار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

نمازیوں کے رقوع سجود ااورقنوت کو کن کن تشبیہات سے آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں دیکھیے:

؎ ''سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں

شہ پر تھے دونوں ہاتھ کیے طائر دعا

ہاتھ ان کے جب قنوت میں تھے سوئے خدا

شاعری میں کمال حاصل کرنے کی تیسری قوت شعر کی ترتیب کے وقت مناسب الفاظ کا استمال ہے میر انیسؔ مترادف الفاظ کے باریک سے باریک فرق سے بھی واقف تھے وہ معمولی شاعروں کی طرح ہر لفظ پر قناعت نہیں کرتے بل کہ مترادف لفظوں پر جب تک عمیق نظر نہ ڈالتے کسی لفظ کا انتخاب نہیں کرتے تھے اسی لئے وہ لفظ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا ہے میر انیس کا سینہ لفظوں کا گنج اور معانی کا سرچشمہ تھا۔ ہم الفاظ اوران کے استعمال پر پہلے بہت بحث کر چکے ہیں۔اس لئے یہاں تکرار ضروری نہیں سمجھتے اعلی تخیل وسیع مطالعہ فطرت اور الفاظ پر کامل اختیار نے میر انیسؔ کے کلام کا مجز بنا دیا اگر ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مراثی انیس کا گہرا مطالعہ کرتے تو ہندوستان کی الہامی کتابوں کو دو کے بجاے تین لکھتے یعنی وید مقدس، دیوان غالبؔ اور مراثی میر انیسؔ''(۱۹)

اس سیر حاصل بحث کے بعد ڈکٹر عابدی نے میر انیسؔ کی معجز بیانی۔ پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بڑی تفصیلی بحث کی ہے جو نہایت ہی فکر انگیز معلومات افزاء باریک بینی

نکتہ سنجی اور نکتہ رسی سے لبریز ہیں۔ منظر نگاری واقعہ نگاری مرقع نگاری تسلسل اور ہم آہنگی رزم نگاری، کردار اور اخلاق نگاری۔ امام کے اصحاب اور انصار، جذبات نگاری۔ نفسیات نگاری۔ جدت نگاری۔ مکالمہ نگاری۔ اور بین نگاری پر اس پورے باب میں میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت اور ان کی مرثیہ نگاری کے نمایاں عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ وہی عناصر ہیں جو مرثیہ کو دوسری اصناف سے الگ کرتے ہیں اور یہی اس کی خوبیاں بھی ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں ایک بند پیش کیا جا رہا ہے جہاں انیسؔ کو اپنے ممدوح مظلوم کربلا کی قدر و منزلت کا اتنا احساس تھا کہ وہ ان کی شان کے خلاف ذرا بھی سبکی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ لکھنا بھی گوارا نہیں تھا کہ میدان جنگ میں امام حسینؑ کو دھوپ کی تمازت سے تکلیف پہنچ رہی تھی لہذا دھوپ کی شدت کو انھوں نے شاہی ساز و سامان میں بدل کر آفتاب کو چھتری کے طور پر سایہ فگن قرار دیا ہے۔ بند ملاحظہ کریں:-

چلتی ہے تو حرات خورشید دو چند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوائیں ہیں پر گزند
جھیلوں میں ہیں درند درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسولؐ کا فرزند ارجمند
غربت میں بے کسی ہے شہہ دین پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

جہاں تک میرا خیال ہے میر انیسؔ کی معجزہ بیانی بیان کرنے کے لئے یہی مثال کافی ہے۔

گیارھواں باب:- ''محاسن مرثیہ'' چھتیس (۳۶) صفحات پر مشتمل یہ باب نہایت وقیع معلوماتی اور مفید ہے۔ اس میں علم بیان اور علم بدیع کی نہ صرف تعریف وتشریح کی گئی ہے بلکہ جملہ محاسن کو سمجھانے کے لئے تمام مثالیں بھی درج کی ہیں جو اسی ایک مرثیے سے لی گئی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علوم کو جاننے والے اگر ناپید ہیں تو بہت کم ضرور ہیں۔ کیوں کہ اکثر ان علوم پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ اس بات کا اعتراف راقمہ کو بھی ہے کہ ہمارے ہاں اردو میں اکثر ان علوم کو نظر انداز کیا گیا پھر چاہئے وجہ کوئی بھی رہی ہو۔ مگر بیشتر شعرا اور ناقدین ان علوم سے ضروری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق راقمہ کو بھی اپنی کم مائیگی کا احساس واعتراف ہے کیوں کہ اگر غور کیا جائے تو نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا کہ تقی عابدی نے اس باب میں جن باریکیوں اور تفصیلات پر قلم اٹھایا ہے ان سے کتنے ہی لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ میر انیسؔ کا یہ مرثیہ محاسن کلام کا ایک گنجینۂ گراں مایہ ہے۔ اس لئے اس مرثیے کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ان علوم سے واقفیت ہونا نہایت ضروری ہے۔ تقی عابدی نے یہ کارنامہ انجام دے کر محققین اور قارئین کے لئے بڑی آسانی اور سہولت مہیا کرائی ہے۔ جو اس مرثیے کو سمجھنے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ کیونکہ تقی عابدی کے اس بیش قیمت تجزیے کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے علم بیان اور علم بدیع کو سمجھنا ضروری ہے تبھی اس تجزیے کی قدر و قیمت کا صحیح طور اندازہ ہو سکے گا۔ اس ذیلی باب میں مذکر علوم کی وہ تمام

تفاصیل اورتشریحات نقل کرنا ممکن نہیں اس لئے یہاں سرسری طور پران کی طرف اشارہ ہی کیا جارہا ہے جن کوتقی عابدی نے مذکورہ کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

علم بیان:۔ یہ وہ علم ہے جس کے تحت کسی بات یا خیال کومختلف پیرایوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

علم بیان کے چار جزو ہیں۔(۱) تشبیہ(۲) مجاز مرسل، (۳)استعارہ،(۴) کنایہ

تشبیہ:۔تشبیہ کے لغوی معنی کسی چیز کے مانند ہونا ہے۔اس کے اصطلاحی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا ہے تشبیہ کے پانچ ارکان ہیں۔

(۱)مشبہ،(۲)مشبہ بہ، (۳)وجہ تشبیہ، (۴)غرض تشبیہ، (۵)حروف تشبیہ

اقسام تشبیہ:۔تشبیہ کی (۳۵) سے زیادہ قسمیں ہیں جن میں سے معروف قسموں کو تقی عابدی نے معہ مثال رقم کیا ہے۔

استعارہ:۔ استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا یا مستار لینا ہے انگریزی میں اسے Simile کہتے ہیں استعارہ کے اصطلاحی معنی حقیقی معنی کوترک کر کے مجازی معنی حاصل کرنا ہے۔علامہ شبلی نے اسے حسن کلام کا زیور کہا ہے۔

استعارہ کے(۴) چار ارکان ہیں:۔

(۱)استعارہ منہ (۲) مستعارلہ (۳) مستعار (۴) وجہ جامع۔ (اس کے ساتھ ہی تقی عابدی نے استعارہ کی اقسام کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔

مجاز مرسل:۔مجاز مرسل میں لفظ کا استعمال اس کے علاوہ کسی اور معنی میں کیا جاتا ہے اور

اس کے حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے سوا کوئی اور علاقہ نہیں ہوتا۔ علمائے علم نے اس کی ۲۴ قسمیں بتائی ہیں جن میں سے معروف قسمیں تقی عابدی نے درج کی ہیں۔

علم بدیع ۔علم بدئع بلاغت کا ایک اہم حصہ ہے اس کو علم معنی بھی کہتے ہیں اس علم میں کلام میں استعمال ہونے والی صنعتوں کا مطالع کیا جاتا ہے۔ علم بدئع اصطلاح میں اس علم کو کہتے ہیں جس سے کلام کی خوبیاں معلوم ہوں۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) صنایع معنوی The Figures of thoughts

(۲) صنایع لفظی The figures of words

ضایع معنوی:- ایہام- اس کو توریہ بھی کہتے ہیں اس کے لغوی معنی ''چھپانا'' ہے اصطلاح میں ایسے لفظ کو کہتے ہیں ۔ جس کے دو معنی ہوں جو فوراً سمجھے جاتے ہیں۔ مقصود نہ ہوں بلکہ دوسرے معنی سے مراد ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایہام مجردہ (۲) ایہام مرشحہ

توجیہ:- اس کو محتمل الذین یا ذوجہتیں بھی کہتے ہیں شعر میں ایسے محاورے یا فقرے استعمال کرنا جن سے متضاد معنی نکلیں۔

حشو:- اس کو اعتراض بھی کہتے ہیں اس کے معنی ''ٹھونسنا'' ہیں ۔ یعنی شعر میں ایسے الفاظ ہوں جو غیر ضروری یا بھرتی کے ہوں۔ حشو صفت بھی ہے اور عیب بھی۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱)حشو قبیح (۲)حشو متوسط (۳)حشو ملیح

احتجاج:-کسی کلام کو عقلی یا نقلی دلیل سے ثابت کرنا۔اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مذہب کلامی (۲)مذہب فقہی

سوال و جواب:-شعر میں سوال و جواب کے ذریعے مکالمہ کی صورت پیدا کرنا۔

حسن الطلب:-شاعر کوئی چیز اپنے ممدوح سے بہ طرز پسندیدہ طلب کرے۔

تجرید:-شعر میں مشہور و معروف صفت کا ذکر کیا جائے پھر اپنے ممدوح کو کسی طریقے سے اس کے برابر کر دے۔

تعجب:-کلام میں کسی چیز پر تعجب ظاہر کرنا۔

صنائع لفظی اور اس کی قسمیں

ا۔مسجع

(الف) مسجع متوازی (ب) مسجع مطرف

ترصیع:۔

☆ترصیع مع التجنیس

☆تجنیس:-۱۵قسمیں ہیں جنھیں ڈاکٹر عابدی نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

☆مرکب:-اس کی سات قسمیں ہیں۔

☆قلب:-اس کی پانچ قسمیں ہیں۔

نوٹ:- مذکورہ تمام نکات تقی عابدی کی کتاب ''تجزیہ یادرگار انیسؔ سے اخذ کیے گیے ہیں)اس کے علاوہ بھی بہت سارے محاسن کلام ایسے ہیں جنہیں طوالت کی وجہ سے یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے۔

ماحصل یہ کہ یہ باب نہایت ہی معلوم افزا اور قابل مطالعہ ہے اس ضمن میں ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت ہی محنت طلب کارنامہ انجام دیا ہے۔ صنایع و بدایع کے استعمال کی وجہ سے علمائے ادب نے انیسؔ کو بھی تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ خود انیسؔ کو بھی اس فن پر ناز تھا اسی لئے توانہوں نے کہا:-

؎ کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروس سخن کو سنوارا نہیں

بارھواں باب ''فہرست کامل'' کے عنوان سے ہے۔ جو کل ۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ باب جو اپنی محنت کے اعتبار بالکل انوکھا اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس باب میں ۳۵ شقوں پر مشتمل ایک جدول مرتب کی گئی ہے۔ جسے ''فہرست کامل'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس فہرست کامل کے جدول میں پورے مرثیہ کا شماریاتی تجزیہ ہے جو ہمیں بتلاتا ہے کہ پورے مرثیے میں کل کتنے الفاظ صرف ہوئے ہیں۔ اردو الفاظ، فارسی الفاظ اور عربی الفاظ کتنے ہیں۔ کل حروف کتنے ہیں کل اضافات ،کل جدید تراکیب، ،کل تشبیہات۔ کل استعارات، کل کنایات، کل مجاز مرسل اور دیگر صنائع کی تعداد کتنی ہے۔ اس جدول کو مرتب

کرنے اور اعداد وشمار کا تخمینہ لگانے سے پہلے تو اس مرثیے میں ان چیزوں کی تلاش وجستجو میں کتنی محنت ومشقت کی گئی ہوگی اس کا تصور ہی خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کتاب کی ورق گردانی کرنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سے خون پسینہ ایک کیا ہوگا۔ اور یہ کتاب اُن کی علمی اور فنی استعداد اور صلاحیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ نمونے کے طور پر ابتدائی چھ بندوں کا شماریاتی جدول یہاں نقل کیا جارہاہے۔ کیونکہ فہرست کامل پورے مرثیے کے اعداد وشمار پر مشتمل ہے۔

یہاں ابتدائی چھ بندوں کے اعداد وشمار پیش کئے گئے ہیں جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تقی عابدی نے کتنی عرق ریزی سے یہ کارنامہ انجام دیا ہوگا۔

۱	کل بند مرثیہ	۱۹۷	بند ۸۵ کا تجزیہ اس لئے نہیں کیا گیا یہ وہ معتبر نسخوں میں نہیں ہے
۲	کلااشعار مرثیہ	۵۹۱	صرف ۱۹۶ بند کا تجزیہ کیا گیا ہے
۳	کل مصرعہ مرثیہ	۱۱۸۲	
۴	کل الفاظ مرثیہ	۹۵۱۷	(الفاظ کی تکرار شامل ہے)
۵	کل الفاظ اُردو	۵۸۱۳	(الفاظ کی تکرار شامل ہے)
۶	کل الفاظ فارسی	۱۹۴۸	(الفاظ کی تکرار شامل ہے)

۷	کل الفاظ عربی	۱۷۶۹	(الفاظ کی تکرار شامل ہے)
۸	مرثیہ میں اردو الفاظ کا صیغہ		۶۱ اکسٹھ فی صد
۹	مرثیہ میں فارسی الفاظ کا صیغہ		۲۰ فی صد
۱۰	مرثیہ میں عربی الفاظ کا صیغہ		۱۹ فی صد
۱۱	کل حروف مرثیہ	۲۹۲۳۶	تمام مکتوب حروف تکرار کے ساتھ شامل کیے ہیں
۱۲	کل اضافات مرثیہ	۶۲۱	
۱۳	جدید تراکیب مرثیہ	۱۱۱	
۱۴	کل محاورات مرثیہ	۵۱۱	
۱۵	کل محاورات جدید	۸۵	
۱۶	کل تشبیہات مرثیہ	۸۶	
۱۷	کل استعرات مرثیہ	۴۵	
۱۸	کل کنایات مرثیہ	۱۰۵	
۱۹	کل مجاز مرسل مرثیہ	۱۵	
۲۰	صفت مراعات النظیر	۲۴۵	
۲۱	صنعت المزدوج	۱۷۷	

۲۲	صنعت طباق	۱۵۴	
۲۳	صنعت مبالغہ	۸۸	
۲۴	صنعت تکریر	۷۱	
۲۵	صنعت تلمیح	٦٦	
۲٦	صنعت تفریع	۴۸	
۲۷	صنعت ایہام	۵۲	
۲۸	صنعت تجنیس	۳٦	
۲۹	صنعت تنسیق الصفات	۳۵	
۳۰	صنعت حسن تعلیل	۳۵	
۳۱	صنعت جمع تقسیم وتفریق	۳۴	
۳۲	صنعت ترجمہ اللفظ	۳۰	
۳۳	صنعت ذو قفتین	۲۹	
۳۴	صنعت ذوالسنین	۱۱	
۳۵	متفرق صنائع جن کی تعداد ۳۰ سے زیادہ ہے	۱۷۱	

بند نمبر	شعر نمبر	تعداد الفاظ تعداد حروف	تعداد الفاظ اردو، فارسی، عربی	اضافات جدید ترکیب	محاورات جدید محاورات	تشبیہات استعارات	کنایات مجاز مرسل	مراعات النظیر	حسن تعلیل	تلمیح
	1	15-41	5-4-6	2-0	1-0			2		
1	2	16-47	3-4-9	2-1			1-0	1		
	3	13-14	5-1-7	3-1				1		
	1	17-48	4-1-12	1-0	1-0		1-1	1		
2	2	16-47	3-4-9	1-0	1-0		1-0			
	3	19-55	2-0-17		1-0					
	1	20-53	5-2-13		1-0					
3	2	16-54	1-7-8		1-0					
	3	17-50	4-5-8	1-0	3-0					1
	1	17-51	3-4-10	1-0						
4	2	15-52	3-4-8	1-0						
	3	14-50	2-3-9	2-0	1-0			1		
	1	15-51	5-4-6	4-0				1		
5	2	13-52	9-4-0	3-0						
	3	18-52	4-3-11	1-0	1-0					
	1	13-50	6-4-3	0-0						1
6	2	17-55	1-5-11	1-1	1-0			1		
	3	15-51	3-5-7	2-1	3-0			1		

تیرہواں باب ''تجزیہ کامل یادگار مرثیہ'' (صفحہ ۳۵۷ تا ۷۵۱)

جس کی مکمل ترجمانی انیسؔ کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

نظم ہے یا گوہر شہسوار کی لڑیاں انیسؔ

جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

''تجزیہ کامل یادگار مرثیہ'' اس کتاب کا سب سے طویل ترین اور خوبصورت باب ہے جو اس کتاب کا ماحصل ہے یا یوں کہیئے کہ اصلی روح ہے۔ اس کا تجزیہ ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے ہی منفرد انداز میں کیا ہے۔ اس کے ایک صفحے پر میر انیسؔ کے زیر نظر مرثیے کا ایک بند رقم کیا گیا ہے اور اس کے مقابل دوسرے صفحے پر اس کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس مرثیے کے پورے ۱۹۷ بند رقوم ہیں۔ اور ہر بند کے سامنے اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ صرف ایک بند کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ تقی عابدی نے بیان کی ہے۔ کہ بیشتر نسخوں میں یہ بند موجود نہیں ہے۔ اور آخر میں پورے مرثیے کو ایک اکائی جان کر اس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

تقی عابدی نے اس شاہکار مرثیے کے ہر بند کو بلاغت فصاحت، تشبیہات، مجاز مرسل، کنایات، صنائع لفظی، تمثیلات، ومحاورات، صوتی کیفیات۔ اسلوب حسن بیان۔ ترتیب و تسلسل حسن بندش، الفاظ کی روانی، صفائی عمدگی، شگفتگی وغیرہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ اس شاہکار مرثیہ کی منظر نگاری واقع نگاری، تمثیل نگاری۔ المیہ بیانی،، جدت نگاری اور سماجی عناصر کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے مرثیے کے ہر بند کے بارے

میں بتایا ہے کہ ان میں حروف کی تعداد کیا ہے کتنے الفاظ یا حروف اردو، عربی، فارسی زبان میں ہیں، کون کون سی تراکیب، استعارات، محاورے، کنایات وغیرہ کا ستعمال کیا گیا ہے۔ ہر شعر میں کتنی صنعتیں اور اضافتیں ہیں، اسلوب کیا ہے اور کتنی نئ بندشیں استعمال ہوئی ہیں وغیرہ۔

نمونے کے طور پر پہلے بند کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے:۔

جب قطع کی مسافت شبِ آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھو سوئے فلک شہہ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضہ سحری کو ادا کرو

اب یہاں سے اس بند کا ہو بہو تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے جو تقی عابدی نے پیش کیا ہے۔

بند مرثیہ 1

شعر نمبر ۱

کل الفاظ شعر ۱۵	کل الفاظ عربی ۵	فصاحت بلاغت بیان
کل الفاظ فارسی ۴	کل الفاظ اردو ۶	اچھوتا مضمون:- آفتاب کا مسافت شب کاٹنا
کل اضافات شعر ۲	''مسافت شب-رُخ بے	جدید سائنسی تحقیقات کے تحت خورشید نظام
کل تعداد حروف ۴۱	حجاب''	شمسی میں غیر متحرک ہوتے ہوئے کہکشاں
صنائع معنوی	ردیف-مردف	میں متحرک ہے۔ وہ اس نظریہ کے تحت رات
صنعت طباق ایجابی	**صنائع لفظی**	کے وقت بھی حرکت میں ہے۔
شب، سحر	صنعت مراۃ النظیر	**محاسن علم بیان**
	آفتاب رُخ، جلوہ حجاب	محاورہ جلوہ دکھانا، دیدار دکھانا،

شعر نمبر ۲

کل الفاظ شعر ۱۶	کل الفاظ عربی ۳	**فصاحت و بلاغت بیان**
کل الفاظ فارسی ۴	کل الفاظ اُردو ۹	واقعہ نگاری میں جب جزئیات کا تفصیل سے
کل اضافات شعر ۲	سوئے فلک-شہہ گردوں	بیان ہوتا ہے تو وہ مرقع نگاری کی مثال بن
کل تعداد حروف ۴۷		جاتا ہے۔ میر صاحب نے اس شعر میں ''سہ
ردیف مردف	**صنائع لفظی**	بعدی یا تھری ڈائمنشنل تصویر کشی کی ہے مڑ کر
	صنعت مراۃ النظیر - فلک گردوں	صدا دینے میں بلاغت ہے

شعر نمبر ۳

الفاظ شعر ۱۳	الفاظ عربی ۵	محاسن علم بیان کنایہ بعید۔ شبہ
الفاظ فارسی ۱	الفاظ اردو ۷	گردوں رکاب
اصنافات شعر ۳	حمد و ثنائے خدا فریضہ سحری	فصاحت و بلاغت بیان
تعداد حروف شعر ۴۲	ردیف مردف	امام حسین نے سب سے پہلے
صنائع معنوی		جس چیز کا حکم اور امت کو ہدایت
۱۔صنعت ایہام مرشحہ آخر		کی وہ حمد و ثنائے خدا اور فریضہ
رات ہے یہاں		سحری یعنی نماز ہے۔
آخر کے دو معنی نکلتے ہیں		
ایک رات ختم ہو رہی ہے دوسرے		**صنائع لفظی**
یہ کہ ندگی کی آخری رات ہے۔		۱۔صنعت مراۃ النظیر
۲۔صنعت طباق ایجابی رات -		حمد و ثنا خدا۔فریضہ سحری
سحر		۲۔مقلوب مستوی۔ادا (۲۰)

قارئین کی سہولت کیلئے مذکورہ بند میں استعمال کی گئی صنعتوں کے معنی یہاں رقم کئے جا رہے ہیں تا کہ قارئین کو دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شعر نمبر ۳

۱) **صنعت طباق ایجابی**:۔ سے مراد ہے کہ الفاظ متضاد ہوں لیکن صرف نفی جڑا ہوا نہ ہو۔ مثال کے طور پر اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار (خزاں اور بہار) (۲۱)

۲) **ایہام مرشحہ** :- جس میں معنی قریب کے مناسبات کا بھی کلام میں ذکر کیا جائے۔ (۲۲)

۳) **صنعت مراۃ النظیر** :- اس کو تناسب توفیق اور تلقین بھی کہتے ہیں اس کی ایک شکل صناع جگت کے نام سے مشہور ہے۔ کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جس کے معنی ایک دوسرے کے ساتھ ایک واقعہ ہو مگر نسبت تضاد۔ (۲۳)

۴) **کنایہ بعید**:- چند صفات جو بہ حیثیت مجموعی ایک موصوف کے ساتھ مختص ہوں ذکر کر کے موصوف کی ذات مراد لینا، اگر چہ وہ صفتیں جدا جدا دوسری چیزوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ (۲۴)

مقلوب مستوی:- یہاں پورا لفظ پورا فقرہ پورا مصرعہ یا پورا شعر الٹ جائے تو پھر وہی لفظ مصرعہ یا شعر پڑھا جائے۔ (۲۵)

تقی عابدی نے اس کتاب کی ترتیب کے دوراں ۳۸ سے زیادہ کتب سے استفادہ کیا ہے جن کی فہرست صفحہ ۵۲۷ تا ۵۴۷ پر درج ہے۔ اس فہرست کے مطالعے سے ڈاکٹر تقی عابدی کی جستجو ذوق وشوق اور حسن انتخاب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ماحصل یہ کہ تقی عابدی کو صنف مراثی سے والہانہ عشق ہے جس کا بین ثبوت یہ کتاب اور اس کا محققانہ تجزیہ ہے ان کی یہ کتاب ایک طرف انیسؔ شناسی میں بے شمار راہیں واہ کرتی ہے۔ تو دوسری طرف یہ ایک دستاویز کی حیثیت بھی اختیار کر گئی ہے جو تحقیق اور تنقید کا ایک بہترین امتزاج بھی ہے۔

چودھواں باب: ''مرثیے کے ترجمے'' کے عنوان سے ہے اس باب میں ڈاکٹر عابدی نے میر انیسؔ کے اس شاہکار مرثیے کے عربی اور انگریزی منظوم تراجم پیش کیے ہیں جس سے کتاب کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سید العلماء مولانا سید علی نقی کے نام سے تقریباً پورا عالم اسلام واقف ہے جنھوں نے اس مرثیے کے تیس (۳۰) بندوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو آج سے ۶۰ سال پہلے نظامی جنتری لکھنو نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عابدی نے اس پرانے کمیاب نسخے کو حاصل کر کے اپنی کتاب میں شامل کر کے قاری کو اس نسخے سے روشناس کرایا ہے۔

دوسرا ترجمہ امریکہ کے اُردو زبان کے استاد اور نامور دانشور ادیب پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز کا ہے جنھوں نے اس پورے مرثیے کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا ہے جو کتابی شکل میں THE BATTLE OF KARBALA کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز کی اجازت سے اس ترجمے کو اپنی کتاب میں شائع کیا ہے۔ ان عربی اور انگریزی تراجم کی وجہ سے یہ کتاب اُردو دان طبقے کے ساتھ ساتھ عربی اور انگریزی طبقے کی دلچسپی کا باعث بھی بن گئی ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ چودہ ابواب اور ۶۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ اہم کتاب اردو مرثیہ کے باب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے جو اردو ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہے۔ یہ کتاب انیس شناسی میں ایک اہم اضافہ بھی ہے جسے ڈاکٹر تقی عابدی نے عرق ریزی اور

ذوق وشوق کے ساتھ تحریر کر کے انیس سے متعلق بعض اہم حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔تقی عابدی کا یہ کارنامہ اُردوادب میں اہمیت کا حامل تو ہے ہی ساتھ میں انگری اورعربی ادب کا ذوق وشوق رکھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کاباعث ہے کیوں کہ انیسؔ کے اس مشہور ومعروف مرثیے کا انگریزی اورعربی ترجمہ شائع کر کے تقی عابدی نے کتاب کی قدر اورمنزلت میں مزید اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب نے دستاویزی حیثیت اختیارکرلی ہے۔

حواشی

(۱) تجزیہ یادگار انیس ۔جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے ۔از سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۲

(۲) ایضاً صفحہ نمبر ۱۶

(۳) تقی عابدی راقمہ سے انٹرویو کے دوران

(۴) تجزیہ یادگار انیس ۔جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے ۔از سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۷

(۵) تجزیہ یادگار مرثیہ-از سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۷

(۶) ایضاً صفحہ نمبر ۴۱

(۷) ایضاً صفحہ نمبر ۴۶

(۶) یہ اشعار یادگار مرثیہ کے صفحہ نمبر ۸۲ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

(۷) ایضا صفحہ نمبر ۹۸

(۸) ایضاً صفحہ نمبر ۹۹۔۹۸

(۹) ایضاً صفحہ نمبر ۱۰۱

(۱۰) ایضاً صفحہ نمبر ۱۰۲

(۱۱) ایضاً صفحہ نمبر ۳ ج ۱۰

(۱۲) ایضاً صفحہ نمبر ۱۰۴

(۱۳) ایضاً صفحہ نمبر ـ ۱۰۵

(۱۴) یضاً صفحہ نمبر ـ ۱۰۷ ـ ۱۰۶

(۱۵) ایضاً صفحہ نمبر ۱۲۶

(۱۶) ایضاً صفحہ نمبر ۱۱۴،

(۱۷) ایضاً (۱۹) ایضاً صفحہ نمبر ۲۸۵

(۱۸) صفحہ نمبر ۱۶۵،

(۱۹) ایضاً صفحہ نمبر ۱۸۱

(۲۰) ـ ایضاً صفحہ نمبر ۳۵۹، ۳۵۸

(۲۱) ایضاً صفحہ نمبر ۲۵۹

(۲۲) ایضاً

(۲۳) ایضاً صفحہ نمبر ۲۶۰

(۲۴) ایضاً صفحہ نمبر ۲۵۶

(۲۵) ایضاً صفحہ نمبر ۲۷۳

باب چہارم

تقی عابدی اور فیض فہمی

(الف)۔کلام فیض کی تعبیر نو

فیضؔ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ایک شاعر اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ ایک مخصوص عہد کی پیداوار تھے اُن کے یہاں وسیع تجربات و مشاہدات کی ترجمانی ہے یا یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اُن کا ایک مخصوص طریقہ اظہار ہے جس میں اِنقلابی اور جمالیاتی اوصاف اور تقاضے نہایت ہی پاکیزگی کے ساتھ نمایاں ہیں اُنہوں نے سماج کے غریب اور دبے کچلے عوام کی آہ فغاں سُنی اور اپنے دردمند دل سے اُن کی ترجمانی کی انہوں نے اِنسانی کرب کو اس طرح پیش کیا کہ اس میں فکر کے ساتھ ساتھ رومان بھی شامل کر دیا ہے۔فیض چونکہ ایک نامور اہل قلم ہیں اور اُن پر کُچھ لکھنے یا قلم اٹھانے سے ہی علمی قد اُونچا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کے تقریباً ہر اہل قلم نے فیضؔ کی شخصیت اور فکر وفن کے حوالے سے لکھا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے مگر اس کے باوجود کچھ گوشے ابھی بھی مخفی ہیں جن پر ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے قلم کے جوہر دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو کے مراکز سے دور رہنے کے باوجود اُردو ادب کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔اور اکثر اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں تا کہ کنیڈا اور امریکہ کے مختلف شہروں میں بھی اُردو کو مقبول بنایا جا سکے۔ پیشے کے لحاظ سے طبیب ہونے کے باوجود وہ ایک اچھے مقرر نقاد اور محقق ہیں اپنی مصروفیات کے باوجود وہ اکثر و بیشتر وقت کتابوں کے مطالعہ کے لئے صرف کرتے

ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی متعدد تصانیف منظر عام پر آ کر دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں اس حوالے سے اُن کی کتاب فیضؔ شناسی اور ان کی دوسری مرتب کردہ کتاب فیضؔ فہمی فیضیات کے حوالے سے کافی دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں فیضؔ فہمی میں اُنہوں نے مشاہیر اہل قلم کے مضامین شامل کیے ہیں جو تحقیق تنقید اور تبصرہ کی صورت میں ہیں ۔ اور فیض کی حیات اور فکروفن پر کسی نہ کسی زاویے سے روشنی ڈالتے ہیں دوسری کتاب فیض شناسی میں اُنہوں نے اپنے 40 سے زیادہ مضامین شامل کیے ہیں جس میں اُنہوں نے فیضؔ کے متعلق کئی نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے تحقیق کی نئی راہیں کھولی ہیں اور مطالعہ فیض کو نئے زاویوں سے دعوت دی ہے جسے ہم فیضؔ کے کلام کی تعبیر نو سے منسوب کر سکتے ہیں ۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو کئی مضامین ایسے ہیں جو کلام فیضؔ کو نئے زاویوں سے سمجھنے اور پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں مثلاً فیضؔ کی شاعری (تشریح ،تجزیہ ،تبصرہ) فیضؔ کی غزل کا مقام ،کلام فیضؔ عربی فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ فیضؔ کی نظم کی وسعتیں -کلام فیضؔ میں غلطیاں اور اسقام (منصفانہ تجزیہ) فیضؔ کا منظوم ترجمہ ''پیام مشرق'' تحقیقی مطالعہ۔فیضؔ کا مرثیہ امام-اے بسا آرزو کی خاک شُد۔فیضؔ کا غیر مدون کلام اور شام عزبت وغیرہ ایسے مضمون ہیں جن میں تشریح وتجزیہ کا رنگ غالب ہے۔

بے شک باقی شعرا کی طرح فیضؔ کی شاعری پر بھی اردو کے کئی بڑے شاعروں کے کلام کا اثر ہے جن میں میرؔ ،سوداؔ ،غالبؔ ،نظیرؔ ،انیسؔ ،حسرتؔ موہانی ،اختر شیرانی وغیرہ شامل ہیں اسی طرح کچھ مغربی شعرا کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جس میں براوئننگ ،کیٹس ، شیلے اور ہارڈی

وغیرہ کے نام اہم ہیں۔مگر غالبؔ کا اثر ان کے یہاں نمایاں نظر آتا ہے۔مثلاً

؎ لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلادے
وہ جام جومنت کشِ صہبا نہیں ہوتا

اور پھر:۔

؎ سجاؤ بزم غزل گاؤ جام تازہ کرو
''بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے''

دوسرے شعر میں غالبؔ کے شعر کا پورا مصرعہ استعمال میں لایا گیا ہے فیضؔ کی ابتدائی دور کی شاعری میں مغربی شعرا کی ہلکی سی رنگت محسوس کی جاسکتی ہے فراق گورکھپوری اپنے مقالہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں لکھتے ہیں کہ:۔

> فیضؔ اس لحاظ سے انگریزی رومانی شاعری سے بہت قریب ہوجاتا ہے کہ اس کی شاعری کی بنیادیں اپنے وقت اور اپنے زمانے کہ بعض اقدار پر قائم ہیں فیضؔ نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کیا۔ انھوں نے جس بصیرت افروز احساس خلوص اور فنکارانہ چابک دستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کرکے پیش کیا ہے۔ یہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے نئی اور قابل قدر بھی''۔(۱)

مجتبیٰ حسین اپنے ایک مضمون''سرخ بر سیاہ'' میں فیضؔ کی شاعری پر Yeats اور Eliot

کا اثر بتاتے ہیں۔اس طرح کلیم الدین احمد اور سیدہ جعفر نے بھی فیض کی نظم تنہائی پر آرتھر سائمن کی نظم بروکن ٹرسٹ (Broken Trust) اور ہارڈی کی (The Broken Appointment) کا اثر بتایا ہے پروفیسر آل احمد سرور فیض کو فراسٹ کے ساتھ مشابہت دیتے ہیں اور سلامت اللہ فیض کی نظم ''تنہائی'' کو شیلے سے مماثل قرار دیتے ہیں۔اسی طرح کئی دوسرے ناقدین و محقق نے فیض کو شیلے کے قریب بتایا ہے۔

مگر تقی عابدی نے فیض کے مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' میں شامل ایک نظم کو براؤننگ کے خیالات سے لبریز بتایا ہے۔ یہ نظم جہاں رومانی جذبے سے سرشار ہیں۔مگر حسن آرائی کا بھی عمدہ نمونہ نظم دیکھئے:

''مجھے دے دے!

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی حسین آنکھیں
کہ میں ایک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لئے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حسن سے ظلمات دنیا میں نہ پھر آؤں
گذشتہ حسرتوں کے داغ مرے دل سے دھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں

مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر وہ جادوئی سی نظر دے دے

فیض کی مشہور نظم موضوع سُخن کو تقی عابدی نے مجاز سے انقلاب کا راستہ بتایا ہے۔ جن میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں بھی موجود ہے:۔

''فیض کی مشہور نظم موضوع سخن'' ان کی شاعری کی بنیادی فکر کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔فیض نے یہاں رومان کا سفر کیا۔ یہ مجاز سے انقلاب کا راستہ ہے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی آمیزش ہے اس میں ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف بھی ہے۔ مسائل زندگی کے ساتھ ساتھ فلسفہِ زندگی بھی ہے۔ کہیں پر حُسن کی رونمائی ہے تو کہیں پر دُکھ درد کا میلا ہے۔ان دونوں مقامات پر شاعر کا مشاہدہ اور تجربہ بول رہا ہے''(۲)

چند اشعار دیکھیے:

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے! جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسن دلارا کی وہی دھج ہوگی

وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سے حِنا کی تحریر
اپنے افکار کی اشعار کی یہ دُنیا ہے یہی
جانِ مضمون ہے یہی شاہد معنیٰ ہے یہی

یہاں شاعر نے رومانی شاعری کی دنیا اور اس کا مضمون سب باندھ دیا ہے مگر پھر وہ یہ سوال کرتا ہے کہ کیا:-

ے اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن اُن کے سوا اور نہیں

تقی عابدی کے الفاظ میں اگر اس شعر کو سوالیہ انداز سے پڑھا جائے تو اس کا جواب ''ہے'' ہوگا اور اگر بیانیہ انداز سے پڑھا جائے تو ''نہیں'' ہی رہے گا۔

لیکن شاعر اپنا رُخ حسن آرائیوں سے موت اور زیست کی اور موڑ دیتا ہے۔

ے ان دمکتے ہوئے شہروں کی فرواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں حیا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں

جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

جیسا کہ اردو کا تقریباً ہر طالب علم اس بات سے واقف ہے کہ فیض کی ابتدائی دور کی شاعری میں رومانیت کا عنصر غالب ہے مگر جیسا کہ فیض نے خود بھی کہا ہے کہ رشید جہاں کے کہنے پر انہوں نے رومانی شاعری سے باہر نکل کر دنیا کے دکھ درد اور اپنی قوم و ملک کے دکھ درد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جس کا واضح ثبوت اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' ہے جس کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور درمیان میں ''نظامی گنجوی کے مصرعہ ''دلے بفروختم و جانے خریدم'' لکھ دیا ہے جس کے معنی ہیں کہ میں نے رومانی شاعری کا شہر بیچ دیا ہے اور اب سماجی زندگی کے شہر میں زندگی گذار رہا ہوں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فیض کا سفر رومان سے حقیقت اور انقلاب تک کبھی پورا نہ ہو سکا۔ اس کی بابت تقی یوں رقمطراز ہیں:۔

''فیض تمام عمر ایک پانوں رومانیت کی سرزمین اور دوسرا پانوں انقلاب کی سرزمین میں رکھ کر زندگی بسر کرتے رہے۔ فیض نے رومان اور انقلاب میں انتہا پسندی قبول نہیں کی ۔ وہ نہ اختر شیرانی کی طرح رومانیت میں مکمل غرق ہوئے اور نہ سردار جعفری کی طرح انقلاب کے ڈھنڈورچی بنے۔ فیض کی شاعری کی فصل رومان اور حقیقت کے سنگم کی زرخیز اور تازہ دریافت شدہ

زمین پر لگائی گئی ہے''(۳)

تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے واضح کیا ہے کہ نقشِ فریادی کے دوسرے حصے میں جہاں فیض نے ''دلے بفرد ختم و جانے خریدم'' لکھا ہے وہیں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس کے بعد خالص رومانی غزلیں اور نظمیں کہیں نہیں ملتی ہیں۔ جب کہ بعض غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جو خالص رومانی ہیں۔ جس کی واضح مثال انہوں نے ''دست صبا'' میں شامل نظم میرے ہمدم میرے دوست'' سے دی ہے جو رومانی موضوعات سے پُر ہے۔ اس نظم میں عشق کی حرکت کو محسوس ہی نہی بلکہ دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

؎ کیسے مغرور حسیناؤں کے بر فاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں
کیسے گل چیں کیلئے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

یہ نظم اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے اور اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تقی عابدی نے کتنی گہرائی سے فیضؔ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے کہ وہ اکثر ایک نئی بات سامنے لے آتے ہیں۔

تقی عابدی نے فیضؔ کی نظموں ،غزلوں اور قطعوں پر یکساں روشنی ڈالتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خواہ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں ہوں یا قطعے ہوں تغزل سے لبریز ہیں۔ یوں تو آج تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ ان کی غزلیں عمدہ ہیں یا پھر اُن کی نظمیں ۔

موضوعات کے حوالے سے بات کرتے ہو لکھتے ہیں کہ:-

وہ حمد ہو کہ نعت دعا ہو کہ مرثیہ وسوخت ہو کہ ترانہ گیت ہو کہ قوالی دلکشی دلربائی اورغنائیت ہر موضوع کلام کی جان ہے اسی وجہ سے فیض کا کلام زبان زدہ عام بھی ہے اور اسی نغمگی کی بنا پر اردو کے شعرا میں سب سے زیادہ ان کا کلام گایا بھی گیا ہے۔(۴)

مثال کے طور پر یہ قطعہ دیکھئے جو متذکرہ بالا اقتباس کی ترجمانی کرتا ہے:-

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی سی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

تقی عابدی نے اپنی بات کی تائید میں فیض کی حمد- دعا-نعت وغیرہ کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔تا کہ فیض کے انداز کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

تقی عابدی فیض کے لہجہ کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان کا لہجہ مشاہدے اور تجربے کی رنگت سے رنگین ہے اور آسانی کے ساتھ سمجھا جاتا ہے کیونکہ فیض نے زندگی کے فلسفہ پر نہیں بلکہ زندگی کے مسائل پر گفتگو کی ہے ان کی شاعری عزم اور حوصلے سے بلند ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:-

''فیض نے خارجی اثرات کو منظوم نہیں کیا بلکہ ان تجربوں اور مشاہدوں
سے پیدا ہونے والے داخلی اور قلبی واردات کو شعر میں ڈھالا۔ جس کا اثر تند
و تیز ہونے کے ساتھ دیرپا اور بیدار رہا۔ اور فیضؔ کا یہی تخلیقی عمل انھیں ایک
خاص مقام اور خاص لہجہ عطا کرتا ہے فیضؔ کے کلام میں افسردگی نہیں، آرزو
اور جستجو ہے۔ فیضؔ کی شاعری کے مطالعے سے ہمیں احساس کی شدت سچے
جذبوں کا خلوص اور عملی زندگی کی خواہش کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔'' (۵)

فیضؔ کے ڈکشن پر بات کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا ہے کہ فیض کا ڈکشن غالبؔ اور اقبالؔ کے ڈکشن کی توسیع ہے۔ اُن کی لفظیات روایتی کلاسیک لفظیات ہیں۔ فیضؔ نے اظہار کے لئے نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ نئے اظہاری پیرائے واضع کئے ہیں۔

تقی عابدی نے فیضؔ پر ہوئے تمام تنقیدی کام کو دقیق نظر سے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آج تک انھیں معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ مجموعی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا کہ نظم کے ان کی غزلیں زیادہ عمدہ ہیں یا ان کی نظمیں یا پھر قطعات۔ بقول تقی عابدی ''فیض کی ساری عمدہ نظموں کی قدر و قیمت اُن میں رچے بسے تغزل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے فیض کی بعض نظموں کو غزل مسلسل یا وہ غزل جو کسی عنوان سے منسوب ہو کہہ سکتے ہیں''۔

تقی عابدی نے فیض کے کلام کا شماریات پر مبنی تجزیہ بھی کیا ہے جس میں انہوں نے ان کی نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد بہت کم بتائی ہے۔ یعنی غزلوں کی تعداد ۸۰ اور

نظموں اور قطعات کی تعداد ۱۸۰ بتائی ہے۔اور ایک چارٹ کی صورت میں ان کے کلام کا شمار کیا ہے جس کو میں منِ وعن پیش کررہی ہوں تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

شعری مجموعہ	غزلیات	اشعار
نقش فریادی	۱۴	۷۹
دست صبا	۱۷	۱۱۴
زنداں نامہ	۱۵	۸۵
دست تہ سنگ	۱۱	٦۰
سروادیِ سینا	۷	۴۰
شام شہراں یاراں	۸	۴۴
مرے دل مرے مسافر	۳	۱۷
غبار ایام	۷	۳۹
کل تعداد	۸۲	۴۷۸

اس چارٹ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کل ۸۲ غزلیں لکھیں ،جن کے کل ۴۷۸ اشعار ہیں اور کتنی غزلیں کون سے مجموعے میں شامل ہیں ۔اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے:۔

''اگر ان غزلوں میں شامل غزل پیکر نظمیں نکال دی جائیں تو غزلوں کی تعداد ۷۰ سے بھی کم ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیضؔ نے پچپن سالہ

ریاضت میں صرف ستر (۷۰) کے لگ بھگ غزلیں کہیں ہیں جن کی تعداد
سال میں دو غزلوں سے بھی کم ہے۔ اردو کا کوئی دوسرا شاعر ہمیں نظر نہیں آتا
جس کی غزلیں فیضؔ کی غزلوں کی طرح مشہور ہوئی ہوں یا اس کثرت سے
گائی ہوں۔''(۶)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ فیضؔ کی غزلیں زبان زدِ عام ہیں اور کثیر تعداد میں گائی جا چکی ہیں اور یہ بات فیضؔ کی عظمت کی واضح دلیل بھی پیش کرتی ہے۔ تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری پر اختر شیرانی کے اثرات کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے ''نقش، فریادی'' میں شامل غزلوں کو نظموں کے مقابلے میں پھیکی قرار دیا ہے اور صرف ایک دو غزلوں کو ہی انکی قادر الکلامی کی مثال قرار دیا ہے۔

فیضؔ کی غزلوں میں جدیدیت اور کلاسکیت کی بات کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:۔

''فیض کی غزلوں میں بعض اشعار جدیدیت کے نقیب ہیں لیکن اغلب
اشعار حیرت انگیز حد تک کلاسیک اور روایتی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے کلاسیک
شعرا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فیضؔ نے ان غزلوں میں نہ صرف غزل کی
علامتیں اور ترکیبیں استعمال کی ہیں بلکہ جو زبان ہے اس پر بھی متقدمین اور
متوسطین کی گہری چھاپ ہے''۔ ۷

جہاں تک اساتذہ شعرا کی زبان کا تعلق ہے تو یہ ان کے اشعار میں استعمال کئے گئے پرانے الفاظ کھبو آ ؤ گے- جھٹلا ؤ گے جیسے الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ نے اساتذہ کی غزل سے بھی استفادہ کیا ہے مثال ذیل میں ہے:۔

ے نہ یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گِلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کھبو کی ہے

تقی عابدی نے ثابت کیا ہے کہ فیضؔ اور غالبؔ کے کلام میں مماثلت ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ یہ دونوں شاعر غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے شہید تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کے کلام میں سرشاری ہے اور دلیل کے طور پر دونوں کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

غالبؔ کہتے ہیں:-

ے ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دعا کرے کوئی

فیضؔ کہتے ہیں:-

بہت گراں ہے یہ عیش تنہا کہیں سبک تر کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق بھی تھی جس کے واسطے سے۔[۸]

تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعر کو ایک علحیدہ زاویے سے دیکھتے ہوئے اس کے متعلق ایک نہایت ہی عمدہ بات کہی ہے۔ جن کو میں انھیں کی زبان میں پیش کر رہی ہوں:۔

> ''فیضؔ نے پرانے ساغر میں نئی شراب پیش کی یعنی قدیم روایتی ہیئتی سانچوں اور علامتوں میں جدید موضوعات اور نئی حساسیت کو داخل کیا۔ فیضؔ نے غزل کو دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح متروک نہیں کیا بلکہ اسے نیا لہجہ دے کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیضؔ کی شاعری میں نظم کی طرح غزل بھی بڑی دلکش اور جاندار نمایاں ہوگئی''۔9

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ نے دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح سخت باغیانہ لہجہ نہیں اپنایا اور نعرے بازی نہیں کی۔ بلکہ فیضؔ کا دھیما اور با اثر لہجہ فیضؔ کی مقبولیت کا کارن بن گیا۔ جو کہ فیضؔ کی انفرادیت بھی ہے۔

تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کا ایک پہلو بروئے کار لاتے ہوئے مضمون تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے ان کے کلام میں پائے جانے والے عربی فارسی الفاظ اور تراکیب کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ فیضؔ کی غزلوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور ان ہی الفاظ کی ترکیبات کی بہتات ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل کے اشعار جن میں ان الفاظ کی بھر مار ہے اور روایتی زبان ہونے کی وجہ سے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ کیونکہ عوام معنی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ غزل تقی عابدی کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لئے ایک عمدہ مثال ثابت ہوسکتی ہے:۔

یاد غزال چشماں، ذکر سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا کنج قفس بہاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں
ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیم زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں
آئے گی فیضؔ اک دن باد بہار لے کر
تسلیم مے فروشاں پیغام مے گساراں

اس کے علاوہ فیض کی نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' بھی اسی حوالے سے ایک عمدہ مثال ہے، اس نظم کے متعلق تقی عابدی لکھتے ہیں کہ:-

''آج بازار میں پابجولاں چلو'' اس پندرہ مصرعوں کی نظم میں سترہ (۱۷) سے زیادہ فارسی کی تراکیب ہیں لیکن کہیں بھی فارسی کی ثقافت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ زبان کہیں بھی ابلاغ کے راستے میں حائل نہیں ہوتی'' ۱۰

تقی عابدی کا یہ شیوہ ہے کہ وہ ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی نئی بات نکال لیتے ہیں ان کا دیکھنے کا انداز ہی جداگانہ ہے وہ اکثر دوسروں سے ہٹ کر سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نکات کو ایک علیحدہ مضمون میں پیش کر کے انہوں نے آئندہ ریسرچرز کے لئے راہیں کھول

دی ہیں۔ اور یہ اردو ادب کے تئیں ان کے جذبے کا ثبوت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:-

"بعض تنقید نگاروں نے سہل پسندی اختیار کر لی ہے اب فن میں ہنر ڈھونڈنے کی دقیق نگاری مفقود ہو چکی ہے۔ ورنہ صرف فیضؔ کے واقعات کا طرح طرح سے بار بار ذکر کرنا فیضؔ شناسی کی مکمل تصویر نہیں۔

؎ جوہری بند کیے جاتے ہیں بازار سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے"۔(۱۱)

جہاں تک فیض کی نظموں کا تعلق ہے تو انہوں نے غزلوں کے مقابلے میں نظمیں زیادہ کہی ہیں لیکن اِن میں تغزل کی بھر مار ہے جس سے وہ عنوان دار غزلیں معلوم ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ تقی عابدی اور دیگر ادیب و نقاد اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ فیضؔ کی غزلیں زیادہ بہتر ہیں یا پھر نظمیں۔ لیکن تقی عابدی کے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پڑھا لکھا ادیب یا نقاد بعض اوقات ایک آدھ غزل یا شعر سے شاعر کی فنی حیثیت کو جاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

تقی عابدی نے اپنے ایک مضمون "فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام (منصفانہ تجزیہ) میں فیضؔ کے کلام میں راہ پا گئیں غلطیوں اور نقائص کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیائے ادب کے شعراء کی طرح اردو ادب کے شعرا کے کلام میں بھی زبان و بیان کی

غلطیاں موجود ہیں۔اور فیضؔ کے کلام میں بھی زبان و بیان کی کمزوریاں اور سقم موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی زبان و بیان محاورے الفاظ تراکیب اور قوافی کی غلطیاں نظر آتی ہیں جو میرے خیال میں بہت بڑی بات بھی نہیں ہے خیر تقی عابدی نے اس جانب توجہ دی یہ اہم بات ہے۔اس بابت وہ لکھتے ہیں:-

> ''بعض لوگوں نے فیضؔ کی شاعری کی زبان میں الفاظ کے ذخیرے کی محدودیت کا بھی ذکر کیا ہے۔فیضؔ کے کلام کے سلسلے میں بعض لوگوں کے ہمدردانہ روایہ سے نقصان بھی پہنچایا ہے''(۱۲)

البتہ اس موضوع پر اکثر محققین و ناقدین نے خامہ فرسائی کی ہے جس کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے تقی عابدی نے اکثر اعتراضات سے اتفاق کیا ہے۔اور جہاں پر وہ دوسروں کی بات سے اتفاق نہیں کرتے ہیں وہاں ان کی بات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے انصاف سے کام لیتے ہوئے ان کی بات سے انحراف بھی کیا ہے اور اپنی رائے بھی قائم کی ہے اور آخر میں اس بات کا بھی کھلے بندوں کہا ہے کہ فیض ایک بڑے شاعر تھے عظیم شاعر نہ تھے جن سے کوئی دبستان منسوب ہو۔

فیضؔ کے کلام میں موجود اسقام و اغلاط کے حوالے سے زیادہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کلیم الدین کے مضمون فیض سے ایک مثال پیش کر رہی ہوں تا کہ قارئین خود اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ واقع میں ہی ان کا کلام اس نقص سے پاک ہے یا نہیں۔ان کے مطابق

''نظم میرے ہمدم میرے دوست'' جو اچھی طرح شروع ہوتی ہے مگر اچھی نہیں رہتی جب وہ یہ لکھتے ہیں:-

گر مرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نُور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائین یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہوجائے

(اس کی دلیل کے طور تقی عابدی جواب میں لکھتے ہیں کہ:

''شعروں میں خون نہیں دوڑتا استعارے بھی غلط ملط ہو جاتے ہیں۔ حرف تسلی خیر دوا تو ہوسکتا ہے جس سے بیمار جوانی شفا ہو جائے لیکن اسی دوا سے تذلیل کے داغ بھی دُھل جاتے ہیں۔ اُجڑا ہو دماغ لہلہا اٹھتا ہے اور بےنور دماغ منور ہو جاتا ہے دوا ایک استعارہ ہے۔ اجڑا، بےنُور دماغ دوسرے استعارے ہیں اور یہ سب بری طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں)''(۱۳)

اسی طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے مضمون ''فیض کی غزل'' میں خامیوں کی طرف اشارہ کرے ہوئے لکھا ہے کہ ''بعض اشعار میں وجہ تشبیہ کا خیال نہیں رکھا گیا ہے مثلاً:-

؎ چاند دیکھا تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

اس پر تقی عابدی نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہونٹوں کو سُرخی کی بنا پر شفق سے تشبیہ دینا بالکل درست ہے مگر آنکھوں کو چاند سے کیا مناسبت۔ آنکھوں کا جام کہا جا سکتا ہے۔ (جام دیکھے تری آنکھوں میں) اور چہرے کو چاند کہنا درست ہے۔ (چاند دیکھا ترے چہرے پہ) (اعتراض غلط۔نظر چاہئے)۔(۱۴)

آخر میں تقی عابدی نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' شاعری لفظوں کا کاروبار ہے۔ یہاں کا سکہ ہی لفظوں کی شعبدہ بازی اور ان سے کھیلنا ہے یہاں کیا کہا جا رہا ہے صرف کافی نہیں بلکہ کیسے کیا جا رہا ہے وہ بھی اہم ہے یہ کہنا کہ:-

''ان کی شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہے اس دنیا میں صرف قید خانے ہیں اور نہ انسانی تصور ماتمِ آزادی تک محدود ہوسکتا ہے گریز پا سیاسی مسائل کے بیان میں اور نظریاتی وابستگی کی تفسیر میں اتنی ہمہ گیری نہیں ہوتی کہ وہ عام انسانی تصورات کی طرح وسیع الذیل بن سکے۔ اُن کے یہاں جو یکسانیت ہے وہ بالا آخر ذہن کو تھکا دیتی ہے۔ راقم ہی نہیں بلکہ جس کسی نے بھی فیضؔ کو پڑھا ہے وہ مانتا ہے کہ فیضؔ کا دائرہ شاعری بہت تنگ نہیں اگر چہ بہت وسیع بھی نہیں، ہمیں انتہا پسندی دوری اختیار کرنی چاہئے جس ناقد کو فیضؔ کا یہ معروف شعر:

ے وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

ایک اوسط درجے کا شعر محسوس ہوتا ہو تو اس کی اعلیٰ سطح کا معیار کہاں سے لائیں''۔۔۱۵

متذکرہ بالا حوالہ جات کے بعد یہ گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے کہ تقی عابدی کا موقف واضح کرنے کے لئے راقمہ کو زیادہ دلائل کی ضرورت ہے۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقی عابدی نے اس تلخ مضمون کے حوالے سے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے نہایت اہم اور مفصل مضمون تحریر کیا ہے جس طرح انہوں نے مختلف ناقدین و محققین کی آراء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضمون تحریر کیا ہے وہ اُن کی وسیع کاوشوں کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ فیضؔ کے کلام کو نئے سرے سے دیکھنے کی ایک اہم کوشش بھی ہے۔جس میں انہوں نے منصفانہ تجزیہ پیش کیا ہے تا کہ فیض کے کلام کی نئے سرے سے تعبیر ہو سکے۔

تقی عابدی نے اپنے تحقیقی مضمون کے ذریعے ہماری توجہ فیضؔ کے منظوم تراجم کی طرف بھی دلائی ہے جس سے یہ پتہ چلاتا ہے کہ فیضؔ نے دوسرے شعرا کے کلام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جن میں داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ ترکی کے معروف شاعر ناظم حکمت اور قازقستان کے ممتاز شاعر اولجبر عمر علی سیلمان کی بعض نظموں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ علامہ اقبال کے'' پیامِ مشرق'' کے انتخاب کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جس میں فیضؔ نے علامہ اقبالؔ کے فارسی قطعات غزلیات اور نظموں سے انتخاب کر کے منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ جواب

کمیاب ہے۔ بقول تقی عابدی فیضؔ نے پیام مشرق کا انتخاب خود کیا اور اس انتخاب میں پیام مشرق کے چار حصوں سے قطعات غزلیات اور نظموں کو چن کر ترجمہ کیا جو آسانی سے گرفت میں آ سکتے تھے۔ تقی عابدی نے اس حوالے سے کوئی قدیم یا جدید سند دریافت نہیں کی ہے بلکہ کچھ مصرعوں کی تقطیع اور بعض اشعار کے مصرعہ دوم سے ثابت کیا ہے کہ یہ رباعیات نہیں بلکہ قطعات ہیں بر حال تقی عابدی کی یہ کاوش فیضؔ کو بطور منظوم ترجمہ نگار کی حیثیت سے جاننے سمجھنے اور پڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔

اردو کے کئی دوسرے شعرا کی طرح فیضؔ نے بھی بنام ''مرثیہ امام'' ایک مرثیہ لکھا جو ۱۲ بند یعنی بہتر مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس کی سن تصنیف، سن اشاعت اور موضوع کے حوالے سے تقی عابدی نے لکھا ہے کہ:-

> ''یہ مرثیہ اگر چہ ۱۹۶۴ء میں لکھا گیا ہے لیکن ۱۹۷۸ء میں ''شام شہر یاراں'' میں شائع ہوا۔ اس مرثیے میں فیضؔ نے جدید تجربات کئے ہیں جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں یہ مرثیہ پہلے بند سے آخری بند تک موضوع کے لحاظ سے حدود مرثیہ میں شامل ہے اگر چہ اس میں کلاسیکی مرثیے کے اجزاء نظر آتے ہیں لیکن بعض اجزاء کی چھاپ ضرور دکھائی دیتی ہے''۔(۱۶)

مرثیہ کا مطلع یوں ہے:-

؎ جب زلف کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات یہ عجب آفت آئی

نوٹ:۔یہ مطلع تقی عابدی کی کتاب فیض فہمی سے اخذ کی گیا ہے۔

اُردو ادب کے طالب علموں نے فیض کو اکثر ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھا پڑھا اور سمجھا ہے اور آج بھی یہی چلن عام ہے مگر تقی عابدی نے فیض کے اس مرثیہ کا تجزیہ پیش کر کے فیض کو بحثیت مرثیہ نگار دیکھنے کی دعوت دی ہے تا کہ فیض کو محض غزلیہ اور نظمیہ شاعری کے دائرے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ بحثیت مرثیہ نگار بھی ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے۔ جبکہ ناقدین اور محققین نے فیض کے اس پہلو کو تقریباً انداز ہی کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے ایک مضمون بنام ''اے بسا آرزو کہ خاک شُد'' میں جیسا کہ خود عنوان سے بھی ظاہر ہے فیض کی تحریروں جن میں خطوط تحریریں، تقریریں اور انٹرویوز وغیرہ شامل ہیں کی مدد سے وہ نکات بیان کئے ہیں جو پورے نہ ہو سکے اور نہ وہ کر سکے۔

۔بقول فیض ''کچھ چیزیں جو تکمیل کے قریب پہنچیں تھیں لیکن شائع نہ ہو سکیں اور کچھ کا ارادہ کیا تھا مگر کر نہ سکے''۔ راقمہ نے پہلے ذیلی باب میں اس کی تفصیل پیش کر دی ہے لحاظہ یہاں گریز کیا جا رہا ہے۔

تقی عابدی نے خطوط تحاریر اور انٹرویوز کی مدد سے ایسے ایسے نکات کو سامنے لایا ہے جن پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ تقی عابدی نے فیض کی ایک نعت کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جو فارسی میں

ہے۔اور فیضؔ کے مجموعہ ''غبار ایام'' میں شامل ہے۔لحاظہ انہوں نے قارئین کی توجہ فیضؔ کی شاعری کے اس پہلو پر بھی مبذول کرائی ہے یہاں تک کہ انہوں نے فیض کی تمام تر تخلیقات کی فہرست معہ مطبع و حوالہ پیش کی ہے۔اور پھر کونسا مضمون مجموعہ ڈرامہ ،تقریظ تحریر تقریر کس نام سے اور کہاں سے چھپی اس کی بھی مکمل تفصیل دی ہے۔ جو آئندہ تحقیق کاروں کے لئے مشل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔تا کہ فیضؔ کے حوالے سے کوئی گوشہ مخفی نہ رہ جائے۔

کلام فیضؔ کے حوالے سے تقی عابدی کا سب سے اہم کارنامہ ان کا مضمون بنام ''فیض کا غیر مدون کلام'' ہے جس کے حوالے سے تقی عابدی یوں راقم طراز ہیں:-

> ''فیض نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ انھوں نے اپنا ابتدائی کلام کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ اگرچہ فیض نے ہائی اسکول میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی لیکن کالج کے ابتدائی سالوں میں مشاعروں میں شرکت کرتے اور رسالوں میں بالخصوص کالج مگیزین ''راوی'' میں چھپے بھی تھے۔اگر ان رسالوں اور مجلوں سے فیضؔ کا مطبوعہ کلام جمع کیا جائے تو فیضؔ کی باقیات ترتیب دی جاسکتی ہے جو آئندہ نسلوں کے نقادوں اور محققوں کے لئے اُن کے فن کے ارتقاء کی راہ مشعل بن سکتی ہے''۔(۱۷)

تقی عابدی نے فیضؔ کی تصانیف کی جدول میں تقریباً ۴۰ غزلوں ،نظموں،قطعوں اور گیتوں کے حوالے دئے ہیں۔ جو فیضؔ کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔لیکن مطبوعہ شکل

میں مختلف رسالوں اور کتابوں میں موجود ہیں۔ جواب نایاب ہیں۔ تقی عابدی نے اپنی انتھک کوششوں کے باوجود سولہ سترہ غزلیں، نظمیں، قطعے اور گیت حاصل کئے ہیں جن کو انھوں نے مِن وعن پیش کر دیا ہے۔ اس غیر مدون کلام میں پنجابی، انگریزی کلام کے علاوہ کچھ تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کلام میں ایک سہرا بھی شامل ہے یہاں تقی عابدی کے موصول کردہ غیر مدون کلام کی کچھ جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ تا کہ قاری کو خود اندازہ ہو سکے۔ ا کہ تقی عابدی نے غیر مدون کلام کو بحث کا موضوع بنا کر فیضؔ کے متعلق ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ''یہاں پر منیرہ کی سالگرہ'' (فیض کی چھوٹی بیٹی ۱۹۵۰) پر لکھے گئے چند مصرعے پیش کر رہی ہوں:-

ایک منیرہ ہماری بیٹی ہے
جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے
ہم ہی کب اس کو پیار کرتے ہیں
سب کے سب اس کو پیار کرتے ہیں
کیسے سب کو نہ آئے پیار اس پر
ہے وہی تو ہماری ڈیکٹیٹر
پیار سے جو بھی جی چرائے گا
وہ ضرور اس سے مار کھائے گا

خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے

ویسے سچ مچ بہت وہ اچھی ہے۔ ۱۸ے

(۲) تین گیت قلم ''دور ہے سکھ کا گانو'' (۱۹۶۹)

(ا) گیت

پنکھی راجا رے پنکھی میٹھا بول

جوت جگی ہر من میں

بھنورا گونجے ڈالی جُھومے

بستی باڑی بن میں

جوت جگی ہر من میں

ندیا رانی رے

ندیا میٹھا بول

گھات لگی ناؤ

رات گئی سکھ جاگا

پائل باندھو ناچو گاؤ

گھاٹ لگی ہر ناؤ

ندیا رانی میٹھا بول

سندر گوری رے

سندر گوری میٹھا بول

جیوے روپ جوانی

بات کرے تو پھول کھلیں

اکھیاں اک کہانی

جیسے دور سے تارا چمکے

چمکے روپ جوانی

جیوے روپ جوانی

جوت جگی ہر من میں

پنکھی راجا میٹھا بول ندیا رانی سُندر گوری ۔۱۹

(۲) گیت

سکھی رہے تیری رات چندا سُکھی رہے تیری رات

دور ہے چین کی نگری چندا دور ہے سکھ کا گانو

جانے کیسے راہ کٹے گی ہارے تھک تھک پانو

اوٹ میں بیٹھے بیری چندا۔ تھام لے میرا ہاتھ

سکھی رہے تیری رات

تیری دیا سے دیپ جلا ہے اس پاپن کے دوارے

جانے کیسے بھاگ جگے ہیں بھول گئے دُکھ سارے

من کانپے جی دھڑکے چندا جھوٹ نہ جائے ساتھ

سُکھی رہے تیری رات

(۳) گیت

بجھ گیا چندا لٹ گیا گھر باتی بُجھ گئی رے

دیا راہ دکھاؤ

موری باتی بجھ گئی رے کوئی دیپ جلاؤ

رونے سے کب رات کٹے کی ہٹ نہ کرو من جاؤ

منوا کوئی دیپ جلاؤ

کالی رات سے جوتی لاؤ

اپنے دکھ کا دیہ بناؤ

ہٹ نہ کرو من جاؤ

منوا کوئی دیپ جلاؤ

اقبال (سنہ ۱۹۳۱)

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظار موت کرتا تھا عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انسان م میں

بساط مہر پر گویا سکوت مرگ طاری تھا صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزم ویراں میں

رگِ مشرق میں خون زندگی تھم تھم کے چلتا تھا خزاں کا رنگ تھا گلزار ملت کی بہاروں میں

فضاء کی گود میں چُپ تھے سحر انگیز ہنگامے شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں گلزاروں میں

سنی واماندہ منزل نے آوازِ درا آخر ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی

مے غفلت کے ماتے خواب دیرینہ سے جاگ اٹھے خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خودفراموشی

عروقِ مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا، مردہ مشت خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے

زمین سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے

بنود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے

ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے ہر اک ذرے کو ہم روش ثریا کر دیا تو نے

فروغ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں زجاج زندگی کو آتش دوشیں سے بھر ڈالا

طلسم کن سے تیرا نغمہ جاں سوز کیا کم ہے کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

نوحہ:-(صحافی محمد اختر کے انتقال پر ۱۹۵۹ء)

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تسکین نہیں اور آس بہت ہے
امید یار نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

سہرا:
(بہ مناسبت خانہ آبادی طاہر او یاسمین امتیاز ۱۹۶۲)
سجاؤ بزم در مے کدہ کشادہ کرو
اٹھاؤ ساز طرب اہتمام بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے چراغ کافی نہیں
سجاؤ بزم کہ رنج والم کے زخم سلے
بساطِ لطف و محبت پہ آج یار ملے
دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤ کہ وقتِ نیک آیا
رُخ عزیز پہ سہرے کے آج پھول کھلے
اُٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مدام ہے
شبِ نشاط و بساطِ طرب دوام رہے

تمہارا صحن منور ہو مثلِ صحن چمن

اور اس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

شامِ غم

ہر گھڑی رخ یار لیے پھرتی ہے۔

کتنے مہ تاب شب تار لیے پھرتی ہے۔

سن تو لو دیکھ تو لو مانو نہ مانو اے دل

شامِ غم سینکڑوں اقرار لیے پھرتی ہے

ہے وہی حلقۂ موہوم مگر موجِ نسیم

تار گیو میں خم دار لیے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن

ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے۔

نوٹ: مذکورہ تمام بند تقی عابدی کی کتاب فیض فہمی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اسکے علاوہ لیلۃ القدر (ترجمہ عمر علی سلیمان)

او میرے وطن (ترجمہ ناظم حکمت) بھوکوں کی آنکھیں (ترجمہ: ناظم حکمت) جیل سے ایک خط (ترجمہ ناظم حکمت) مجھے موجزوں پہ یقین نہیں (ترجمہ رسول حمزہ توف) خواب

پریشان یہ فیضؔ کی انگریزی نظم تھی جس کا ترجمہ انجم اعظمی نے کیا ہے۔ اور ''اے وطن اے وطن''، وغیرہ شامل کتاب ہیں۔ تقی عابدی نے نہایت ہی محنت اور لگن سے کسی حد تک فیضؔ کے غیر مدون کلام کو یکجا کر کے فیضؔ فہمی میں پیش کیا۔ جو یقیناً ایک محنت طلب کا کام ہے۔

ڈاکٹری تقی عابدی اردو ادب کے ایک ایسے شیدائی ہیں جو تن من دھن سے اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی دو کتابوں فیضؔ فہمی اور فیضؔ شناسی میں بڑی تعداد میں مضمون لکھ کر شائع کئے ہیں جو فیضؔ کے حوالے سے نئی سمتوں کا پتہ دیتے ہی وہ اپنے عہد کے ایک پرعزم اور پروقار محقق و نقاد ہیں جو اپنی دیدہ بینی اور عرق ریزی سے کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور دریافت کر لیتے ہیں ان کی تحقیق اردو کے طالب علموں کو تحریک دیتی ہے اور جلا بھی بخشتی ہے۔

انہوں نے فیضؔ فہمی میں فیضؔ کے ان تمام گوشوں خواہ ان کی نثری تحریریں ہوں یا منظوم تقی عابدی نے اپنے گہرے مطالعے کی سے اپنی بات کو منوانے کی پوری کوشش کی ہے یہی نہیں اسی شیریں کلامی کی وجہ سے انہوں نے قاری کو فیضؔ کے کلام کو نئے سر سے پڑھنے اور کھوجنے کی دعوت بھی دی ہے جس پر آنے والی نسلیں یقیناً غور کریں گی۔

حواشی:

۱۔ بحوالہ فیض فہمی از۔ سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۰
۲۔ (ایضاً صفحہ نمبر ۹۱)
۳۔ (ایضاً)
۴۔ (ایضاً صفحہ نمبر
۵۔ (ایضاً صفحہ نمبر ۹۳)
۶۔ فیض فہمی از۔ سید تقی عابدی۔ صفحہ نمبر ۱۲۴
۷۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۲۷
۸۔ (بحوالہ فیض فہمی از۔ سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۳۲)
۹۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۵
۱۰۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۶۵
۱۱۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۶۸
۱۲۔ (فیض فہمی از۔ سید تقی عابدی ص ۵۱۷)
۱۳۔ بحوالہ فیض فہمی، از۔ سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۵۱۹

۱۴ بحوالہ فیض فہمی از۔سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۵۲۳

۱۵ فیض فہمی -از۔سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۵۳۲

۱۶ ایضاً صفحہ نمبر ۸۵-۱۰۸۴

۱۷ فیض فہمی - از۔سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۱۳۸۷

۱۸ فیض فہمی -از۔سید تقی عابدی صفحہ نمبر ۷

۱۹ ایضاً ۱۳۹۰

(ب)۔تقی عابدی اور تنقید فیضؔ

ڈاکٹر تقی عابدی اکیسویں صدی کے وہ مصنف و مؤلف اور تحقیق کار ہیں جن کے مطالعہ فیضؔ نے اہلِ علم کی آنکھیں کھول دی ہیں۔فیضؔ کے حوالے سے ''فیضؔ فہمی'' اور'' فیضؔ شناسی'' اُن کے دو اہم کارنامے ہیں اگر دیکھا جائے تو اردُو ادب کی تاریخ میں کئی فیضؔ نمبر مختلف رسائل نے شائع کئے ہیں اور گراں قدر کتب بھی منظر عام پر آئی ہیں مگر تقی عابدی نے فیضؔ پر دستیاب تمام کتب اور مضامین کا باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد فیضؔ کے فن پر مختلف ادیبوں کے مضامین کو یکجا کر کے ضخیم کتاب مرتب کر کے فیض شناسی میں اہم اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''فیضؔ فہمی'' 1424 صفحات پر مشتمل ہے جو سال 2011 میں ''دی ریکونر پبلی کیشن لاہور پاکستان اور ملٹی میڈیا افیئر پاکستان سے شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کو تقی عابدی نے فیضؔ کے دوستوں ''پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام منسوب کیا ہے جن کا سایا فیضؔ کی طرح سرحدوں کے دونوں جانب ہے اور یہ دونوں دو ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں:

؎خیال یار کبھی ذکر یار کرتے ہیں
اسی متاع پہ ہم روز گار کرتے ہیں
(فیضؔ)

فیضؔ پر شائع ہونے والی کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''انسائیکلو پیڈیا'' کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب میں کل 162 مضامین و مقالات شامل کیے گئے ہیں جن میں (42) مضامین خود تقی عابدی کے ہیں ان مضامین کے تحت فیضؔ کی شعری ونثری تخلیقات حیات و کائنات اور مختلف جہات کے تمام پہلوؤں پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقی عابدی نے بڑی جستجو اور کاوشوں کے بعد فیضؔ اور اُن کے متعلقین کی تصاویر جمع کی ہیں جن سے فیضؔ ان کے خاندان اور ان سے منسلک کئی دوسری اہم شخصیات کو دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب فیض فہمی کی وجہ تالیف کے سلسلے میں تقی عابدی لکھتے ہیں:

''فیضؔ کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر فیضؔ فہمی پر یہ دستاویز اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی گئی ہے تا کہ فیض کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اقدار کا یہ زاویۂ نظر سے جائزہ لیا جا سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ فیضؔ کی حیات اور اُن کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ان کی شاعری کی طرز فغاں اور ان کی نثر کی طرز بیاں پر سیر حاصل کام نہ ہو سکا بلکہ کچھ قدیم تنقیدی تشریحی تفسیری اور تجلیلی تحریریں تکراری صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ اس کتاب میں حتی المقدور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ ہمارا مقصد چونکہ ایک مستند دستاویز کی تصنیف اور تالیف ہے اس لیے درجنوں جدید مضامین کے علاوہ اس میں ان تمام مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے جن سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہوسکیں اور یہ کتاب مصنّفین محققین اور اسکالرز کے لیے سودمند اور مددگار بن سکے۔ ہم نے دانستہ طور پر فیض فہمی میں اُن مضامین کو شامل نہیں کیا جن میں گزشتہ قدیم مطبوعہ مقالوں اور مضامین کے بہت سے حصوں کو قینچی اور گوند کی مدد سے کسی حوالے کے بغیر پیش کیا گیا تھا۔ ہمیں تکرار اور مضمون نگار کی تنقید گوارہ نہ تھی۔ کیونکہ بہرحال فیض فہمی میں وہ اصلی مضامین موجود ہیں اس دفترِ فکرونظر میں وہ مضامین بھی نظر آئیں گے جس میں فیض شناسی سے زیادہ مضمون نگار کی خود شناسی موجود تھی۔'' (1)

مذکورہ اقتباس میں تقی عابدی نے بذاتِ خود ان تمام نکات کی طرف اشارہ کردیا ہے جو فیض فہمی کے لیے ضروری تھے۔ فیض فہمی میں تقی عابدی کے خود اکتالیس (41) مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین ان موضوعات پرتحریر کیے گئے ہیں جن پر کام کم یا پھر ہوا ہی نہیں تھا۔ جن میں مضمون کی اصلیت حوالوں کی صداقت کتابت کی صحت اور طباعت کی نفاست کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ خود تقی عابدی نے بھی لکھا ہے ''تا کہ اس خوبصورت صحیفہ کو محرابِ فن میں سجایا جاسکے''۔

فیض فہمی میں کل (162) مضامین شامل ہیں جن میں سے (121) مضامین دیگر افراد کے ہیں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔ مضمون کے اختصار کو دھیان میں رکھتے ہوئے تمام مضامین کا جائزہ پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے کیونکہ فیض پر ان افراد کے کام کے حوالے سے گزشتہ ذیلی باب میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان تمام افراد کے مضامین بشمول اسماء ذکر کر دیئے جاتے ہیں تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کن کن شخصیات نے فیض فہمی کے ابواب میں اپنی رشحات قلم صرف کیے ہیں اور کتاب کو معنی خیز درجہ عطا کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون ''فیض کو کیسے نہ پڑھیں (ایک پس ساختیاتی رویہ) پروفیسر سید اختشام حسین کا مضمون ''فیض کی انفرادیت۔ پروفیسر کلیم الدین کا مضمون ''فیض'' پروفیسر خلیل مرزا بیگ کا مضمون ''فیض کی شعری اسلوبیات (تسلسل بیان اور معنیاتی وحدت) محمد صفدر میر کا مضمون ''فیض کا نظریہ سخن'' پروفیسر شارب رودلوی کا مضمون ''فیض کی شعری جہات اور تعین قدر کا مسئلہ''

شمس الرحمٰن فاروقی	فیض اور کلاسیکی غزل
پروفیسر آل احمد سرورؔ	فیض سے فیض تک
پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی	فیض کی نظم
ڈاکٹر شان الحق حقی	سروادیٔ سینا کی غزلیں
جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی	زنداں نامہ کا سرسری جائزہ

ڈاکٹر نصرت چودہری	فیض احمد فیض کی شاعری کا لسانی پہلو
سید سجاد ظہیر	کچھ دست صبا کے بارے میں
پروفیسر سیدہ جعفر	فیض احمد فیضؔ کی شاعری
ڈاکٹر ضیاء الحسن	فیض احمد فیضؔ کی غزل گوئی
ابن فرید	فیضؔ بہ حیثیت رومانی شاعر
پروفیسر ابوالکلام قاسمی	نظم گوئی میں فیض احمد فیضؔ کے امتیازات
ظفر اقبال	فیض احمد فیضؔ کی شاعری
ستار طاہر	فیضؔ صاحب کی ایک نظم
ڈاکٹر سید محمد عقیل	فیضؔ صاحب کا نظریۂ شاعری اور اس کی تطبیق
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	فیضؔ کا فنِ شاعری
آغا سہیل	فیضؔ کی شاعری کا زندہ لفظ
ممتاز حسین	دست صبا
پروفیسر شمیم حنفی	فیض احمد فیضؔ کی شاعری
ڈاکٹر سلام سندیلوی	فیضؔ کی غزل
ڈاکٹر وزیر آغا	غالب اور فیضؔ
ڈاکٹر عنوان چشتی	توسیع روایت کا شاعر

پروفیسر محمد علی صدیقی	غالبؔ، جوشؔ اور فیضؔ تین آوازیں تین لہجے
ڈاکٹر مسعود حسین	فیض احمد فیضؔ
ڈاکٹر سلیم اختر	معتدل گرمی گفتار کا غزل گو
نسیم احمد عباسی	فیضؔ احمد فیض (شخصیت اور شاعری)
پروفیسر جمیل جالبی	فیضؔ ایک تقابلی مطالعہ
ڈاکٹر عتیق احمد	فیضؔ کا ذہنی سفر اور سمتِ فکر
ظہیر صدیقی	فیضؔ کی نظریاتی شاعری (فن کے نقطہ نظر سے)
ڈاکٹر ابو محمد سحر	فیضؔ نقشِ فریادی کی روشنی میں
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	فیضؔ اور جدیدیت
پروفیسر گوپی چند نارنگ	فیضؔ کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام
ڈاکٹر تبسم کاشمیری	جدید اردو شاعری میں علامت نگاری
پروفیسر محمد علی صدیقی	فیض احمد فیضؔ اور روایتی شعری زبان
پروفیسر محمد رئیس	فیضؔ کی غزل
پروفیسر مجید بیدار	سکندر علی وجد اور فیضؔ کے باہمی تعلقات
شاد عارفی	زنداں نامہ ایک تاثر
پروفیسر مجتبیٰ حسین	سرخ بر سیاہ

پروفیسر سحر انصاری   فیض ایک نثر نگار

ڈاکٹر صلاح الدین حیدر   میزان ایک مطالعہ

ڈاکٹر اشفاق سلیم مرزا   فیض کے شعری و ادبی میلانات

فیض احمد فیض   ادب کا ترقی پسند نظریہ

فیض احمد فیض   جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے

ڈاکٹر سلیم اختر   معتدل گرمی گفتار کا غزل گو

نسیم احمد عباسی   فیض احمد فیض (شخصیت اور شاعری)

پروفیسر جمیل جالبی   فیض ایک تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر عتیق احمد   فیض کا ذہنی سفر اور سمت فکر

ظہیر صدیقی   فیض کی نظریاتی شاعری (فن کے نقطہ نظر سے)

ڈاکٹر ابو محمد سحر   فیض نقشِ فریادی کی روشنی میں

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید   فیض اور جدیدیت

پروفیسر گوپی چند نارنگ   فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام

ڈاکٹر تبسم کاشمیری   جدید دور شاعری میں علامت نگاری

پروفیسر محمد علی صدیقی   فیض احمد فیض اور روایتی شعری زبان

پروفیسر حمد رئیس   فیض کی غزل

پروفیسر مجید بیدار	سکندر علی احمد اور فیض کے باہمی تعلقات
شاد عارفی	زنداں نامہ ایک تاثر
پروفیسر مجتبیٰ حسین	سُرخ بر سیاہ
پروفیسر سحر انصاری	فیضؔ ایک نثر نگار
ڈاکٹر صلاح الدین حیدر	میزان ایک مطالعہ
ڈاکٹر اشفاق سلیم مرزا	فیضؔ کے شعری و ادبی میلانات
فیض احمد فیضؔ	ادب کا ترقی پسند نظریہ
فیض احمد فیضؔ	جوش شاعری انقلاب کی حیثیت سے
فیض احمد فیضؔ	محصور بیروت کی ایک جھلک
فیض احمد فیضؔ	ایک یادگار تقریر
الیگزینڈر رسر کوف (ترجمہ پروفیسر سحر انصاری)	ایک حوصلہ مند دل کی آواز
ڈاکٹر بیدار بخت	کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
پروفیسر کرار حسین	فیضؔ عظیم شاعر، عظیم انسان
انتظار حسین	فیضؔ قرب و دوری کا کرشمہ
سلیم ہاشمی	محبت کا رشتہ

منیزہ ہاشمی	Do You also write poetry
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	فیض سے میری پہلی ملاقات
مالک رام	فیض
اندر کمار گجرال	بہ یادِ فیض
علی عباس حسینی	شاعر باعمل
فارغ بخاری	فیض کی باتیں فیض کی شاعری
کرشن چندر	فیض سے ملاقات
سید سبط حسین	فیض کا آدرش
افتخار عارف	ہمارے فیض صاحب
علی سردار جعفری	لکھنو کی ایک رات
ایلس فیض	فیض احمد فیض
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	فیض شاعر انسانیت
ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب	فیض اور شکیب (لندن کی دلکشی)
کشمیری لال ذاکر	فیض کی شاعری ہی محبوب کا تصور
قدر اللہ شہاب	بہ یادِ فیض
قرۃ العین حیدر	سرودِ شبانہ

مصنف	عنوان
شاہد احمد دہلوی	فیضؔ صاحب
کنہیالال کپور	پھر نظر میں پھول مہکے
فقیر وحید الدین	یادیں فیض احمد فیضؔ کی
ضیا ساحد	ادبی محبتیں
کرنل انور احمد	My Undertanding of Fiaz
Shoaib Hashmi	A Song for this day
امین الرحمٰن	فیضؔ کا کلام موسیقی کے روپ میں
مرزا ظفر الحسن	نغماتِ فیضؔ
آئی۔اے۔رحمٰن	فیضؔ مثالی ایڈیٹر
خالد حسین (ترجمہ۔قرۃ العین حیدر)	میرے دل میرے مسافر
مظہر امام	فیضؔ کی تنقید ریگ لہراتی ہوئی
ن۔م۔راشد	مقدمہ (نقش فریادی)
ڈاکٹر ملک راج آنند (ترجمہ: سید رضا کاظمی)	فیضؔ: ایک پیاری: عظیم شخصیت
ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	صلیبیں میرے دریچے میں (ایک مُطالعہ)
ڈاکٹر صادق نقوی	تاریخ اور ادب کے باہمی ربط
پروفیسر وہاب اشرفی	فیض اور ان کے غیر ملکی معاصرین

ظفر اللہ پوشنی	فیض اور زنداں
ڈاکٹر ہلال نقوی	فیض کا ایک مکمل مرثیہ اور ایک مکمل سوز
فیض احمد فیضؔ	فلم اور ثقافت
ڈاکٹر خلیق انجم	فیضؔ بستی
خواجہ احمد عباس	فیض احمد فیضؔ
مشتاق احمد یوسیفی	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
لدمیلا واسی لیوا	کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا
شبنم شکیل	یہ جان تو آنی جانی ہے
ڈاکٹر سید حرمت الاکرام	فیضؔ جوش نوا
عبداللہ ملک	فیضؔ کے بارے میں ایک گفتگو
ندیم ہاشمی	فیض احمد فیضؔ - باکمال شخصیت
ڈاکٹر ایوب مرزا	ہم کے ٹھہرے اجنبی
عابد حسن منٹو	فیضؔ ۔صد سالہ یوم پیدائش
روشن ندیم	مابعد فیضیات کا سماجی سیاسی پس منظر
ڈاکٹر رؤف خیر	لفظیات فیضؔ
پروفیسر انیس اشفاق	فیضؔ کی شاعری میں صبا کی علامت

پروفیسر ارتضی کریم	فیضؔ کا تنقیدی رویہ
ظ۔انصاری	کچھ تذکرہ کچھ تبصرہ
عارف نقوی	فیضؔ احمد فیض
ڈاکٹر شوکت سبزواری	شاعرِ حیات وکائنات
سید سجاد ظہیر	شخص وعکس
پروفیسر فتح محمد ملک	حمد باری (فیض احمد فیض کی نظم)
محمد اعجاز خاور	فیضؔ اور خدا شناسی
پروفیسر عبدالقوی ضیا	فیضؔ کنیڈا میں
عبدالرحیم انجان	ٹورانٹو میں فیضؔ کی آمد
قاضی جاوید	افتادگانِ خاک کا شاعر
پروفیسر سحر انصاری	فیضؔ اور فلسطین
یاسر عرفات	فیضؔ میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے
ڈاکٹر احمد علی خان	فیضؔ ایک صحافی

مذکورہ تمام افراد نے فیض کی کائنات شاعری حیات ونظریات کو بہت ہی مبسوط پیرائے اظہار میں پیش کیا ہے۔

اب یہاں سے تقی عابدی کے اُن مضامین کا مختصراً خاکہ پیش کیا جائے گا تا کہ فیضؔ فہمی

اور فیض شناسی میں ان کے امتیازات واضح ہوسکیں جن پر باقی ناقدین نے ابھی تک زیادہ کام نہیں کیا ہے گویا فیض کی شخصیت اور شاعری کے چند گوشے ابھی تک پردہ حقائق میں ہی تھے لیکن ڈاکٹر عابدی نے ان پر قلم اٹھا کر فیض کے بعض اہم گوشوں کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔اس سلسلے میں تقی عابدی کا پہلا مضمون فیض کا زندگی نامہ کے عنوان سے ہے۔ جو اُن کی سوانح حیات پر مشتمل ہے اس مضمون میں تقی عابدی نے فیض کی اصلی تاریخ پیدائش (۱۳فروری ۱۹۱۱) درج کی ہے۔ جو انہوں نے سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات ریکارڈ سے معلوم کرنے کے بعد لکھی ہے پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے مقام پیدائش جو کہ قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ ہے رقم کیا ہے والد (خان بہادر سلطان محمد خان) جو پیشے سے بیرسٹر تھے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے معلومات بہم پہنچائی ہیں جن میں ان کے مشاغل ،ادبی خدمات اور تخلیقات کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ ان کی دو مشہور تصانیف ہیں۔ پہلی افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری جو انگریزی میں ہے۔اس کے علاوہ شادی اور اولاد کے بارے میں میں بیان کیا ہے۔ چودھری سلطان محمد خان نے دو شادیاں کیں تھیں اور ان کے ہاں نو(9) اولادیں پیدا ہوئیں ۔جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

حاجی طفیل احمد، میجر عنایت احمد، بشیر احمد، بیگم شجاع الدین، بیگم حمید، بیگم نجیب اللہ خاں، بیگم اعظم علی، رشید سلطانہ۔اس مضمون میں تقی عابدی نے فیض کے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے

علاوہ ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ازدواجی زندگی کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کی شرائط کا بھی مفصل بیان کیا ہے شادی کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''یہ معاہدہ 28 اکتوبر 1941 کو فیض احمد ساکن سیالکوٹ (ہونے والا شوہر) ایلس کیتھرن جارج (ہونے والی زوجہ) متوطن لندن کے درمیان طے پایا جن کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ اُس کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1- اس معاہدے کے تحت دونوں میں طے پایا کہ چونکہ دونوں مسلمان ہیں اس لیے ان کی شادی مسلم شریعت کے مطابق ہو:

2- اس معاہدے کی رو سے اور متذکرہ شادی کے پیش نظر فیض احمد فیضؔ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس کیتھرن جارج سے شادی ہوجانے کے بعد فیضؔ احمد کسی صورت میں بھی کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔

3- اس معاہدے کے مطابق اور متذکرہ شادی کے پیش نظر فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کے تحت طلاق کا حق ایلس کیتھرن جارج کو منتقل کرتے ہیں۔

4- اس معاہدے کے تحت اور اسلامی قانون کی رو سے مہر کی رقم پانچ ہزار روپے میں مقرر کی گئی ہے جو شادی ہوجانے کے بعد فیض احمد فیضؔ ایلس کیتھرن جارج کو ادا کریں گے۔

تقی عابدی نے اس مضمون میں بہت ہی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں ساتھ ہی شادی کا پس منظر اور جن حالات میں شادی کرائی گئی نکاح کہاں پڑھایا گیا کس نے پڑھایا کتنا مہر مقرر ہوا براتیوں میں کون کون لوگ شامل تھے اور کتنے لوگ تھے وغیرہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ایلس جارج بیگم تاثیر کی سگی بہن ہیں۔ جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے

اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں امرتا اور ایلس فیضؔ کے انٹرویو کا وہ حصہ بھی شامل کیا گیا ہے جو اُن (ایلس اور فیض) کی شادی کے بارے میں ہے جس سے ہمیں فیضؔ کی زندگی اور حالات کے بارے میں بھی کئی اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔یعنی ان کے آپسی رشتے گھر کا ماحول، فیضؔ کی طبیعت آپسی تال میل وغیرہ میری ذاتی رائے کے مطابق یہ مضمون اس انٹرویو کی وجہ سے زیادہ دلچسپی کا حامل ہوگیا ہے کیونکہ سوانح میں تقی عابدی نے ہماری معلومات میں کافی اہم اضافے بھی کیے ہیں مگر کئی لوگوں نے اس موضوع پر مقالے بھی تحریر کیے ہیں لیکن تقی عابدی نے کچھ نئی باتوں کا اضافہ کرنے کے ساتھ اس انٹرویو کو شامل کر کے مضمون کی دلکشی میں اہم اضافہ کردیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فیضؔ کے زندگی نامہ میں ذیلی عناوین کے تحت فیضؔ کی زندگی کے تمام پر پہلوؤں پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالی ہے۔

مشاغل اور خدمات کے عنوان کے تحت انہوں نے فیض کی صحافت کے ساتھ وابستگی کا بیان بھی کیا ہے کہ فیضؔ کن کن اخبارات سے منسلک رہے جن میں روزنامہ پاکستان ٹائمز،

روز نامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار اور ایفرو ایشیائی سہ ماہی مجلّہ لوٹس بیروت کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں انہیں مع تاریخ تحریر کیا ہے۔

سماجی خدمات کے تحت ان تمام خدمات کا ذکر کیا ہے جو فیض نے انجام دیں۔

اعزازات و انعامات کے تحت ان تمام انعامات و خطابات کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے ایک طالب علم مستفید ہو سکتا ہے۔ پھر قید و تنہائی کے ذیلی عنوان کے تحت فیضؔ کو کب اور کس مسئلے میں قید و بند کی سزا کاٹنی پڑی اس کا بھی مفصل بیان کیا ہے اور اس دوران پیش آنے والی تمام پریشانیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر سفر و سیاحت کے عنوان کے تحت ان تمام ممالک کی فہرست دی ہے جن کا فیضؔ نے دورہ کیا۔ ساتھ ہی فیضؔ کی شاعری اور شاگردی کا ذکر بھی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ شاعری کی ابتدا میں کس کس سے زانوے تلمذ طے کئے۔ تمام تفصیلات پر بحث کرنے کے بعد تقی عابدی اس نتیجے پر پہنچے کہ خود فیض کے کہنے کے مطابق انہوں نے کبھی کسی کی با قاعدہ شاگردی اختیار نہیں کی جس سے ایک نئی بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ شعر گوئی کے عنوان کے تحت انہوں نے کب کس جماعت اور کس کے کہنے پر شاعری کی طرف رجوع کیا وغیرہ تمام معلومات کا خلاصہ بھی اس مضمون میں پیش کیا ہے۔

تقی عابدی چونکہ خود بھی ایک طبیب ہیں اس لحاظ سے انہوں نے فیض کی تمام بیماریوں کا مفصل ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ایک اندازے کے مطابق یہ بھی بتایا کہ برونکیٹس کمزوری قلب اور دمہ نے فیض کو کافی کمزور بنا دیا تھا اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ فیضؔ کو دِل کی

بیماری geneticallyیا موروثی طور پر تھی جس کا پتہ اُن کے بڑے بھائی اور والد کی نا گہانی اموات سے چل جاتا ہے اور فیض کی موت کس بیماری کس ہسپتال اور کس وقت ہوئی اس کا بھی مفصل بیان کیا ہے یہ معلومات اتنے دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ تقی عابدی کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔اپنے مطالعہ کی بنا پر تقی عابدی نے فیض کے ان تمام شوق اور کتبوذ کر بھی کیا ہے جس سے انہوں نے وقتاً فو قتاً استفادہ کیا تھا۔فیض کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شعری مجموعوں کے علاوہ تقی عابدی نے ان کے نثری کارناموں ،ڈرامانگاری اوران کی قصوں سے وابستگی کوبھی موضوع بحث بنایا ہے۔

مختصر یہ کہ تقی عابدی کا یہ مضمون فیض کی ایک مکمل Biography ہے جس میں انہوں نے فیض کی پیدائش سے لیکر وفات تک بعض اہم گوشوں کو اجاگر کر کے فیض کے زندگی نامے کو مکمل طور پر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ تقی عابدی کا یہ مضمون فیض کے سلسلے میں کافی اہمیت رکھتا ہے جس میں فیض کی زندگی کے نئے نئے پہلو ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں محبان فیض طالب علموں کے لیے یہ مضمون بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اس کتاب میں شامل تقی عابدی کا دوسرا مضمون بعنوان ’’فیض مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں‘‘ ہے جس میں انہوں نے مختلف مشاہیر کی رائے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً فیض احمد فیض کے متعلق رقم کی ہیں کو شامل مضمون رکھا ہے جن میں آل احمد سرور۔احتشام حسین۔احمد ندیم قاسمی۔جمیل جالبی۔ رشید احمد صدیقی۔ سردار جعفری فراق گورکھپوری،قمر رئیس، کلیم

الدین احمد۔ گوپی چند نارنگ، گیان چند جین اور مجروح سلطان پوری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ حضرات کی آرا سے فیضؔ کی قدردانی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

کتاب کے تیسرے مضمون میں انہوں نے فیضؔ کی شاعری پر مختلف حوالہ جات کی مدد سے تبصرہ، تجزیہ اور تشریح کی ہے۔ انہوں نے فیضؔ کی ابتدائی شاعری سے لے کر آخری عمر تک کی شاعری کو اس مضمون میں سمیٹا ہے۔ تقی عابدی نے لکھا ہے کہ فیضؔ کی شاعری پر کئی بڑے شاعروں کے کلام کی چھاپ نظر آتی ہے جن میں میرؔ۔ سوداؔ، غالبؔ، نظیرؔ، انیسؔ، اقبال، حسرت، اختر شیرانی کے علاوہ فارسی کے حافظ، خسروؔ، عرفیؔ، بیدلؔ، عربی کے ابوالقیس ابوتمام ابونواس اور مغربی شعرا میں براؤ ننگ کیٹس شیلے اور ہارڈی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں تقی عابدی نے رقم کیا ہے کہ فیضؔ کے کلام میں پہلے شعر سے آخری شعر تک غالبؔ کے اثر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

؎ لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلادے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

؎ سجاؤ بزم عزل گاؤ۔ جام تازہ کرو
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے

فیض کی بتدائی شاعری میں مغربی شعراء کا تھوڑا بہت رنگ دیکھنے کو ملتا ہے خاص طور پر حسینہ خیال اور تنہائی کی طرح کئی دوسری علامتی نظموں پر مغربی شعرا کے نقوش موجود ہیں تقی

عابدی نے مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے کہ اردو ادب کے مختلف ادیبوں ناقدوں شاعروں اور دانشوروں نے فیض پر مغربی شاعروں براؤ ننگ تھامس ہارڈی۔ کیٹس آرتھر سائمن رابرٹ فراسٹ شیے بائرن اور ورڈز ورتھ کا اثر محسوس کیا ہے۔

کلیم الدین احمد نے فیض کی نظم تنہائی کے متعلق لکھتے ہیں ہے کہ فیض کی اس نظم تنہائی آرتھر سائمن کی ایک نظم (The Broken Trust) ''دی بروکن ٹرسٹ'' اور ہارڈی کی نظم(The Broken Appointment) ''دی بروکن اپوائنٹمنٹ'' کا مرکزی خیال ہے۔

دوسری جانب سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ فیض کی نظم تنہائی آرتھر سائمن کی broken Trust اور ہارڈ کی the Broken Appointment کی یاددلاتی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور فیض کو فراسٹ سے مشابہ کرتے ہیں اور سلامت اللہ خان فیض کی تنہائی کو شیلے سے مماثل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے تقی عابدی یوں رقم طراز ہیں:

''فیض بھی ان تمام شعراء کی طرح ایک فطری شاعر ہے ''نقش فریادی'' میں فیض کی ایک نظم براؤ ننگ کے خیالات سے لبریز ہے۔ اگر چہ یہ نظم روحانی جذبہ سے سرشار ہے اور حسن آرائی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ لہجہ اختر شیرانی اور ان کے دبستان سے مشابہ ہے۔ جس کو فیض نے بہت جلد ترک کر دیا فیض نے اسی جمالیاتی کیفیت کو اپنے لہجے میں ڈھال کر نیا چہرہ اور پُر کیف تاثر پیدا کیا ہے۔

مجھے دے دے!

رسیلے ہونٹ معصوم پیشانی حسین آنکھیں

کہ میں اک بار پھر رنگینوں میں غرق ہو جاؤں

میری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے

ہمیشہ کو اس دام میں محفوظ ہو جاؤں

ضیائے حُسن سے ظلمات دنیا میں نہ پھر آؤں

گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دُھل جائیں

میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں

مجھے وہ اک نظر اک جاودانی سی نظر دے دے'' (۱)

فیض کی مشہور نظم ''موضوع سخن'' کو تقی عابدی نے ان کی شاعری کے بنیادی فکر کا نچوڑ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ فیض نے یہاں رومان کا سفر طے کیا ہے جو مجاز سے انقلاب کا راستہ ہے یہاں غم جاناں سے غم دوراں کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ نظم دیکھیں

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے

کچھ تو ہے جس سے ہوتی جاتی ہے چلمن رنگین

اپنے افکار کی اشعار کی یہ دنیا ہے یہی

جان مضمون ہے یہی شاید معنی ہے یہی

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اُن کے سوا اور نہیں

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

فیضؔ غم دوراں میں فنا نہیں ہونا چاہتے بلکہ اس سے نبرد آزما ہوتے ہیں وہ شاعری میں صرف نعرہ بازی اور خشک سالی پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی دشوار راستے کو بہت ہی آسانی سے طے کرتے ہیں۔ راقمہ کو تقی عابدی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ یہ وہ طرز ہے جو فیض کو نئی آواز دیتی ہے۔'' فیضؔ کے کلام میں آسودگی نہیں بلکہ آرزو اور جستجو ہے۔ ان کے پاس ارادہ مستقل، پکا عزم اور سچا جذبہ ہے جو ان کے اشعار سے بھی عیاں ہوتا ہے:

؎ ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

اس مضمون میں ڈاکٹر عابدی نے فیضؔ کے رومانی شاعری سے آگے نکل کر شاعری کرنے کا ذکر بھی کیا کہ کس طرح انہوں نے غم جاناں سے غم دوراں کی طرف سفر کیا۔

تقی عابدی اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھتے ہیں کہ فیض کسی نظریے کے شاعر نہیں ہیں نہ وہ اختر شیرانی کی طرح رومانیت میں کبھی غرق ہوئے اور نہ سردار جعفری کی طرح انقلاب کا ڈھنڈورا پیٹا:۔

> ''فیض کا سفر مجاز اور رومان سے حقیقت اور انقلاب تک کبھی پورا نہ ہوسکا فیضؔ تمام عمر ایک پاؤں رومانیت کی سرزمین اور دوسرا پاؤں انقلاب کی سرزمین میں رکھ کر زندگی بسر کرتے رہے۔فیضؔ نے رومان اور انقلاب میں انتہاپسندی قبول نہیں کی وہ نہ اختر شیرانی کی طرح رومانیت میں مکمل غرق ہوئے اور نہ سردار جعفری کی طرح انقلاب کے ڈھنڈورچی بنے''۔(۴)

شاعری کی روح چونکہ تغزل ہے اور فیضؔ کی نظم ہو غزل ہو یا پھر قطعہ ہو تغزل سے بھرپور ہے لہذا تقی عابدی نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ انھیں آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ اُن کی غزلیں زیادہ عمدہ ہیں یا نظمیں ۔فیضؔ کے تمام موضوعات شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔فیضؔ کی حمد ہو کہ نعت دعا ہو کہ مرثیہ واسوخت ہو کہ ترانہ گیت ہو کہ قوالی

دلکشی دلربائی اور غنائیت ہر موضوع کلام کی جان ہے اسی وجہ سے ان کا کلام زبان زدِ عام ہ بھی ہے اور نغمگی کی بنا پر اردو کے شعرا میں سب سے زیادہ گایا بھی گیا ہے۔

؎ رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے سحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

تقی عابدی نے فیضؔ کی حمد ،نعت غزل تمام اصناف میں ان کی انفرادیت اور مقبولیت بیان کی ہے اس مضمون میں آپ نے اس بات کا بھی خاص طور سے توجہ دلائی ہے کہ فیضؔ نے بہتر (72) بند کا ایک مرثیہ بھی تصنیف کیا جو ''شام شہریاراں'' درج ہے جس میں موضوعی طور پر انسانی حقوق حق و باطل کی جنگ میں حق کا ساتھ دینے کی ضرورت اور اہمیت پہ اشعار لکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

؎ جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعین ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکر دیں ہے

فیض اشاروں اور علامتوں میں بات کرتے ہیں فیضؔ کی عظمت کا ثبوت اس شعر سے بہتر کیا ہوسکتا ہے جس میں انہوں نے راولپنڈی سازش کا جواب اس شعر سے نہایت خوبصورتی دیا ہے کہ:۔

؎ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

تقی عابدی نے فیضؔ کو اس دور کا زندہ شاعر قرار دیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ یہ دور فیضؔ کا ہے۔ اور جہاں تک فیضؔ کے ڈکشن کا تعلق ہے تو اس حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں:

''جہاں تک فیضؔ کے ڈکشن کا تعلق ہے وہ غالبؔ اور اقبالؔ کے ڈکشن کی توسیع ہے فیضؔ کی لفظیات روایتی کلاسیک لفظیات ہے انہوں نے اپنے اظہار کے لیے نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ نئے اظہاری پیرایے وضع کیے۔ سیکڑوں ہزاروں نئی ترکیبوں سے ابلاغ کے راستے روشن کیے۔''

ماحصل یہ کہ تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کے حوالے سے دقیق جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے فیض کی شاعری کے تمام پہلوؤں اور جہات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور مختلف حوالہ جات دلائل کی مدد سے اپنی بات کو ثابت بھی کیا ہے ۔صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ:

؎ مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ایک علاحدہ مضمون ''فیض کی غزل کا مقام'' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے غزل کے حوالے سے فیضؔ کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے جو شماریات پر بھی مبنی ہے اس میں انہوں نے رقم کیا ہے کہ فیضؔ نے (80) اسی کے قریب غزلیں اور 180 سے زیادہ نظمیں اور قطعات قلم بند

کئے ہیں اور غزلوں کے اشعار کی تعداد پانچ سو سے کم بتائی ہے۔ اسی مضمون کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اس میں تقی عابدی نے فیض کے تمام شعری مجموعوں میں شامل غزلیات کی تعداد ان کے اشعار کی تعداد وغیرہ کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا ہے جو کہ اس طرح سے ہے:

شعری مجموعہ	غزلیات	اشعار
نقش فریادی	14	79
دست صبا	17	114
زنداں نامہ	15	85
دست تہ سنگ	11	60
سر وادی سینا	7	40
شام شہر یاراں	8	44
مرے دل مرے مسافر	3	17
غبارِ ایام		39
	کل 82 غزلیات	اشعار ۴۷۸

لکھتے ہیں کہ اگر حساب لگایا جائے تو غزلوں کی تعداد بیاسی (82) ہے لیکن اگر ان غزلوں میں شامل ''غزل پیکر نظمیں'' نکال دی جائیں تو غزلوں کی تعداد ستر (70) سے بھی کم رہ جاتی

ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ نے (55) سالہ ریاضت میں (70) کے لگ بھگ غزلیں کہیں جن کی تعداد سال میں (2) غزلوں سے بھی کم یعنی ڈیڑھ غزل ہے۔ اس کے باوجود اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کی غزلیں فیض کی طرح مشہور ہوئیں اور اس کثرت سے گائی گئیں ہوں۔ فیضؔ کے (23) یا(24) انٹرویوز جو اب بھی موجود ہیں کا حوالہ دیتے ہوئے تقی عابدی نے بتایا ہے کہ اگر ان تمام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات فیضؔ نے اکثر اساتذہ شعرا میں سوداؔ ، غالبؔ اور حسرتؔ وغیرہ کی کلاسیک غزلوں سے فائدہ اٹھانے کا اعتراف کیا ہے جب کہ ان کے ابتدائی رومانی کلام پر مغربی شعراء جن میں براؤ ننگ کیٹس ورڈزورتھ اور شیلے کی شاعری کا اثر بھی موجود ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فیضؔ اُن اساتذہ شعراء کے مقلد نہ تھے بلکہ اُن کی بتائی ہوئی زمینوں پر اپنی نئی فصل تیار کرتے ہیں۔ مثلاً حسرت موہانی کی رومانی شاعری کے رنگ مضمون سے متاثر ہوکر نقاشی کرتے ہیں جس میں عشقیہ شاعری کی تمثیلی رنگینی سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ان کے جذبے کے والہانہ پن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی نقش کارفرما ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر حسرتؔ موہانی کی غزل کے اشعار دیکھیے:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

اور اب فیضؔ کی غزل کے اشعار دیکھیے:

رنگ پیرہن کا خوشبو زُلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستان کی بات رنگین ہے نہ مے خانے کا نام

"نقش فریادی" کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے تقی عابدی نے لکھا ہے کہ فیض کی غزلیں نظموں کے مقابلے میں پھیکی اور کم اثر ہیں جس سے راقمہ کو اتفاق ہے کیونکہ اُن کی ایک دو غزلیں ہی قادرالکلامی کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ تقی عابدی درست فرماتے ہیں کہ جو لہجہ "دست صبا"، "زنداں نامہ" اور "دست تہ سنگ" میں ہے۔ وہ اِن دو غزلوں میں بھی نہیں جھلکتا۔ انہوں نے فیضؔ کے شعری مجموعہ سرودائ سینا کی غزل کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ فیضؔ کا لہجہ روایتی غزل میں بھی نمایاں ہے جس میں داخلیت کا اثر زیادہ ہے اور اشعار میں احساس کی شدّت اور جذبہ کے خلوص کے ساتھ سچائی شاعری کا نکھار بن گئی ہے۔

فیضؔ کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شان الحق حقی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

"فیضؔ کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا

ہے اس لحاظ سے اُن کی غزل کو اردو غزل کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔''(۴)

فیضؔ نے اساتذہ شعراء کی طرح جو کہیں کبھو، کبھی کا استعمال کیا ہے تقی عابدی نے اُن کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ فیض کی زبان اساتذۂ غزل کی زبان معلوم ہوتی ہے کہیں کبھو کبھی اور کہیں قدیم ردیفوں کی طرح آؤ گے بتلاؤ گے وغیرہ لفظوں سے شعر مکمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

ے نہ یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تیری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے
ے کب تک دل کی خیر منائیں کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

درج بالا اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے اپنی بات کو خوبصورت طریقے سے ثابت کیا ہے اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ پھر فیض کے ردیف سے معنیٰ آفرینی کا کام لینے کی خاصیت کا بیان بھی بہت خوش اسلوبی سے کیا ہے فیضؔ غزل میں غالب کے پیرو ہیں یہ بات بھی انہوں نے واضح طور پر صاف کرنے کی سعی کی ہے جس میں انہوں نے فیضؔ اور غالبؔ کا تقابل نہ کرتے ہوئے غالبؔ سے فیضؔ تحصیل کا ذکر کیا ہے جیسا کہ فیضؔ کی پہلی غزل کے مشہور شعر کے مصرع ثانی پر غالبؔ کے رنگ کی گہری چھاپ کا حوالہ دیا ہیں۔ شعر یوں ہے:

؎ لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

تقی عابدی نے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ شعر جو فیضؔ کے کسی بھی مجموعہ میں شامل نہیں 1928 کے لگ بھگ کا ہے یا شاید ''راوی'' مجلّہ میں شائع ہوا۔ پھر فیض کی آخری غزل کے آخری شعر جو 1984 کی تخلیق کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتے ہیں اس شعر کا آخری مصرع بھی غالبؔ کا مصرع ہے۔

؎ بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
(غالبؔ)

سجاؤ بزم غزل گاؤ جام تازہ کرو
''بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے''
(فیضؔ)

تقی عابدی نے ااس مضمون میں فیضؔ کی غزل کے حوالے سے تمام پہلوؤں پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ جہاں انہوں نے فیض کی کلاسیکیت روایتی شاعری جدیدیت اور ترقی پسندی کی شاعری کے حوالے سے اور اردو کے ممتاز شعراء کے حوالے سے ان کی شاعری کی تمام گرہیں کھولی ہیں اور ہر پہلو پر ناقدانہ رائے دی ہے۔ وہیں پر انہوں نے فیضؔ کے مجموعوں

کے ناموں کے انتخاب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ فیض کے مختلف شعری اور نثری مجموعوں کے نام فیض نے غالب کی اردو فارسی شعری ترکیبوں سے اخذ کیے ہیں۔اور وہ نام یوں ہیں:۔نقش فریادی۔دست صبا-غبار ایام۔میزان، مہ وسال اور کلیات نسخہ ہائے وفا۔

؎ تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

اس کے علاوہ غالب کے رنگ میں کہے گئے اشعار کی بھی واضح مثالیں پیش کی ہیں۔
تقی عابدی لکھتے ہیں:

''غالب اور فیض کے کلام میں ایک مماثلت دونوں کے درد کے رشتے سے ہے۔غالب اور فیض دونوں غم جاناں اور غم دوراں کے شہید تھے۔یہ غم انہیں بہ صورت درد ملا تھا۔جس سے دونوں کے سینے آباد تھے اور دونوں کے کلام میں نغموں کی سرشاری ہے،،۔(۵)

فیض کی شاعری میں تغزل رچا بسا ہوا ہے اور تغزل شاعری کی رگوں میں سمایا ہوا ہے،مجموعی طور پر تقی عابدی فیض کی شاعری کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''فیض کے ضمیر میں سچائی اور فیض کی غزل کے خمیر میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو ان کی بے پناہ مقبولیت کا راز بھی تھا جہاں ترقی پسند شعرا

سخت باغیانہ لہجہ اور نعرہ بازی کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے۔ وہیں پر فیض بااثر دھیمے لہجے میں وہی مسائل بیان کر رہے تھے۔ جو ایک ترقی پسند معاشرے کے لیے لازمی تھے وہ بھی حقیقت پسندی کو تخیل پسندی پر رجائیت کو قنوطیت پر مسئلہ زندگی کو فلسفۂ زندگی پر، عوام کو خواص پر، تجربے کو روایت اور حکایات پر، اجتماع کو انفرادیت پر، حوصلہ آزادی کو حسرت زندگی پر ہلکی پھلکی اثر انداز رومانی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری پر، تنقید حیات کو تفسیر حیات پر فوقیت دے رہے تھے۔ اُن کی شاعری میں مشرقی اور مغربی شاعری کے مثبت اثرات موجود تھے۔ فیض کی غزلوں میں اشاروں کنایوں اور علامتوں میں عیاں اور نہاں زندگی کے سماجی سیاسی معاشی اور عشقی پہلوؤں کے سچے جلوے نظر آتے ہیں۔ فیض نے پرانے ساغروں میں نئی شراب پیش کی یعنی قدیم روایتی، ہیئتی سانچوں اور علامتوں میں جدید موضوعات اور نئی حساسیت کو داخل کیا۔ تقی عابدی کے مطابق فیض نے دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح بلکہ اسے نیا شگفتہ لہجہ دے کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کی شاعری میں نظم کی طرح غزل بھی بڑی دلکش اور جاندار ابھر کر سامنے آئی۔ فیض کی شاعری نے اپنے عہد اور آئندہ آنے والے عہد کو ایک نمایاں جدید موثر لہجہ عطا کیا ہے۔ فیض کے لہجہ نے انسانی

ذہن اور تہذیب وطریق شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے
کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا دور اقبالؔ کے بعد فیضؔ کا دور ہی مانا
جائے گا،،(۶)

مضمون: ''کلام فیضؔ عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ'' میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری میں اُن فارسی، عربی، تراکیب اور الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن سے فیضؔ نے استفادہ کیا ہے فیض کا لہجہ روزمرہ سے کافی دور ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں خواہ وہ نظم ہو کہ غزل سادگی اور سلاست رواں دواں ہے۔ لیکن کچھ غزلوں اور نظموں میں نئے ترکیبات اجنبی الفاظ اور عربی فارسی کے لفظوں کا کافی استعمال ملتا ہے۔ جن کی واضح مثالیں تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں پیش کردی ہیں مثال کے لئے دو اشعار پر ہی اکتفا کرتی ہوں جو تقی عابدی نے اپنی اس کتاب میں تحریر کئے ہیں اور ساتھ ہی اپنی رائے زنی بھی کی ہے۔

یادِ غزال چشماں، ذکر سمن عذاراں
جب چاہا کرلیا ہے کُنجِ قفس بہا راں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہ و فا شعاراں

فیضؔ کی اس غزل میں عربی اور فارسی الفاظ کا ایک ہجوم نظر آتا ہے، مگر چونکہ یہ غزل کی روایتی زبان ہے جس کی وجہ سے عوام اس سے مطلب و معنی حاصل کر لیتے ہیں ہے بقول

تقی عابدی ''فیض کا فن الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترکیبوں سے زیادہ اُن کی معنی آفرینی میں کمال دکھاتا ہے،،

تقی عابدی نے بہت ہی دلچسپ پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ فیضؔ مصرع اول کی بنیاد پر مصرع بنانے کا مضمون تیار کرتے ہیں جو اپنی تاثیر میں نشتر کا کام کرتا ہے جس کا پتہ مصرع اولیٰ سے معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

اب وہی حرف جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
دست صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی
بوئے گُل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں اور ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیان ٹھہری ہے

تقی عابدی نے بغور مطالعہ کرنے کے بعد فیضؔ کی چنندہ غزلوں اور نظموں کا حوالہ دیا ہے جن میں فیضؔ نے فارسی اور عربی لفظوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ۔تقی عابدی نے واضح طور پر کہا ہے کہ فیض ن ۔م راشد کی طرح بے دریغ عربی اور فارسی الفاظ اور قدیم و جدید ترکیبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تقی عابدی نے فیضؔ کی پندرہ مصرعوں کی نظم جس میں (17) سترہ سے زیادہ فارسی تراکیب استعمال کی گئی ہیں اور جس کا خمیر اُس وقت تیار ہوا جب

فیضؔ کوٹانگے پر بٹھا کر دانت کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جارہا تھا۔ اور لوگ ٹانگے کے ساتھ کاررواں کی شکل میں چل رہے تھے۔ اور جب وہ جیل واپس گئے تو انہوں نے یہ نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' لکھی جو جیل میں 11 فروری 1959 کی تخلیق ہے اور جو ان کے مجموعہ ''دست تہ سنگ'' میں شامل ہے پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے تقی عابدی نے ان تمام فارسی تراکیب کی نشاندہی کی ہے جن سے فیضؔ نے استفادہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ فیضؔ دل کھول کر فارسی عربی کی جدید تراکیب اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں۔

نظم ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' میں استعمال کی گئی تمام فارسی تراکیب ذیل میں درج ہیں۔ جنہیں تقی عابدی نے علاحدہ کر کے بتایا ہے اور مثال کے لیے پوری نظم کو بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً چشم نم۔ جان شوریدہ، تہمت عشق پوشیدہ پابجولاں، دست افشاں، مست و رقصاں خاک برسر۔ خوں بہ داماں۔ شیر جاناں۔ تیرالزام، سنگِ دشنام، صبح ناشاد، روز ناکام اور رخت دل وغیرہ۔

تقی عابدی نے اس بات کا گلہ کرتے ہوئے بہت افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ فیضؔ کے وہی اشعار جو عام فہم تھے انہیں ہی منتخب کیا گیا اور وہی عوام میں مشہور بھی ہوئے جب کہ فیضؔ کا بہت سا عمدہ کلام ان مسائل (یعنی عربی فارسی) کی وجہ سے عوام تک نہیں پہنچ سکا۔ جو کہ عوام تک پہنچنا چاہیے تھا جسے پڑھنے اور سمجھنے کی سخت ضرورت تھی۔

بعض اوقات فیضؔ مصرعوں کی تراش خراش پر کافی محنت صرف کرتے ہیں جو اُن کے لسانی

شعور کی دلیل بھی ہے، ان کے فن کا کمال ان کا اختصار بھی ہے۔ تقی عابدی نے رقم کیا ہے کہ فیضؔ غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح جہاں بھی چاہیں عربی اور فارسی الفاظ سے استفادہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر عابدی نے یہ مضمون بڑی محنت سے تحریر کیا ہے جو اکثر ناقدین و محققین کی نظروں سے اوجھل رہا ہے، انہوں نے فیضؔ کے کلام کا ہر زاویے سے جائزہ لینے کے بعد اس مضمون کو ضبط تحریر میں لایا ہے۔ اور لسانیاتی نکتہ نظر سے بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے یہ مضمون ڈاکٹر عابدی کی فارسی دانی کی واضح مثال ہے یہ مضمون ہماری معلومات میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ نئے فیض شناسوں کے لئے یہ مضمون مشعل راہ ثابت ہوسکتا ہے۔

''فیضؔ کی نظم کی وسعتیں'' کے عنوان سے تقی عابدی نے اک طویل مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے فیضؔ کی نظموں میں تغزل کی بھرمار ثابت کرتے ہوئے کہا ہے کہ فیض کی ابتدائی شاعری زیادہ تر رومانی او مریض عشق کے ولولوں اور نالوں سے بھرپور ہے۔ انہوں نے ایک نظم جو فیض نے ۱۹۔۱۸ سال کی عمر میں تخلیق کی۔ جس کا عنوان ''اقبال'' ہے اس نظم کی بحر کافی طویل ہے اور اس میں رومانیت کی جگہ سنجیدگی ہے اور یہ نظم فیضؔ نے تب لکھی جب وہ ۳۰۔۱۹۲۹ کے دوران لاہور میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی تعلیم مکمل کر رہے تھے جو ''راوی'' میں چھپی اور اب نایاب ہوچکی ہے۔ یہاں یہ نظم تحریر کرکے تقی عابدی نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ فیضؔ عہد جوانی کے دوران صرف رومانی ہی نہیں بلکہ سنجیدہ نظمیں بھی لکھتے تھے فیضؔ چونکہ اقبالؔ کے قدر دان بھی تھے اور ایک انٹرویو کے دوران

انہوں نے کہا بھی ہے کہ:

''جہاں تک شاعری میں سنسی بیلٹی Sensibility زبان اور موسقیت کا تعلق ہے ہم تو اُن کی خاک پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہوجاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔''(۸)

مثال کے لیے نظم اقبال سے دو اشعار یہاں قلمبند کیے جاتے ہیں تا کہ قاری خود اندازہ لگا سکیں:

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظار موت کرتا تھا عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انسان میں
بساط دہر پر گویا سکوت مرگ طاری تھا صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزم ویراں میں
رگ مشرق میں خون زندگی تھم تھم کے چلتا تھا خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے شیر انگیز ہنگامے شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھی کارزاروں میں

تقی عابدی نے فیض کی اس نایاب نظم کو ڈھونڈ کر فیض کی نو جوانی میں ان کی سنجیدگی کو ثابت کیا ہے۔ جن کی ابتدائی شاعری پر اکثر رومانیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر چہ کہ ابتداء میں رومانیت کے علمبردار تھے لیکن اس کے باوجود وہ سنجیدہ خیال بھی رکھتے تھے جس کی مثال ان کی مذکورہ نظم ''اقبال'' ہے۔

اس نظم کے بابت تقی عابدی لکھتے ہیں:۔

> ''اس نظم میں فیض کی عمل کردگی مصرعوں کا ترنم الفاظ کی نشست عربی اور فارسی لفظوں کا گلشن نئی جاندار اور نادر ترکیبیں، زجاج زندگی، عروق مردہ مشرق ،فسردہ مشتِ خاکستر واماندہ منزل وغیرہ کے ساتھ پیغام کی وسعت بخشہ کلام کی شناخت ہے''۔(۹)

نظم بول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس میں استعمال شدہ صنعتوں کا ذکر کرتے ہوئے تقی عابدی نے رقم کیا ہے کہ فیض نے یہاں صنعت مراعات النظیر اور صنعت تضاد کا استعمال کر کے شعری حسن میں اضافہ کردیا ہے۔ جس میں صنعت مراعات النظیر کے تحت لب۔ زباں، جسم، جان، زندہ ،موت وغیرہ لائے گئے ہیں جب کہ صنعت تضاد میں زندہ موت تھوڑا بہت وغیرہ ہیں۔ جنہیں لاشعوری طور پر نظم میں نظمایا گیا ہے۔ پھر خواس خمسہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فیض نے زیادہ تر بصری اور لمسہ تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار جن میں انہوں نے ان خواس کا استعمال کیا ہے یوں ہیں:-

؎ رنگ پیراہن کا خوشبو زُلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

(قوت باصرہ وشامہ)

؎ نسیم تیرے شبستان سے ہوکر آئی ہے
میری سحر میں مہک ہے تیرے بدن کی سی

قوت باصرہ وشامہ

؎ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قوت باصرہ وشام

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ برسا ہے اُسی بام سے مہتاب کا نور

قوت لمسیا شامہ اور باصرہ

ان مثالوں کے ذریعے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقی عابدی نے فیض کی شاعری کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا ہے جو ان کے سچے ذوق کا ایک عمدہ ثبوت ہے۔ اس کے ساتھ ہی نظم ''ایرانی طلبہ کے نام'' کا حوالہ بھی دیا ہے جو حواس باصرہ کی عمدہ مثال ہے۔

تقی عابدی نے لکھا ہے کہ فیضؔ کی ابتدائی نظموں میں رومانیت اور سماجی درد و اذیت کا عریاں ملاپ نظر آتا ہے۔ اس بات کی فیضؔ کی ''نظم'' مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ سے ہوسکتی ہے جس میں رومانیت اور سماجی حقیقت اور درد و اذیت کا بہترین امتزاج

پایا جاتا ہے اشعار دیکھئے:

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

یہیں پر شاعر اپنا لہجہ بدل دیتا ہے جس سے پڑھنے اور سننے والے کے احساسات شدید ہو جاتے ہیں۔

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

اور آخر میں شاعر حسن کی عظمت کا اقرار بھی کر لیتا ہے۔

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجئے

تقی عابدی کا یہ کہنا کہ فیضؔ کے اس سفر میں حقیقت سے رومان اور رومان سے حقیقت کی آمد و رفت نظر آتی ہے بالکل درست ہے۔ راقمہ کو اس نظم سے کافی دلچسپی ہے اور اس دلچسپی

کا سبب فیضؔ کی اس نظم میں رومان، سماجی حقیقت اور پھر حسن کی رعنائیوں کا امتزاج ہے۔
نظم میں اتنی دلکشی اور روانی ہے کہ ہر خاص و عام کی زبان پر یہ نظم آ چکی ہے اور اعلیٰ پائے
کے موسیقار اسے گا بھی چکے ہیں جو اس کی دلچسپی کی واضح مثال بھی ہے۔

اس نظم کے حوالے سے تقی عابدی یوں رقمطراز ہیں:

> ''فیضؔ کی شاعری کی شاہراہ پر دونوں سمت خیالات کی سواریاں حرکت
> کرتی ہیں۔ اس سفر میں حقیقت سے رومان اور رومان سے حقیقت کی آمد و
> رفت نظر آتی ہے۔ یہاں جلال اور جمال کا ملاپ کچھ اس طرح سے ہوتا ہے
> کہ بعض اوقات چہرہ جمالی اور بعض اوقات چہرہ جلالی لیکن اکثر اوقات
> دونوں قدروں کا امتزاج حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ فیضؔ دراصل جمالیات
> پسند ہیں لیکن اس حالت میں بھی اُن کی تخلیق کا حسن نظر اور ان کے فکر کا
> ذوق جمال کم ہونے نہیں پاتا'' (۱۰)

سوانح نگار میلا واسی لیوا لکھتی ہیں:

''فیض شعر گوئی کو ''عشق'' اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں کو کام کہتے تھے۔ وہ ساری عمر کام
اور عشق کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ انہوں نے زندگی بھر اچھے اچھے شعر کہے اور اچھے اچھے کام
کیے مگر ہمیشہ نامطمئن رہے''۔۱۱ (فیض فہمی صفحہ 192)

جیسا کہ خود فیض کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے:۔

؎ وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے۔
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی معروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم سے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

فیضؔ کی نظم ''رقیب سے'' پر معترضین کی طرف سے صرف سطحی مطالعہ کر کے اس کو اردو تہذیب کا ننگ قرار دیئے جانے پر تقی عابدی نے کافی افسوس کا اظہار کیا ہے۔ تقی عابدی کے مطابق اس نظم میں صرف جمالی اور مجازی کیفیات ہی نہیں بلکہ جلالی اور حقیقی تاثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ نیا روپ فیضؔ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ انہیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ معترضین نے گہرائی اور گیرائی سے اس نظم کا مطالعہ نہیں کیا۔ جب کہ یہ نظم ننگ نہیں بلکہ نیا رنگ ہے اور روایت سے بغاوت کا نیا ڈھنگ ہے جس میں عاشق اور رقیب حُسن و درد میں سنگ سنگ ہیں۔

فیض کی شاعری کا ایک پہلو وطن سے محبت بھی ہے۔ ان کی شاعری میں وطن سے والہانہ

محبت اور عقیدت کا جذبہ ہر جگہ موجزن ہے لیکن نظم ''نثار میں تیری گلیوں پہ'' اس سلسلے میں شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ تقی عابدی کا ماننا ہے کہ ''صبح آزادی'' بھی وطن سے محبت کا قصیدہ اور مرثیہ ہے۔

15 اگست 1952 میں فیضؔ نے ایلس فیض کو ایک خط میں نظم ''نثار میں تیری گلیوں پہ'' کے بارے میں جو لکھا تقی عابدی نے اُسے بھی رقم کیا ہے جو قاری کی خاص دلچسپی اور توجہ کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات بھی بہم پہنچاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نظم انہوں نے (فیضؔ) جیل میں لکھی جو وطن سے محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔

فیض کی شاعری پر دوست، دشمن، جاہل، عالم، مذہبی، کمیونسٹ غرض تمام کے مکتبہ فکر نے اعتراضات سر اٹھائے ہیں مگر فیض نے یا تو باسلیقہ ان کا جواب دیا یا پھر چپ رہے۔ اس بارے میں تقی عابدی رقمطراز ہیں:

> ''فیضؔ کے چاہنے والوں نے فیضؔ سے زیادہ ان کے مخالفین کا جواب دیا۔ وہ بھی ''کاسہ از آتش داغ تر'' یا پوپ سے زیادہ کیتھولک بن کر فیضؔ شناسی کے بجائے خود نمائی میں مصروف ہو گئے۔ فیضؔ کو جتنا نادان دوستوں سے نقصان پہنچا اتنا ان کے دشمن ان کو نقصان پہنچا نہ سکے۔ دشمنوں کے ہاتھوں میں جیل اور قید و بند تھا''

بقول فیضؔ:

؎زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر اک حلقہ زنجیر میں زبان میں نے''۱۱

''مضمون،فیض پہ فیضؔ کا ریویو'' میں تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کے متعلق اوراس سے جڑے مسائل پر اُن ہی کے بیانات جواُن کے خطوط کے مجموعہ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' اُن کی کتاب ''متاع لوح وقلم'' اور مختلف مطبوعہ انٹرویوز سے لیے گئے ہیں کواس مضمون میں شامل کیاہے۔اس مضمون کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بعض شعرا نے اپنے فن اور کلام پہ ریویو کیا ہے جس میں بہت صحیح بھی ہے اور بعض نے مبالغہ بھی کیا ہے مگر فیض احمد فیضؔ جیسا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اتنی انکساری اور انصاف کے ساتھ اپنے کلام پہ بات کی ہو۔

اس حوالہ سے تقی عابدی کی یہ رائے کافی موزوں معلوم ہوتی ہے کہ:۔

''عجب بات ہے کہ فیضؔ کے پاس تعلیٰ کا وجود نہیں صرف چند اشعار جو ان کے طریقہ فن پر اشارہ کرتے ہیں مقطوں میں موجود ہیں تا کہ ان کی شاعری اور علامتوں کو سمجھنے میں مدد ملے:۔

؎جان جائیں گے جانے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض نے من اور فن کا راستہ بڑی خوبی سے طے کیا:-

مقام، فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کیوں کہ:-

فیضؔ تھی راہ سربسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے"(۱۲)

اس مضمون میں تقی عابدی نے فیض کے ان تمام خطوں کو جو انہوں نے قید کے دوران محترمہ ایلس فیضؔ کو لکھے اور جن میں انہوں نے اپنے کلام کے حوالے سے بات کی ہے کو شامل کیا ہے اس کے علاوہ (23) مطبوعہ انٹرویوز جو تقی عابدی کے پاس موجود ہیں کو من وعن پیش کیا ہے جن میں مظفر اقبال عبادت۔ طاہر مسعود۔ نصرت چودھری۔ کرشن چندر، آصف فرخی، سہیل، افضل، اظہر، اجمل نیازی، شفیع عقیل، حسن رضوی وغیرہ کے انٹرویوز کو شامل تحریر کیا گیا ہے جن کا مطالعہ کرنے سے فیضؔ کی انکساری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، تقی عابدی نے نہایت ہی محنت اور لگن سے ان انٹرویوز کو جمع کر کے قاری اور ریسرچ اسکالرز کا کام نہایت ہی آسان کر دیا ہے جو اضافے کے ساتھ ساتھ کافی معلوماتی بھی ہے جن سے فیض کے نظریات اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مثال کے لیے یہاں پر نصرت چودھری اور فیض احمد فیضؔ کے ایک سوال اور جواب کو

بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے۔

نصرت:

ایک بات اور۔ آپ نے بیشتر نظموں میں غزل کے آہنگ غزل کے لب و لہجے کو اپنایا ہے حالانکہ نظم کا اپنا لب و لہجہ ہے اپنا آہنگ ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

فیضؔ:۔ اس لیے بھائی کے ہم کو آتا یہی ہے ہماری زبان کا مزاج بھی یہی ہے شاعری کی لغت بدلنے کے لیے بہت بڑا شاعر چاہے نظیرؔ اکبر آبادی نے کوشش کی تھی، اُس کے بعد کسی نے آج تک کوشش نہیں کی۔

''فیض کی دولت'' تنہائی کے عنوان سے تقی عابدی کا مضمون ایک علیحدہ نوعیت کا ہے جس میں تقی عابدی نے لکھا ہے کہ فیضؔ اکثر خیالوں میں ڈوبے رہتے تھے ان کی تنہائی سے مراد مریضانہ افسردگی اور ڈپریشن نہیں بلکہ ایک صحت مند اور خوش گوار ''خمارِ خلوت ہے'' جس کا ایک سرا مشاہدہ اور ایک مراقبہ ہے تقی عابدی کے مطابق یہ ایک ایسی خلوت ہے جس میں جلوت پوشیدہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر بڑے شاعر نے ایک لمبی عمر خلوت میں گزاری ہے جس کے حوالے سے انہوں نے غالبؔ، میرؔ، انیسؔ کی مثالیں دی ہیں۔ فیض نے تنہائی کے عنوان کے تحت (3) تین نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم ان کے پہلے شعری مجموعے نقش فریادی میں شامل ہے جس کا عنوان ''تنہائی'' ہے۔ دوسری نظم شعری مجموعہ دست تہہ سنگ میں ''قید تنہائی'' کے عنوان سے شامل ہے جب کہ تیری نظم ''آج شب کوئی نہیں ہے'' ''غبار ایام'' میں شامل

ہے۔

فیض کی نظم تنہائی کے سلسلے میں تقی عابدی لکھتے ہیں:

''فیض کی نظم تنہائی میں ایک خاص قسم کی سرشاری ہے۔ وہ اس خلوت میں تصور جاناں اور غم دوراں کے درد کی لذت سے ہم کنار معلوم ہوتے ہیں ۔بعض مقامات پر فیض کی تنہائی تاریک رات کی طرح لمبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس تنہائی کی روشن اور آخری منزل سحر کا انتظار ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ خلوت قنوطیت افسردگی نہیں بلکہ رجائیت اور امید بن جاتی ہے، فیض کی روح کسی تنہائی کا نفسیاتی تجزیہ ان کے بعض اشعار میں ان کے سکوت اور ذہنی وفکری طرب کا باعث معلوم ہوتا ہے۔'' (۱۳)

تقی عابدی نے واضح کیا ہے کہ اس نظم میں صنعت ایہام وابہام سے استفادہ کیا ہے۔ فیض کی اس شاہکار نظم تنہائی کو سمجھنے اور سمجھانے میں مختلف اہل علم کی آراء میں اختلاف دکھائی دیتا ہے بعض نے اسے مہمل بعض سیاسیت اور بعض نے رجائیت اور امید بن جاتی ہے۔ فیض کی شاعری میں بھی ان کی تنہائی کی جھلک ملتی ہے۔تقی عابدی نے تنہائی کے موضوع کے تحت لکھی گئی تینوں نظموں کا بغور مطالعہ کر کے ان کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے

چند اشعار

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی میں کبھی گردن مہتاب میں بانہیں

فیض کی ہم نشینی سے مستفید لوگوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فیض محفل میں ہونے کے باوجود تنہائی میں ڈوبے رہتے تھے جس سے یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ جسمانی طور پر محفل میں اور ذہنی طور پر کہیں اور ہوں۔ اور یوں وہ اکثر خیالوں میں گم رہتے تھے۔

آج تنہائی کسی ہمدم دلیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے

فیض ''مصورِ نقوشِ قد و حالِ حسن'' کے عنوان سے تقی عابدی نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس سے قبل شاید ہی کسی نے اس طرح کے موضوع پر فیض کے حوالے سے لکھا ہوگا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک ایسا مضمون ہے جس میں تقی عابدی نے فیض کی شاعری میں جمالیاتی حسن کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے جس سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمالیاتی حسن کے گہرے نقوش ان کی پہلے شعری مجموعے نقش فریادی ہی میں نظر آتے ہیں یہی نہیں بلکہ ان کی پہلی غزل کے مشہور شعر میں بھی نظر آتے ہیں۔ تقی عابدی نے فیض کی جوانی اور شاعری پر

انگلشی شعراء کا اثر بتایا ہے۔ جن کا مطالعہ فیضؔ نے بی۔اے اور ایم۔اے انگریزی کے دوران کیا اور جو امرتسر میں انگریزی ادب کی تدریس کے دوران بھی جاری رہا۔ فیضؔ نے براوؤننگ کی ایک نظم سے خیالات لے کر اپنی شاعری کے مزاج کو بھی تبدیل کیا۔ اس بارے میں پروفیسر آل احمد سرور کا بھی یہ کہنا ہے کہ:

> ''فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر، جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس قزح جلوہ گر ہے''(۱۴)

براوؤننگ کے خیالات سے ماخوذ نظم کا ایک شعر مثال کے طور پر یہاں پیش کیا جاتا ہے:

مجھے دے دے!

رسیلے ہونٹ ، معصومانہ پیشانی حسین آنکھیں

کہ میں ایک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں

تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''فیض کے روحانی تخیل سے کبھی وہ ہونٹ وہ پیشانی بھونیں اور وہ حسین آنکھیں جدا نہ ہو سکیں ورنہ وہ یہ نہیں کہتے:

''تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے''(۱۵)

تقی عابدی نے واضح کیا ہے کہ حسن کے سراپا نے فیض کو سر سے پیر تک گھیرے رکھا حالانکہ نقش فریادی میں انہوں نے نظامی گنجوی کے مصرع ''دلے بفروختم و جانے خریدم'' سے استفادہ کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ انہوں نے غم جاناں سے غم دوراں کی طرف سفر کیا ہے مگر اس کے باوجود وہ ساری زندگی نہ دل ہی بیچ سکے اور نہ جان ہی خرید سکے اور اسی دوراہے پر اپنی زندگی بسر کر دی۔ انہوں نے موضوع سخن میں اپنی موزوں طبع اور فطری رجحان کا نقشہ کھینچا ہے۔ فیض کو آنکھوں کی افسوں گری کی کرشمہ سازی پر مہارت حاصل ہے۔ ان کے پیش نظر زندگی کا مقصد عزت نفس کے ساتھ ساتھ جسم کی راحت اور حواس کی تسکین بھی ہے تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''فیض اقبال کی طرح زندگی کے شاعر نہیں بلکہ وہ زندگی کے مسائل کے شاعر ہیں اُن کا عشق ماورائی نہیں بلکہ مادی ہے۔ جس میں ان کی جیتی جاگتی ہنستی گاتی خوب صورت حسن پیکر محبوب کا جلوہ نمایاں ہے۔'' (۱۶)

فیض کی شاعری میں جمالیاتی نقوش کو ثابت کرنے کے لیے تقی عابدی نے کچھ اشعار خدو خال کے موضوعات پر نقل کیے ہیں۔ جن میں پیرہن اور رنگ پیرہن۔ آنکھیں۔ لب و رخسار۔ قد و قامت جیسے نقوش کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے دلیل کے طور پر متعدد اشعار پیش کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار یہاں بھی پیش کیے جاتے ہیں:

پیرہن اور رنگ پیرہن :۔

؎ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن
کچھ تو ہے ! جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین

آنکھیں:۔

؎تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

لب ورخسار:

؎ہر بھیگی ہوئی رات تیری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج تیرے ہونٹوں کی فضا ہے

قد وقامت:

؎دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگ نیاز پیدا ہے

حسن کا سراپا ایک مشکل تخلیقی کام ہے جسے فیضؔ نے اسے نہایت ہی خوبصورتی سے ادا کیا ہے تقی عابدی نے پاکیزہ جنسی شاعری کے طور پر فیضؔ کی ایک نظم ''میرے ہمدم میرے دوست'' درج کی ہے اور کہا ہے کہ یہاں الفاظ کا کرشمہ گنجینۂ طلسم سے کم نہیں ۔علامات اور

اشعاروں میں جذبات کی نگارش ہے جیسے:

؎ کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں

اس پر بعض ناقدین نے اعتراضات بھی کیے ہیں کسی نے ''برفاب'' اور کسی نے ''شفاف'' الفاظ پر مگر فیض نے اس کا جواب بھی اپنے ایک شعر میں دے دیا ہے جو کہ یوں ہے:

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

تقی عابدی فیضؔ کی جذبات نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایسی جذبات نگاری جو کاغذ پر لکھی جائے لیکن پڑھنے والے کی رگ و پے میں حرکت پیدا کر دے اور ذہن میں ثبت ہو جائے بڑی شاعری کہلاتی ہے۔'' (17) ص ۳۳۷

فیضؔ اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدروں کے حوالے سے تقی عابدی نے جو مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے فیضؔ کے ساتھ اختر شیرانی کا دلچسپ موازنہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس مضمون میں تقابلی تنقید کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فیضؔ کی شاعری پر شیرانی کا کتنا اثر ہے۔ اور انہوں نے ان کا کتنا اثر قبول کیا وہ ان سے

کتنے متاثر رہے کیوں کہ جس عہد میں فیضؔ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا وہ ان کی جوانی کا دور تھا اس وقت ان کے سامنے اختر شیرانی ،ن۔م راشد اور حسرت موہانی تھے۔ جس کا واضح ثبوت ان کے اس انٹرویو سے ملتا ہے جو انہوں نے جاوید شاہین کو دیا تھا فیض بیان کرتے ہیں:

''ہم نے 1928ء-1929ء میں جب شاعری شروع کی ہم اُس وقت کالج میں تھے۔ سیالکوٹ میں اس وقت ہمارے سامنے اختر شیرانی تھے۔ اور اختر شیرانی سے زیادہ تھے۔ ن۔م راشد۔ وہ ہمارے ساتھ ہم سے ایک سال آگے تھے تو سلسلہ حسرت موہانی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اختر شیرانی اور ن۔م راشد سے ہوتا ہوا تاثیر تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ ہم نے جو ابتداء کی وہ انہی کے زیر اثر کی۔ لیکن ہماری کوشش یہ رہی کہ کہیں ان کی نقل نظر نہ آئے۔ اس وقت کا ہمارا بہت سا کلام ہے جو ہم نے کسی مجموعے میں شائع نہیں کیا۔ بہر حال ابتدا اسی اثر کے تحت ہوئی۔'' (۱۷)

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد جو نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فیضؔ کا ابتدائی کلام حسرت موہانی اور اختر شیرانی سے متاثر تھا۔ فیض نے حسرتؔ اور اخترؔ کے کلام کی نقل نہیں کی۔ اور اس وقت کا بہت سارا کلام فیضؔ نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ تقی عابدی کے مطابق وہ کلام جو فیضؔ نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا اسے

کھوجنے اور شائع کرنے کی ضرورت ہے اور اسے شائع کیا جانا چاہے۔تقی عابدی نے فیض کے چند مطبوعہ انٹرویوز کو اس کتاب میں شامل کیا ہے جس میں فیض نے تفصیلاً اس وقت کی شاعری اس دور کے شعرا ان کے کلام اپنے کلام اور جن شخصیات سے وہ متاثر رہے اور جن کا اثر انہوں نے قبول کیا کھل کر بیان کیا ہے۔اور فیض نے اس بات کا افسوس بھی ظاہر کیا ہے کہ ان کی عمر کی طرح اُردو تنقید نے بھی اختر شیرانی سے وفا نہیں کی۔ اس بابت فیض رقمطراز ہیں:

> ''یہ بات تعجب خیز ہے کہ اختر شیرانی جیسے شاعر کو اردو شعر و ادب نے صرف ان کے نام تک محدود کر دیا اور خواص بھی ان کے کام سے سطحی طور پر آشنائی رکھتے ہیں۔بعض تنگ نظر ادیب نما محتسبوں اور واعظوں نے ان کے کلام کو رومانی شاعری نہیں بلکہ معمولی درجہ کی بازاری سستی چوما چاٹی کی شاعری کہہ کر ان کی شاعری کا بہیمانہ قتل کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شاعر اور اس کی یہ رومان انگیز شاعری جس میں درد جاناں کے ساتھ ساتھ درد جہاں کے مسائل اور وطن محبت کے جذبات بھرے ہوئے ہیں صرف نام و نمود کا ہلکا سا نقش بن کر رہ گئی۔''(۱۸)

تقی عابدی نے اس مضمون میں فیض کے ساتھ ساتھ اختر کی شاعری کا بھی سرسری جائزہ پیش کیا ہے اور اختر کی شاعری کو اردو شاعری کا نیا روپ قرار دیا ہے۔جس میں انہوں نے

(اختر) تنہائی کے عالم میں کبھی سلمیٰ۔ کبھی عذرا تو کبھی ریحانہ کو کا انتظار کیا ہے۔ تقی عابدی فیض اور اختر کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہماری اس تحریر کا مقصد اختر اور فیض کی شاعری کا تقابل نہیں بلکہ فیض کی شاعری میں اُس لہجہ کا تاثر اور تسلسل کا سراغ پانا ہے۔''(۱۹)

ان شعرا کی شاعری کے مطالعہ کے بعد تقی عابدی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اختر کی شاعری میں حسین استعارے دلربا کنایات خوبصورت تشبیہات ہیں جس میں وہ اپنی محبوب نظر کا پیکر تراشتے ہیں۔

دل میں اب یوں تیرے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں (اختر)

اور فیض پرانی تشبیہات استعارات علامات اور کنایات میں نہ صرف نئے معنی بھرتے ہیں بلکہ ان میں معنی آفرینی کے نئے جوہر بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

(فیض)

یہاں میں اپنی بات تقی عابدی کے ایک قول پر اختتام پذیر کر رہی ہوں جس میں ہمیں مندرجہ بالا بحث کا پورا نچوڑ ملتا ہے:

''اختر شیرانی اور فیض کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فیض
نے رومانی مکالمہ نگاری تشبیہات استعارات اور علامات کا عمدہ اور انوکھا
استعمال کچھ نہ کچھ اختر شیرانی اور حسرت موہانی سے ضرور سیکھا ہوگا۔ نقش
فریادی کی رومانی شاعری پر اختر شیرانی کا اثر خاص طور سے محسوس کیا جاسکتا
ہے۔ جو بہ تدریج کم ہوگیا اور میرے دل میرے مسافر تک تقریباً نہ ہونے
کے برابر ہے۔''(۲۰)

تقی عابدی نے ''کون بڑا؟ جوش یا فیض'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے فیض اور جوش کی شاعری کا مفصل تجزیہ کیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقابل کیا ہے۔انہوں نے دونوں شاعروں کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کو بروئے کار رکھتے ہوئے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ تقی عابدی کے الفاظ میں زیادہ موزوں رہے گا۔لہذا وہ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ جوش اس عہد کے بڑے شاعر تھے انہوں نے اردو شاعری کے
دامن کو وسعت دی ہے اسے طرز ادا کی نئی سمتوں سے روشناس کروایا ہے۔
مردانہ اور باغیانہ لہجہ دیا ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو کے ذخیرہ الفاظ
سے شاعری میں کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ ان کی رباعیات کا تو ہمعصر اردو
شاعری میں جواب ہی نہیں فراق، رواں، جان نثار اختر سب کی رباعیات
اپنی جگہ خوب صورت اور مستحکم ہونے کے باوصف جوش کی رباعیات کے

مقابلے میں کم تر ٹھہرتی ہیں۔'' (۲۱)

حاصل یہ ہے کہ فیضؔ کے ساتھ جوش کا موازنہ بڑا دلچسپ ہے اس میں صاف گوئی کے نمونے ہیں اور تقابلی تنقید کا رنگ جھلکتا ہے کیونکہ تقی عابدی کا شعور اور ان کی فکر اعلی اور غیر جانبدار ہے۔ تقی عابدی نے ''فیض اور بادہ و ساغر'' کے عنوان کے تحت لکھے گئے مضمون میں یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ فیض نے اکثر غزلوں قطعوں اور نظموں میں شراب پینا، ساغر اور قلقل مے جیسے مضامین سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ جس کی واضح مثالیں انہوں نے فیضؔ کے متعدد اشعار سے دی ہے جس میں فیضؔ نے ان قدیم علامات کا استعمال کیا ہے مثال کے طور پر فیضؔ کی ایک غزل کا مطلع دیکھئے جس میں انہوں نے اس مضمون مینا شراب اور ساغر کو خوب صورت طریقے سے باندھا ہے:

؎ آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اُس کے بعد آئے جو عذاب آئے

فیض کے مجموعہ کلام ''دست تہ سنگ'' کی ایک غزل کا شعر بھی اس حوالے سے ایک اہم مثال ہے:

؎ چھلک رہی ہے ترے حسن مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

تقی عابدی نے فیضؔ کی نظم ''منظر'' کے ایک بند کو بطور مثال پیش کیا ہے جس میں فیض نے

نظم کے منظر کو شراب جام اور صراحی سے متحرک اور رنگین بنادیا ہے۔ نظم کا یہ بند دیکھئے:۔

بہت آہستہ ہلکا۔ خنک رنگ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صُراحی، تیرے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

حاصل کلام یہ کہ قدیم غزل کے علامات رندی کے جس رنگ کا مضمون تھا اُسی رنگ میں باندھنے کا کامیاب تخلیقی عمل فیضؔ کی شاعری کی شناخت ہے یہی نیا لہجہ فیضؔ سے شروع ہو کر فیضؔ پر ختم ہو گیا، اُن کے شعری سرمایے میں جگہ جگہ اِن علامتوں کا مختلف پیکروں کی صورت میں دلکش اور دلفریب روپ نظر آتا ہے جن کو ثابت کرنے کیلئے تقی عابدی نے ان کے کلام سے متعدد اشعار اور بند پیش کر کے مثالوں سے واضح کیا ہے:

''فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام'' تقی عابدی کا نہایت ہی اہم اور خوبصورت مضمون ہے جو ان کی دیدہ ریزی اور عرق ریزی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے اس مضمون میں تقی عابدی نے نہایت ہی منصفانہ لہجے اور غیر جانبداری سے فیضؔ کے کلام میں موجود غلطیوں اور نقائص کو قارئین اور محققین کے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اس تلخ موضوع پر کام کرنے والے اُن ناقدین و محققین کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات کو

واضح دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے جہاں وہ اُن سے متفق ہیں وہاں ان کی آراء کا اتفاق کیا ہےاور جہاں وہ اُن سے متفق نہیں ہیں وہاں ان سے انحراف بھی کیا ہے۔

اس مضمون کے مطالعے سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تقی عابدی نے نہایت ہی محنت اورعرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اپنا مقالہ تحریر کیا ہے۔ اور کسی طرح کے مبالغے یا جانبداری سے کام لینے سے گریز کیا ہےاورنہایت ہی صاف شفاف لہجے میں اپنی بات کوثابت بھی کیا ہے۔ دنیا کے باقی شعرا کی طرح اردوادب کے شعرا کے کلام میں بھی غلطیوں کا پایا جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے ہمارےاردوشعراء کے کلام میں بھی غلطیاں ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے۔ یہاں تقی عابدی کا ایک جملہ کافی موزوں دکھائی دیتا ہے بقول ان کے ''کلام خالق اور مخلوق میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک اغلاط سے پاک اور دوسرا نقص سے مجہیز'' اسی طرح فیض کی شاعری بھی نقائص سے پاک نہیں۔ان کے کلام میں بھی زبان و بیان۔محاورے۔ الفاظ، تراکیب،قوافی کی غلطیاں وغیرہ نظر آتی ہیں یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان کی شاعری میں الفاظ کے ذخیرے کی محدودیت کا بھی ذکر کیا ہے۔بعض نے مبالغہ اوربعض نے معاندانہ رویے سے نقصان بھی پہنچایا ہے۔

تقی عابدی لکھتے ہیں کہ:

''میرے ہمدم میرے دوست''''دوآوازیں''''نثار تیری گلیوں''پران نظموں میں اچھی نظمیں بننے کے امکانات تھے اوربعض ٹکڑے اچھے بھی ہیں یہاں''میرے ہمدم میرے دوست'' کے ایک بند کی

مثال پیش کی جارہی ہے جو تقی عابدی نے اس مضمون میں رقم کی ہے۔فیض نے اس نظم کی شروعات اچھی طرح کی ہے مگر جب وہ یہ بند لکھتے ہیں کہ:

؎ گر میرا حرف تسلی وہ"دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہوجائے

اس بند میں اجڑا، بے نور، داغ، جو اشعارے ہیں خلط ملط ہوجاتے ہیں اس حوالے سے تقی عابدی لکھتے ہیں:

"ان شعروں میں خون نہیں دوڑتا اشعارے بھی خلط ملط ہوجاتے ہیں حرف تسلی خیر دوا تو ہوسکتا ہے جس سے بیمار جوانی کو شفا ہوجائے لیکن اسی دوا سے تذلیل کے داغ بھی ڈھل جاتے ہیں اجڑا ہوا دماغ لہلہا اٹھتا ہے اور بے نور دماغ منور ہوجاتا ہے۔ دوا ایک اشعارہ ہے۔ اجڑا، بے نور، دماغ دوسرے اشعارے ہیں اور یہ سب بری طرح خلط ملط ہوجاتے ہیں۔"(۲۲)

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے مضمون "فیض کی غزل" میں فیض کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس شعر:

؎ کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت ہیں
بڑھتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

میں ''کہ'' بروزن استعمال ہوا ہے جو درست نہیں ہے اور تقی عابدی نے اس اعتراض کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں تقی عابدی نے ان اشعار کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے جن میں فیضؔ نے غلط محاورے اور استعارے استعمال کیے ہیں جو زبان کے لحاظ سے نامانوس ہیں لہٰذا اس پورے مضمون کا نچوڑ خود تقی عابدی کی تحریر میں یہاں پیش کیا جاتا ہے تا کہ قاری خود اندازہ لگا سکے کہ تقی عابدی کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔

''فیض ایک بڑے شاعر تھے لیکن عظیم نہیں تھے جن سے کوئی دبستان منسوب ہو۔ احمد فیضؔ سے مربوط جلسوں میں اور کچھ تحریروں میں فیضیات کی اصطلاح سننے اور پڑھنے میں آئی۔ اگر یہاں فیضیات سے مراد فیضؔ کے فن اور شخصیت پر بات چیت سے ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کا مطلب کوئی شاعری کا دبستان ہے جن میں میر تقی میرؔ سے منسوب دبستان کو انداز میرؔ کہتے نہیں نہ جانے کیوں علمائے ادب وشعر نے اسے ''میریات'' کے بجائے ''میرؔ کا انداز'' ہی کہا ہے۔

؎ ''نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب''

یا غالب سے منسوب غالبیات میرؔ انیس سے منسوب انیسیات اور محمد اقبالؔ سے منسوب اقبالیات یہ چار بڑے اسکول بڑی شاعری کے مدرسے ہیں۔ ان چاروں شاعروں کی

شاعری آفاقی شاعری تسلیم کی گئی ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنا لہجہ اور زبان ساتھ لاتا ہے۔ وہ ادب کے معینہ قوانین میں تصرف کر کے اپنے لیے خاص الفاظ کی تراش خراش بھی کرتا ہے اور جدید الفاظ بناتا ہے اور قدیم الفاظ کو نئے معنی عطا کرتا ہے الفاظ اس کی مخلوق ہوتے ہیں اور وہ ان سے اپنے طرز بیان کے مزاج کے مطابق جیسا چاہے ویسا کام لیتا ہے۔ جسے اس کے ہم عصر اور آئندہ آنے والے قبول کر لیتے ہیں بڑی شاعری کو مختلف زاویوں سے پرکھا جاتا ہے، نظریہ کی پاسداری بڑی شاعری کی پہچان نہیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر مشہور شاعر بڑا شاعر نہیں ہوتا کیوں کہ اس کی شاعری کو بڑی شاعری کی صف میں رکھا نہیں جاسکتا اور اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر بڑا شاعر مشہور ہو شہرت اور عظمت شاعری کے شہر کے دو الگ الگ مینارے ہیں، ایک اچھا شاعر کسی صنف یا صنعت میں ممکن ہے کمال حاصل کر لے پھر بھی اس کا کلام اس لیے عظیم اور آفاقی شاعری میں شمار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس نے کوئی جدید زبان اور طرز بیان کا مواد خود ہی ایجاد نہیں کیا بلکہ دوسروں کی زمینوں کو مستعار لے کر عمدہ فصل اُگائی بڑا شاعر وہ ہے جو یہ ادعا کرے کہ:

ے ہم آسمان سے لائے ہیں اِن زمینوں کو

صرف ایک خوبی شہرت دیکھ کر سر پر تاج نہیں رکھا جاسکتا۔'' (۲۳)

مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فیضؔ نے متعدد مقامات پر یہ صاف کیا ہے کہ انہوں نے خود کو عظیم اردو شعراء کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ

بعض لوگ فیضؔ کو بڑا شاعر مانتے ہیں فیضؔ نے اکثر اوقات خود کو بڑا شاعر کہنے سے انکار کیا ہے۔اس حوالے سے تقی عابدی کا ایک مضمون ''فیض کے کلام پر ریویو'' بھی ہے جس میں فیض کے خطوط انٹرویوز وغیرہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُن میں کتنی انکساری تھی۔

؎ فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد رہے

تقی عابدی نے فیضؔ کے ان تمام انٹرویوز کو اس کتاب میں شامل کیا ہے جن میں (28) اٹھائیس اشخاص نے ان سے (450) ساڑھے چار سو سوالات پوچھے ہیں۔فیضؔ سے منسوب بہت سارے انٹرویو ادبی شماروں میں شائع ہو چکے ہیں مگر آج تک کسی نے اس سلسلے میں کوئی ایسی کتاب تصنیف یا ترتیب نہیں دی جس میں ان کے انٹرویوز کے اقتباس شامل کیے گئے ہوں تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق مطبوعہ انٹرویوز کی تعداد (22) بائیس ہے جو فیض نے مختلف اشخاص کو دیئے ہیں اور ان کے پاس مطبوعہ شکل میں موجود بھی ہیں۔تقی عابدی نے مرزا ظفر الحسن کے مضمون ''عہد طفلی سے عنفوان شباب تک'' کی جو انہوں نے انٹرویو کی شکل میں لکھنے کی کوشش کی ہے مگر کامیاب نہ ہو سکے کو انٹرویو کے زمرے میں نہیں رکھا ہے۔اور جو انٹرویو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اور مختلف عناوین کے تحت تکرار کے ساتھ مختلف جریدوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ان سے بھی انہوں نے ایک اکائی کے طور پر سمجھ کر استفادہ کیا ہے۔اور وہ سوالات جو انٹریو کرنے والے شخص کی خودنمائی سے متعلق تھے کو

بھی حذف کر دیا گیا اور جن سوالوں میں تکرار ہوئی اُن میں سے بھی ڈاکٹر عابدی نے اس سوال کو چنا اور کتاب میں شامل کیا جس کا فیضؔ نے مکمل جواب دیا۔ کیونکہ فیض اکثر اوقات جواب کوٹالنے کے لیے ''ہوں''،''ہاں'' سے کام لیتے تھے۔ یہاں تحریر کی گئی تمام باتوں کا خود تقی عابدی نے بھی اقرار کیا ہے:

ان انٹرویوز کی بابت وہ خود بھی یوں رقمطراز ہیں:

> ''قارئین کی سہولت کی خاطر ہم نے فیضؔ سے کیے جانے والے سوالات کومختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے اگر چہ ہم جانتے ہیں کہ یہ مطالب پوری طرح سے خانوں میں بندنہیں کیے جاسکتے ۔ چونکہ ان کی حدیں معین نہیں ہوتیں۔فیض کے سوالات کو ابتدائی تعظیم ذاتی شخصی مسائل اردو اور پنجابی شاعری ادبیات عالم غالب اردو زبان فنون لطیفہ، سیاست، ترقی پسند تحریک صحافت، پاکستانی کلچر، سازش کیس، لبنان ، روس اور نئی نسل کے مسائل پرتقسیم اورترتیب کیا گیا ہے۔''(۲۴)

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری خیال کرتی ہوں کہ فیضؔ کا پہلا انٹرویو1946 اور آخری انٹرویو 1984 میں لیا گیا ہےتقی عابدی نے موضوع کی مناسبت سے کچھ غیرضروری الفاظ کو نکال دیا ہے جیسے ''سگریٹ سلگاتے ہوئے'' تا کہ متن پر اثر نہ پڑے فیضؔ کے تمام انٹرویوز کی تواریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تقی عابدی نے قیاس سے کام نہیں لیا۔اس کے باوجود

مضمون کی شرینی اور لطافت اور تاثیر میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

یہاں مقالے کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے تفصیلات سے گریز کر رہی ہوں لہٰذا ان تمام اشخاص یعنی انٹرویو کرنے والے افراد کے نام درج کر رہی ہوں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ کن کن افراد نے فیضؔ کے انٹرویو کیے ہیں اور جن کے انٹرویوز کو تقی عابدی نے اپنی کتاب میں شامل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔ان افراد کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

انتظار حسین، افتخار عارف، احمد فراز، عبادت بریلوی، اشفاق احمد یوسفی، آئی۔اے۔ رحمٰن، کرشن گولڈ، قتیل شفائی، سہیل احمد خان، ممتاز ممن، سعادت سعید، حسن رضوی، اجمل نیازی، آصف فرخی، حفیظ صدیقی، جیلانی کامران، طاہر مسعود، شفیع عقیل، مسعود اشعر، نصرت چودھری، امرتا پریتم، منور حفیظ، خالد فاروق، فارغ بخاری، غلام حسین اظہر، صفدر مہر، مظفر اقبال اور افضل امام۔ان انٹرویوز کی مدد سے فیضؔ سے متعلق بہت ساری گتھیوں کو کھولا اور سلجھایا جا سکتا ہے۔

تقی عابدی ایک ایسے محقق ہیں جو اپنی پوری طاقت پوری محنت صرف کر کے اپنا مضمون تحریر کرتے ہیں۔اس مضمون میں بھی انہوں نے نہایت ہی محنت صرف کر کے ان تمام انٹرویوز کو یکجا کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے جو نہایت ہی محنت طلب اور دیدہ ریزی کے حامل ہیں جس سے ان کی اردو ادب کے تئیں دلچسپی اور لگن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

تقی عابدی نے زیر مطالعہ کتاب ''فیض فہمی'' میں فیض کی تقریظیں...تخلیق وتنقید کی وحدت'' کے عنوان سے جو مقالہ شامل کیا ہے اس میں انھوں نے فیض کی پراگندہ تقریظوں اور بکھری ہوئی تحریروں کو موتی کی طرح سلک تحریر میں پُرو دیا ہے اور کچھ وہ تعارفی نوٹ جو فیض نے خود اپنی کتابوں پر لکھے تھے انہیں بھی جمع کیا ہے تاکہ قارئین کو اس دور کے حال و احوال سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان تقریظوں اور تحریروں کو مذکورہ تاریخی حوالوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔اس کی بابت تقی عابدی لکھتے ہیں:

''شاید یہ تقریظیں آج کے تقریظ نگاروں کے لیے مشعل راہ ہو جو ہر غزل یا افسانہ نگار کے مجموعہ تخلیق پر صرف نام ونشان بدل کر تقریباً پورا متن دوسرے جملوں میں ادا کر دیتے ہیں۔'' (۲۵)

تقی عابدی کا یہ مضمون ہمیں فیض کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثر سے بھی متعارف کراتا ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فیض ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ نثر نگار بھی ہیں جن کی تحریر کا ہر لفظ اہمیت کا حامل ہے۔ تقی عابدی نے بڑی محنت کے ساتھ ان تحریروں کو جو پیش لفظ مقدمہ اور تقریظ وغیرہ کی صورت میں ہیں یکجا کر کے اس کتاب میں شائع کیا ہے جو نہ صرف تحقیق طلب تھے بل کہ ان کی ایک انفرادی حیثیت بھی تھی۔تقی عابدی نے فیض کے انٹرویوز اور تحریروں کو جمع کرنے کا جو فریضہ انجام دیا ہے اس سے قبل شاید ہی کسی نے اس طرف غور وخوض کیا ہو اور محنت کر کے انہیں یکجا کر کے

کسی کتاب کی زینت بنایا ہو۔تقی عابدی کے سوچنے سمجھنے اورغور کرنے کا طریقہ بھی دوسروں سے کافی مختلف ہے وہ جس کام کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اس میں کسی بھی زاویہ سے کوئی کمی باقی نہیں رکھتے اور جتنی محنت درکار ہوصرف کرتے ہیں یہ ایک اچھے محقق کی پہچان ہے جس پرتقی عابدی کھرا اترتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون میں فیضؔ نے مختلف اشخاص کے مجموعہ کلام، افسانوی مجموعہ کلام، ڈراموں کے مجموعوں مضامین اور مختلف کتب وغیرہ پر جو پُر مغز تقریظیں مقدمے اور پیش لفظ تحریر کیے ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔جن میں ان کے (فیضؔ) خود کے مجموعوں پر لکھی گئی تحریر کو بھی شامل کیا ہے۔ چونکہ اس مقالے میں ان کی تحریروں کے حوالے سے مفصل گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔لہذا چند اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے تاکہ قارئین ان کی تحریر سے اندازلگاسکیں کہ فیضؔ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔زیرمطالعہ کتاب میں سب سے پہلے ان کی اس تحریر کو درج کیا گیا ہے جوفیض نے خود اپنے ''پہلے شعری مجموعے'' ''نقش فریادی'' پر 1941ء میں تحریر کی تھی جس میں انہوں نے اس مجموعے کا تعارف پیش کرتے ہوئے اُس کی وجہ اشاعت کے ساتھ ساتھ اس میں شامل نظموں کے حوالے سے اپنی بات رکھی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے شاید اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہوں لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں اصولاً مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی

تعداد میں جمع ہو جائیں لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا۔''(۲۶)

اس کے بعد دوسرے نمبر پر ان کے اس مقدمہ کو رکھا گیا ہے جو 1952 میں انہوں نے اپنے مجموعہ ''دست صبا'' پر تحریر کیا تھا۔ اس مقدمہ سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین کو ان کی تحریر کی شگفتگی کا اندازہ ہو سکے:۔

''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے فن زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق واستطاعت پر ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا ہر طور پر ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔''(۲۷)

1962ء میں فیض نے اپنے مضامین کے مجموعہ ''میزان'' پر جو مقدمہ تحریر کیا۔ اُسے بھی شامل کتاب رکھا ہے ان کے مضامین کے بارے میں بیان کرنے سے بہتر ہے کہ خود فیضؔ کے لفظوں میں ہی بیان کر دیا جائے جو زیادہ قابل توجہ اور مفید رہے گا:۔

''ادبی مسائل پر سیر حاصل کے لیے نہ کبھی فرصت میسر تھی نہ دماغ۔ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں ان مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع البتہ ملتے

رہے۔ یہ مضامین انہیں باتوں کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے ان میں روئے سخن
علماء سے نہیں عام لکھنے والوں سے ہے جوادب کے بارے میں جاننا چاہتے
ہیں۔"(۲۸)

فیض کے مقدمات اور تقریظوں سے ہمیں ان کے بارے میں متعدد معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں اور ان کو جاننے اور سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ان سے جڑی کئی باتوں عادات و اطوار اخلاق وغیرہ کا بھی علم ہوتا ہے۔لہٰذا اس حوالے سے بھی ان کی تحریر کافی سودمند ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کب اور کیسے رومانی شاعری سے ترقی پسندی کی طرف سفر شروع کیا اور کب ان کا نظریہ بدلا وغیرہ سے متعلق بھی تمام جانکاری مل جاتی ہے۔ جو ہم طالب علموں نے اکثر و بیشتر دوسروں کی تحاریر سے پڑھیں اور سمجھیں ہیں۔مگر ان تحاریر کے ذریعے ہمیں خود انہیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ دوسروں کی قائم کی ہوئی آراء سے ہٹ کر خود اپنی رائے قائم کرنے کا بھی موقع حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی ان کی یہ تحاریر کافی اہم ثابت ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ فیض نے 1946ء میں "دست تہہ سنگ" پر مقدمہ لکھا ہے اُسے بھی شامل کتاب رکھا ہے جو کافی معلوماتی نوعیت کا بھی ہے۔ پھر 1971ء میں اپنے خطوط کے مجموعے "صلیبیں میرے دریچے میں" پر جو مقدمہ فیض نے تحریر کیا ہے اُس کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ان تمام تقاریظ اور مقدمات کے بارے میں تفصیل سے لکھنا مشکل

ہے۔لہٰذا موضوع کی طوالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہاں ان شخصیات کے نام معہ رتاریخ لکھے جارہے تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ فیضؔ نے اپنے علاوہ کہاں کہاں اپنی نثر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

(1) 1938ء میں مجازؔ کے کلام آہنگ پر مقدمہ لکھا

(2) 1953ء میں سیف الدین سیف کے مجموعہ کلام ''خم کاکُل'' پر پُر مغز تقریظ لکھی

(3) 1971ء میں فیضؔ نے عرفانہ عزیز کے کلام ''برگ ریز'' پر تقریظ لکھی

(4) 1978ء میں کیفی اعظمی کے منتخب کلام ''آوارہ سجدے'' پر ماسکو سے پیش لفظ لکھا

(5) امجد اسلام امجد کے کلام پر مختصر تقریظ لکھی۔

(6) افتخار عارف کی شعری تصنیف ''مہر دونیم'' پر پُر مغز تقریظ رقم کی۔

(7) 1954 میں فیضؔ نے خدیجہ مستور کے افسانوں کے مجموعہ ''چند روز اور'' پر تقریظ لکھی

(8) 1962 میں ہاجرہ مسرور کے افسانوں کے مجموعہ ''وہ لوگ'' پر تقریظ لکھی

(9) 1971 میں آغا ناصر کے ''سات ڈرامے'' پر تقریظ لکھی

(10) 1971 میں مصفنہ علی مظہر رضوی کے ڈراموں کے مجموعہ 'عشق عبث بدنام ہوا'' پر نوٹ لکھا۔

(11) 1958 میں میرا جی کے مضامین کے مجموعے ''مشرق ومغرب کے نغمے'' پر تقریظ لکھی

(12) 1964ء میں عنایت الٰہی ملک کی کتاب ''راگ رنگ'' پر لکھا

(13) 1972ء میں سید محمد اولیس کی کتاب ''تعلیم الکتاب'' پر تحریر لکھی۔

(14) 1969ء میں صادقین کے ''مصور دیوانِ غالب'' پر نوٹ لکھا

(15) 1973 میں صادقین کی خطاطی ''روح القدوس کا جمال'' پر تقریظ لکھی۔

(16) 1973 میں مختار زمن کے مجموعہ تحریر ''باتوں کے خربوزے'' پر تبصرہ لکھا۔

(17) مرزا ظفر الحسن کی کتاب ''ذکر یار چلے'' پر تحریر لکھی۔

(18) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی مشہور خودنوشت ''گردِ راہ'' پر تحریر لکھی۔

(19) بلوچی کے اخبار ''نوکین دور'' کے حکمران نمبر پر نوٹ لکھا

(20) ماہنامہ افکرا کے متعلق لکھا۔

(21) بزم ادب اردو ٹورانٹو کی جانب سے۔

''صہبا'' دو ماہی کے فیض نمبر پر فیض کی تحریر۔

واضح رہے کہ یہ تمام تحریریں جن کو متذکرہ بالا درج کیا گیا ہے کو تقی عابدی نے جوں کا توں اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ جو فیض کی نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔

تقی عابدی نے ''فیض کا منظوم ترجمہ'' ''پیام مشرق'' جو کہ ان کے تحقیقی مقالے پر مبنی ہے کو بھی شامل کتاب رکھا ہے۔ فیض نے علامہ اقبال کے ''پیام مشرق'' کے انتخاب کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق فیض نہ صرف اقبال بلکہ داغستان کے ملک الشعراء ''رسول حمزہ''۔ ترکی کے معروف شاعر ''ناظم حکمت'' اور قازقستان کے ممتاز

شاعر ''اولجز عمر علی سلیمان'' کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو کہ ''شام شہر یاراں'' اور ''غبار ایام'' میں موجود ہے۔تقی عابدی لکھتے ہیں:

''فیض نے علامہ اقبال کے فارسی مجموعہ ''پیام مشرق'' کے قطعات غزلیات اور نظموں سے انتخاب کر کے منظوم اردو ترجمہ کیا جو 1977ء میں نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادتِ علامہ اقبال اکادمی لاہور نے رپن پرنٹنگ پریس لمیٹڈ لینک روڈ لاہور سے گیارہ سو کی تعداد میں شائع کیا۔ یہ کتاب اب کمیاب ہے۔''(۲۹)

فیض احمد فیض نے پیام مشرق کا انتخاب خود کیا اور اس انتخاب میں پیام مشرق سے قطعات غزلیات اور نظموں کو چُن کر ترجمہ کیا ان کی اس چُون پر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''فیض نے ان میں کوئی خاص موضوعاتی التزام نہ رکھا بلکہ عموماً ان اشعار کو منتخب کیا جو آسانی سے ان کی گرفت میں آسکتے تھے ورنہ فیض بہت سے ایسے مضامین کو نظر انداز نہ کرتے جو پیام مشرق میں موجود ہیں اور ساری عمر ان کی دلچسپی کا مرکز بنے رہے اس کا ثبوت خود ان کا پیش لفظ ہے جو انہوں نے اس منظوم ترجمہ میں لکھا ہے۔''(۳۰)

فیض نے پیام مشرق کے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے اُس کی تفصیل تقی عابدی یوں تحریر کرتے ہیں کہ فیض نے ''پیام مشرق'' کی تمہید کا انتخاب نہیں کیا جو کہ فرماں روائے

افغانستان امان اللہ خان کوبطور پیش کش سات بندوں میں لکھی گئی تھی۔

''پیام مشرق'' کے پہلے حصے ''موسومہ بہ لالۂ طور سے 163 '' قطعات سے ''56 'اشعار منتخب کیے گئے ہیں تقی عابدی نے لکھا ہے کہ علامہ سمیت کئی شارحین اور علمائے اقبالیات نے اِن کو رباعیات کے زمرے میں رکھا ہے جب کہ تقی عابدی نے دعوی کیا ہے کہ یہ قطعات رباعی کے (24) چوبیس اوزان میں شامل نہیں ہیں اس لیے انہیں رباعی کہنا غلط ہے۔

دوسرے حصے ''افکار'' سے اکاون نظمیں شامل ہیں جب کہ فیض نے (22) مختصر نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ تیسرے حصے ''مَے باقی'' میں 45 غزلیں ہیں جن میں 20 غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور چوتھے حصے ''نقش فرنگ'' سے صرف (4) نظموں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تقی عابدی نے اقبالؔ کے بسیط مقدمہ سے مختصر اقتباسات بھی پیش کیے ہیں تا کہ اس تصنیف کے متن سے آگاہی ہو سکے۔ ''پیام مشرق'' کی وجہ تصنیف بتاتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''پیام مشرق'' مشہور جرمن حکیم اور شاعر گوئٹے کی شاہکار تصنیف ہے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں لکھی ہے اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے، اقبالؔ نے پیام مشرق میں ان حقائق و معارف کو بیان کیا ہے جن کا تعلق فرد اور قوم کی باطنی تربیت سے ہے۔ پیام مشرق پانچ

حصوں پر مشتمل ہے'' (۳۱)

تقی عابدی نے اس مضمون کے حوالے سے کوئی قدیم یا جدید سند دریافت نہیں کی ہے البتہ کچھ مصرعوں کی تقطیع اور بعض قطعات کے مصرع دوم سے ثابت کیا ہے کہ یہ رباعیات نہیں بلکہ قطعات ہیں اور فیض نے اپنے منظوم ترجمہ میں کہیں رباعی کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ تقی عابدی کے مطابق فیض نے ترجمے کے دوران اغلب قافیے وہی رکھے ہیں اور بعض قطعات میں ایک دو اردو الفاظ رکھ کر کے پورے قطعہ کو عام فہم بنادیا ہے۔ جس کی وجہ سے اصلی معنی ضائع نہیں ہوئے۔ چند ایک مقامات پر تقی عابدی نے اعتراض کیا ہے کہ بعض جگہ مطالب پوری طرح سے روشن نہیں ہو سکے ہیں اور ایک دو مقام پر شعر کے اصلی معنی بھی بدل گئے ہیں مثال کے طور پر قطع دیکھیے:

فارسی	اردو
زرازی معنی قرآن چہ پرسی	نہ پوچھ حسرت رازی سے معنی قرآن
ضمیر ما بآیاتش دلیل است	کہ میری ذات ہے خود اس کی آیتوں پہ دلیل
فرد آتش فروزد دل لبوزد	خرد سے آگ بھڑکتی ہے دل سلگتے ہیں
ہمیں تغیر نمرود و خلیل است	یہی ہے قصہ نمرود اور حدیث خلیل

تقی عابدی کا اعتراض یہ ہے کہ فیض نے اس قطعہ کے تیسرے مصرعے کے ''دل بسوزد کا ترجمہ 'سلگتے دل ہیں' کیا ہے جس کے معنی دل جو عشق و وجدان کا منبع ہے روشن ہو جاتا ہے

جو کہ اقبال کا نقطہ نظر نہیں ہے اس کے علاوہ فیضؔ اور اقبالؔ کے متعدد بند پیش کیے ہیں جن سے قارئین استفادہ کر سکتے ہیں اقبالؔ نے جو لکھا ہے فیضؔ نے اس کا کیا منظوم ترجمہ لکھا ہے اور تقی عابدی نے اسکو ضبط تحریر میں لایا ہے کہنے کا مطلب یہ کہ فیض اُردو کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے دوسرے شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔

''فیض کا ادبی مناظرہ بہ عنوان پریم چند'' کے عنوان سے تقی عابدی نے جو مضمون کتاب میں شامل کیا ہے اس میں انہوں نے ادبی منظر نامے کے پروگرام میں فیض احمد فیض اور آغا عبدالحمید کی بحث جو 18 جون 1941 میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کی گئی تھی کو پیش کیا ہے۔ جس کی طوالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تقی عابدی نے کچھ اہم گوشوں کو بطور اقتباس پیش کیا ہے۔ جس سے فیض کے نظریات کا علم ہوتا ہے جس میں پریم چند کی تخلیقات ان کی سماجی لسانی اخلاقی اور ادبی اقدار پر بحث کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فیضؔ کے فکشن کے تئیں اور فکشن نگاروں کی تخلیقات کے تئیں کیا نظریات تھے اور شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں فکشن کا بھی بخوبی اندازہ اور علم تھا۔

تقی عابدی نے ''فیض کا عقیدہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے مستند حوالے پیش کر کے ان کا مسلک بتانے کی سعی کی ہے۔ میں یہاں انہیں کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کر رہی ہوں تا کہ قارئین کو خود اندازہ ہو سکے کہ تقی عابدی نے اس مضمون کے حوالے سے کیا بتانے کی کوشش کی ہے:۔

> ''فیض کے اس مسئلہ پر تحریروں سے زیادہ تقریروں اور خصوصاً نجی محفلوں میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم نظر آتا ہے،ہم نے اس تحریر میں صرف وہی مستند حوالے من وعن مختلف نکات کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو خود فیضؔ سے منسوب ہیں اور یہ چیزیں ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ہر شخص جو عقل و دانش کا حامل ہے۔ان نکات کو جوڑ کر فیض کا عقیدہ جان سکتا ہے۔''(۳۲)

تقی عابدی نے مختلف حوالوں کی مدد سے فیضؔ کا مسلک بتانے کی کوشش کی ہے جس میں انہوں نے الگ الگ شخصیات کے انٹرویوز اور اقتباسات سے استفادہ کیا ہے اور اُن کی نظموں اور کچھ اشعار کی مدد سے بھی اپنی بات کو سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔فیضؔ نے بعض مقامات پر قرآن کریم کی آیات کو بھی استعمال کیا ہے اور قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ مستند حوالوں کی روشنی میں خود ہی نتیجہ اخذ کریں کہ فیضؔ کا تعلق کس عقیدے اور کس مسلک سے تھا۔مگر میں نے اس مضمون سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فیض صوفی مسلک سے تھے چونکہ ان کی اکثر و بیشتر تحاریر سے یہی ثابت ہوتا ہے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو میں نے سمجھا وہ ہی صحیح ہے کیونکہ ہر انسان کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو کس طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے جو مجھے سمجھ میں آیا میں نے لکھ دیا باقی قارئین اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ان کی سوچ پر منحصر ہے۔

''فیض کی صحت اور بیماریاں'' خطوط کی روشنی میں کے عنوان سے تقی عابدی نے ایک اہم مقالہ تحریر کیا ہے۔ چونکہ ان کی کتاب کا نام فیض فہمی ہے اس لیے ان کی کوشش رہی ہے کہ کوئی بھی گوشہ مخفی نہ رہ جائے اس لیے انہوں نے ایک مضمون ان کی صحت اور بیماریوں سے متعلق بھی تحریر کیا ہے کیونکہ یہ گوشہ بھی فیض کے چاہنے والوں کے علاوہ فیضؔ کی شخصیت اور فن کی پرکھ کرنے کے لیے اہم معلومات فراہم کرسکتا ہے۔ تقی عابدی نے فیضؔ کی جتنی بھی تصاویر اس کتاب میں شامل کی ہیں ان میں اکثر و بیشتر میں ان کی سگریٹ نوشی کی کیفیات شدت سے دکھائی گئی ہے۔ تقی عابدی نے فیضؔ کے درجن کے قریب خطوط جو انہوں نے ایلس فیض۔ افتخار عارف۔ کرنل انور اور رحیم انجان کو لکھے ہیں کو بنیادی ماخذ بنایا ہے حالانکہ ان کی تحقیق کے مطابق ماسکو لبنان اور پاکستان کے ہسپتالوں میں فیضؔ کے تمام ریکارڈ موجود ہیں۔ چونکہ عابدی پیشے کے لحاظ سے ایک طبیب ہیں اور (30) تیس سالہ طبابت کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے ان خطوط کے ذریعے فیضؔ کی بیماریوں کی تشخیص کرنا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہا۔ فیضؔ ورزش اور چہل قدمی سے اکثر دور بھاگتے تھے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ تمباکو نوشی اور بدنی تساہل میں فیضؔ اقبالؔ کے مشابہ تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ تقی عابدی نے اقبالؔ کی بیماریوں پر ایک جداگانہ کتاب ''چوں مرگ آید'' تصنیف کی ہے جس میں انہوں نے علامہ کے (251) دو سو اکاون خطوط کی مدد سے ان کی بیماریوں کی تشخیص کر کے ایک فہرست تیار کی ہے۔

تقی عابدی نے فیض کے خطوط کی روشنی میں فیض کولاحق (5) قسم کی بیماریوں کی تشخیص کی ہے جن کوذیل میں درج کیا جارہا ہے:-

الف:-دل کی بیماری

ب:- پھیپھڑوں کی بیماریاں

ج:- خون کی بیماری

د:- کان کی بیماری

ھ:- دانتوں کی بیماری

1- Chronic Bronchitis

2- Emphysema

3- Pulmonary Edema

4- Terminal Pneumonia

اس بابت تقی عابدی لکھتے ہیں:

- **دل کی بیماری:**-فیض دل کے مریض تھے۔فیض نے دل کی بیماری موروثی (Genetic) بھی پائی تھی فیض کے والد اور بڑے بھائی طفیل دونوں کی ناگہانی قلبی موت کے سانحے سے دو چار ہوئے تھے۔
- فیض کو 1962ء میں یعنی اکاون سال کی عمر میں ہارٹ اٹیک (Heart Attack) ہوا تھا جس پر

بعد میں فیضؔ نے خوب صورت نظم بھی لکھی:

؎ درد اتنا تھا کہ اسی رات دل وحشی نے

- فیضؔ اوائل جوانی سے سگریٹ نوشی کرتے تھے اور Chain Smoker تھے جس کی وجہ سے دل پھیپھڑے دانت کان اور خون کی بیماریوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔
- فیضؔ نے افتخار عارف کے 18 مارچ 1984ء کے خط میں جو نصف شب کو ضیق النفس کے دورہ کا ذکر کیا ہے وہ قلب اور پھیپھڑوں کا مشترکہ عمل تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ کے پھیپھڑے اور دل تقریباً ناکارہ ہو چکے تھے۔ اس بات کا تقریباً یقین ہے کہ فیضؔ کا انتقال پھیپھڑوں کی ساتھ قلب کے حملہ کے باعث ہوا۔"(۳۴)

ان اقتباسات کو یہاں پیش کرنے کا مقصد تقی عابدی کی فیضؔ کی بیماریوں کی تشخیص کا ثبوت مہیا کرنا ہے اس بابت ڈاکٹر عابدی نے آخر میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انہوں نے اس تحریر میں تمباکو نوشی اور شراب نوشی وغیرہ کا تذکرہ صحت کے زاویوں اور اس کے ذہن پر اثرات کے عمل کے تحت کیا ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی اور مطلب نہ اخذ کیا جائے کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:-

"یہ شخصی مسائل ہیں ان کا شمار شخصیت کے ذیل میں کسی حد تک ہوسکتا ہے لیکن فنی دبستان میں ان مطالب پر قلم اٹھانا انگلی اُٹھانا تصور کیا جاتا

ہے۔''(۳۴)

تقی عابدی نے فیضؔ کے خطوط کی روشنی میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ''فیضؔ کے خطوط سے، ہمیں کیا ملا''؟ رکھا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے فیضؔ کے مطبوعہ خطوط کی تعداد (330) سے زیادہ بتائی ہے جو دستیاب ہیں۔ جن میں سے نصف سے زیادہ خطوط انہوں نے اپنی اہلیہ اور بچیوں کے نام لکھے ہیں۔ فیضؔ نے جو خطوط اپنی بیوی کو لکھے وہ انگریزی میں لکھے اور جو بیٹوں کے نام لکھے وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھے۔ ان کے علاوہ باقی تمام خطوط اردو میں ہیں۔ تقی عابدی ان خطوط کی بابت لکھتے ہیں:

> ''فیض کے وہ خطوط جو انہوں نے جیل سے اپنی بیگم ایلس کو لکھے وہ خطوط فیضؔ نے خود اردو میں ترجمہ کیے جو ان کے قول کے مطابق ''جیسے قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی ''تفنہ زبانی'' ان کا ترجمہ کیا گیا ہے'' چنانچہ یہ خطوط 1971ء میں صلیبیں میرے دریچے میں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔''(۳۵)

فیضؔ نے بھی اس کتاب کے آغاز میں ''گزارشِ احوالِ واقعی'' میں لکھا ہے کہ ان خطوط کو انہوں نے ہی لکھا ہے مگر اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے نہ لکھی ہے اور نہ چھاپی ہے بلکہ اسے چھپوانے اور لکھوانے کے ذمہ دار ادارۂ یادگار غالب والے مرزا ظفرالحسن ہیں۔ کتاب کے سرآغاز پر لکھے گئے گزارش احوال سے دو اقتباس تقی عابدی نے

بطور ثبوت اس کتاب میں بھی شامل کئے ہیں۔ جس میں فیضؔ نے خطوط کے لکھے جانے چھپوائے جانے وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے

تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق ''صلیبیں میرے دریچے میں'' کے علاوہ محترمہ سرفراز اقبال کو لکھے گئے (55) سے زیادہ خطوط 1988ء میں ''دامن یوسف'' کے نام سے اور افتخار عارف کو لکھے گئے 38 خطوط 2011ء میں ''فیضؔ بہ نام افتخار عارف کے عنوان سے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ تقی عابدی نے زیر مطالعہ کتاب (فیضؔ فہمی) میں ان تمام خطوط کے نمبر شمار تعداد کتابیات اور جس کے نام یہ خط لکھے گئے وغیرہ کی فہرست بھی پیش کی ہے جس سے ریسر چرز کے لیے کافی سہولت ہوگئی ہے۔ اس فہرست کی مدد سے آسانی سے پتہ چلتا ہے کہ فیضؔ نے کس کے نام کتنے خط لکھے اور کونسی کتاب میں کونسا خط شامل ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ درجنوں خطوط ابھی غیر مطبوعہ ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر مجید بیدار مشاہیر کے خطوط بنام سکندر علی وجدؔ مرتب کر رہے ہیں۔ جن میں فیض کے پانچ (5) خط بھی شامل ہیں اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین ،شکیب کی تحقیق کے مطابق ابھی درجنوں خطوط لوگوں کے پاس بھی محفوظ ہیں۔ اور یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ شاید فیضؔ کے خطوط کی بڑی تعداد ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کے خاندانی افراد کے پاس ہو جن کو طباعت سے مزین ہوکر گلشن اردو میں ظاہر ہونا چاہیے تا کہ فیضؔ فہمی میں مزید اضافہ ہو سکے۔

تقی عابدی نے اکثر خطوط کو اس مضمون کا حصہ بنایا ہے تا کہ فیضؔ کی زندگی حالات و واقعات اور شاعری کے تعلق سے ان کی کاوشوں وغیرہ کے علاوہ کئی دوسرے معاملات سے متعلق جانکاری مل سکے اور فیضؔ کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ جس کے لیے انہوں نے خطوط جیسے بنیادی ماخذ کو اس کا وسیلہ بنایا ہے۔

اس کے علاوہ فیض نے کن کن کتب کا مطالعہ کیا اور استفادہ کیا وغیرہ کی فہرست بھی درج کی ہے تا کہ فیضؔ کے ادبی مطالعہ کا اندازہ ہو سکے اور ایسے (30) خطوط کا دعوی بھی کیا ہے جن میں ان کتب کے نام اور اشارے ملتے ہیں۔تقی عابدی نے فیضؔ کے خطوط سے چند اقتباسات بھی پیش کیے ہیں جن سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کتنی انکساری اور انصاف سے اپنے کلام پر ریویو کیا ہے۔انہوں نے کتنی انکساری اور انصاف سے اپنے کلام پر ریویو کیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اپنے کلام کے تئیں اتنی انکساری دکھائی ہو۔

ان کے خطوط سے دو اقتباس یہاں پیش کر رہی ہوں تا کہ قارئین خود ان کی انکساری اور انصاف پرستی کا اندازہ لگا سکیں۔ جس کو منظر عام پر لانے کے لیے تقی عابدی نے محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے۔

دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔

23 مئی 1952ء ایلس کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں لگا تار لکھ رہا ہوں شاید زیادہ نہیں لکھا جا رہا ہے لیکن نہ لکھنے سے بہتر ہے پھر اپنی مرضی یا ارادے سے شعر تو نہیں لکھا جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور جب تک سب دماغی کام رکا رہتا ہے۔ غالباً یہ دقت دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو ہی پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اوزان ہُنر ناقص اور ناتسلی بخش ہیں۔''(۳۶)

12 اکتوبر 1952ء کو اپنی اہلیہ ایلس کو لکھتے ہیں:

''رؤف کو ایک غزل بھیج چکا ہوں تحت بالخیر کے طور سے ایک اور نظم منسلک ہے اس نظم میں خاص طور سے خوش ہوں اس لیے مجید صاحب کے مرغوب الفاظ میں I Dont Mind Telling you آج کل کوئی ایسا نہیں لکھ سکے گا اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اپنی استعداد پر گھمنڈ ہے اپنی صلاحیت ہنر تو محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اور عرق ریزی کی ہے خاص طور سے بیانیہ تحریر میں۔''(۳۷)

ان خطوط کی روشنی میں کچھ نئی باتوں کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ فیض بچوں کے لیے کتابیں لکھنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ عبدالحکیم نے فیض سے اسلامی تاریخ کا نیا تجربہ

لکھنے کی پیشکش کی تھی جس پر وہ راضی بھی ہوگئے تھے مگر خلیفہ عبدالحکیم بعد میں کچھ سیاسی اور مذہبی دباؤ کے باعث اس پیشکش سے منحرف ہوگئے۔ البتہ فیضؔ کو سمجھنے میں یہ خطوط کافی اہم اور مددگار ثابت ہوتے ہیں جن کی جانب تقی عابدی نے ادب کے طالب علموں کو راغب کرنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

تقی عابدی نے علی سردار جعفری کی وہ عمدہ تحریر جو انہوں نے 21 دسمبر 1984 کو ٹورانٹو میں کلیات فیضؔ کے شاہکار نسخہ ''سارے سخن ہمارے'' کے آخری صفحہ پر ''یار یار مہربان'' کے عنوان سے تحریر کی تھی اور جس کے آخر میں سردار جعفری کے دستخط بھی ثبت ہیں کو من وعن اس کتاب میں پیش کر دیا ہے جس میں انہوں نے فیضؔ کے اس دنیاء فانی سے کوچ کر جانے کے دکھ اور کمی کا اظہار کیا ہے جس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ کی شاعری کو دنیا میں کتنا پیار اور عزت حاصل تھی۔ زیادہ کچھ نہ لکھتے ہوئے پوری تحریر کو یہاں من وعن پیش کرنا زیادہ موزوں رہے گا تا کہ قارئین خود اس کو پڑھ کر اندازہ کرسکیں کہ سردار جعفری کو فیضؔ کے جانے کا کتنا غم تھا۔

''اتنی جلدی چھوڑ کر جانا نہیں چاہیے تھا دنیائے شعر میں کسی شاعر کو اتنا پیار نہیں ملا۔ پھر اس پیار سے روگردانی کیوں فیضؔ کی شاعری نے بہت سے کرشمے دکھائے اور دکھاتی رہے گی۔ لیکن فیضؔ دوبارہ پیدا نہیں ہوگا یہاں فطرت بھی بے بس ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی تخلیق کو دُہرا نہیں سکتی۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور

دنیا میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

مخدوم محی الدین کے جشن پر کسی نے کہا تھا:۔

کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ مے خانہ

ان دنوں صورت بربادی یاراں کیا ہے

ہماری محفل میں بربادی کا یہ جشن جاری رہے گا اور فیض کے نام پر جاری رہے گا ہم ساتھ ساتھ بربادی کے ان تمام کوچوں سے گزرے ہیں کبھی لکھنؤ میں کبھی لاہور میں کبھی ممبئی میں کبھی ماسکو میں کبھی قاہرہ میں کبھی ٹورانٹو میں اور نہ جانے کہاں کہاں فاقوں کی غرور اور مظلومیت کی کج کلاہی کے ساتھ آئندہ بھی یہ محفلیں یہ محبتیں جاری رہیں گی جہاں فیض کی نمائندگی فیض کے شعر کریں گے''۔(۳۸)

''فیض اور مصطفیٰ زیدی (رشتہ جو موتیوں سے ڈھکا رہا)'' کے عنوان سے فیض نے جو مضمون لکھا ہے۔اس میں انہوں نے مصطفیٰ زیدی کے فکر اور فیض کے تخلیقی فکر میں ہم آہنگی کو ظاہر کرنے کی سعی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ زیدی نے جو اہم نکات بیان کیے ہیں وہی نکات فیض کے پاس بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں تک کہ جوش نے بھی زندگی کی بڑی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔اس کا حوالہ تقی عابدی نے بھی پیش کیا ہے:

جوش لکھتے ہیں:

"؎ زبان پہ بار خدا یہ کس کا نام آیا
کہ مرے نطق نے بو سے مری زبان کے لیے

اس ماہ رخسار، نادرہ گفتار، بلند کردار، سعادت مدار اور پریم اوتار۔ نوجوان بچے کے پیدائشی، سکونتی اور جاودانی تین وطن ہیں۔ الہ آباد۔ پاکستان اور میرا دل (اللہ اکبر میرا دل فرش پر عرش کامل)

یہ انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے ہر چند قدیم روش کو ترک کر کے یہ جدید ڈھیرے پر آ گیا ہے لیکن اُسی کے کلام میں ائمہ ادب کی شان پائی جاتی ہے"اس کی شاعری اس قدر بلند تخیل اور اس درجہ نرالے طرز بیان کی حامل ہے کہ بسا اوقات سر دھننے اور اس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تمنا پیدا ہوجاتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔"(۳۹)

واضح رہے کہ شیخ الہٰ آبادی بعد میں مصطفیٰ زیدیؔ کے نام سے مشہور ہوئے سید مصطفیٰ زیدی 10 اکتوبر 1930 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے 12 اکتوبر 1970ء کو (39) سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کی تخلیقات کے (6) شعری مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے جن کی ترتیب اس طرح سے ہے:

(1) زنجیریں 1949ء (2) روشنی 1950 (3) شہر آزر 1958 (4) موج مری صدف

صدف1960 (5) گریباں1964 (6) قبائے ساز1967ء

تقی عابدی نے مضمون کی طوالت سے گریز کرتے ہوئے صرف مصطفیٰ زیدی کے چیدہ چیدہ اشعار اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔جن کو سنتے ہی فیضؔ کے نغموں کی گنگناہٹ ذہن میں ابھرنے لگتی ہے۔خود تقی عابدی کے الفاظ میں ''یہاں ہمارا مقصد تقابل نہیں بلکہ چراغ سے چراغ جلانے کی پاسداری ہے''۔مثال کے طور پر یہ بند دیکھئے:-

غم دوراں نے بھی سیکھے غم یاراں کے چلن
وہی سوچی ہوئی چالیں وہی بے ساختہ پن
الٰہی سونی تو کبھی شام غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگی صبحِ وطن (زیدی)

اس مضمون کی بابت تقی عابدی لکھتے ہیں کہ:

''مصطفیٰ زیدی ایک مکمل نیا منفرد لہجہ رکھتے ہوئے بھی فیضؔ کے وسیع کینوس سے باہر نہیں نکل سکے یہ اور بات ہے کہ چالیس سالہ مختصر زندگی میں زیدی نے جدید شاعری میں وہ کارنامے انجام دیے جو چالیس ترقی پسند چاعر بھی مل کر نہ کر سکے''۔(۴۰)

یہاں فیضؔ کا یہ شعر کافی موزوں دکھائی دیتا ہے کہ:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

''فیضؔ اور نوبل پرائز'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں تقی عابدی نے فیض کو نوبل پرائز کا مستحق ہونے کے باوجود نوبل پرائز نہ ملنے کی چند وجوہات بیان کی ہیں جو ان کے مطابق فیض کو یہ انعام نہ ملنے کا کارن ہوسکتی ہیں۔ حالانکہ اس انعام کے لیے فیضؔ کو نامزد کیا گیا تھا جس کا انکشاف کچھ انٹرویوز سے بھی ہوتا ہے اور خود فیضؔ نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق فیضؔ کو اس انعام کا حقدار ہونے کے باوجود یہ انعام نہ ملنے کی چند وجوہات ہوسکتی ہیں جن کو میں من وعن پیش کر رہی ہوں:

الف: فیضؔ سوویت یونین کے دوست تصور کیے جاتے تھے اور اس زمانے میں یورپ میں داخلی طور پر کسی ای فروایشیائی کو جو سوویت دوست ہو اچھی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

ب: روس کے افغانستان پر حملے نے روس سے منسلکہ بالواسطہ اور بلاواسطہ افراد کی امن پسند تحریکوں کو بے رنگ کر دیا تھا۔

ج: فیضؔ فلسطین تحریک کے حامی اور یاسر عرفات کے خاص دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

د: فیض کی پانچ نظموں اور ایک مجموعے کا نام فلسطین سے متعلق تھا۔

1- سروادی سینا (عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

2- فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے۔

3- فلسطینی بچے کے لیے لوری

4- ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے

5- ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے

ھ- گزشتہ پانچ دہائیوں سے نوبل انعام کمیٹی پر صیہونی لابی کا شدید اثر ورسوخ ہے۔

و: فیض کے کلام کے تراجم تو ہوئے لیکن ان کی صحیح تشہیر نہ ہوسکی۔ خود فیض نے اس طرف خاص توجہ نہ کی اور فیض کے دوستوں نے بھی بہ قول فارسی مقولہ ہزار چاقو تو بنائے مگر ایک دستہ نہ تھا۔ وہ فیض شناسائی سے زیادہ خود شناسائی اور فیض فہمی سے زیادہ خوش فہمی میں دن رات مصروف رہے۔

ز: فیض کی پشتی بانی اور تعارف کے لیے کوئی ملک آگے نہیں بڑھا راستہ ہموار کرنے کے بجائے راستے میں روڑے ڈالے گئے۔

ح: فیض فلک شہرت پر دوپہر ٹھہر کر غروب ہو گئے'' بہ قول انیس عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا'' یہ سچ ہے کہ فیض آج بھی اپنی زندگی کے آخری دور کی طرح معروف اور مشہور ہیں لیکن نوبل پرائز کا عموماً دستور شنیدن کہ بود دیدن رہا ہے۔

ی: فیض اردو کے عظیم شاعر تھے۔

ک: فیض اسلامی تہذیب سے وابستہ تھے۔

ل: کسی بھی خارجی یونیورسٹی میں ''فیض چیئر کا راقم کو علم نہیں۔''(۴۱)

ماحصل یہ کہ راقمہ کو بھی تقی عابدی کی بیان شدہ وجوہات سے اتفاق ہے۔ مگر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ نوبل پرائز نہ ملنے کی وجہ سے فیضؔ کی مقبولیت اور تاثیر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ اگر انہیں یہ انعام ملتا تو تقی عابدی کے الفاظ میں ''تو اس سے نوبل انعام کا معیار اور وقار بڑھ جاتا''۔ فیض کے لیے ان کا یہ شعر ہی کافی ہے جس میں انہوں نے اپنی کامیابی کا اعتراف کیا ہے:

؎ فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

کسی بھی شخص کی کوئی تحریر خواہ وہ خطوط کی شکل میں ہو یا کسی تصنیف کی صورت میں ہر شخص کے لیے جداگانہ مضمون، طرز، بیاں اور داخلی واردات ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ''ڈاکٹر راشد حمید'' کی مرتبہ کتاب ''فیضؔ بہ نام افتخار عارف'' ایک عمدہ اور کارآمد خطوط کا مجموعہ ہے جو فیض فہمی کے نئے گوشے منور کرتا ہے۔ اس کتاب میں 38 خطوط کو شامل کیا گیا ہے جو فیضؔ نے 1978ء سے 1984 کے درمیان افتخار عارف کو لکھے تھے۔ تقی عابدی نے رقم کیا ہے کہ کتاب کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک درجن کے قریب خطوط کو اسی کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ ان میں مکتوب نگار کے ذاتی مسائل تھے۔ جنہیں منظر عام پر لانا ڈاکٹر راشد نے مناسب نہ سمجھا۔ واضح رہے کہ اس کتاب میں شامل خطوط فیضؔ اور افتخار

عارف کی آخری عمر کی مراسلت ہے۔

تقی عابدی نے اپنے مضمون ''فیض بہ نام افتخار عارف'' (مفید مختصر اور مستند دستاویز) میں ان خطوط کی روشنی میں جدید مطالب ڈھونڈ نکالے ہیں۔ جیسا کہ میں نے متذکرہ بالا سطور میں لکھا ہے کہ کسی شخصیت کی تحریر ہر شخص کے لیے جداگانہ مضمون ہوتا ہے چنانچہ تقی عابدی نے یہاں بھی نئے معنی و مطالب کھوج نکالے ہیں جن کو انہوں نے چھ محرابوں میں سجایا ہے:

(1) ادب اور شاعری:

اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ خطوط نگاری دو شاعروں اور ادیبوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے ان کی زبان رسمی یا نجی گفتگو نہ رہ کر ادبی گفتگو بن گئی ہے جن میں محاورے مقولے اور اساتذہ کے اشعار کا بھی استعمال کیا ہے جس کے لیے انہوں نے چند نکات بھی پیش کیے ہیں۔ اور متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ ایک خط سے ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

> ''اپنے طور سے شاید ستمبر سے پہلے ادھر آنا نہ ہو سکے ورنہ ''مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت البتہ رزی طلبہ سخن در یں است۔'' (۴۲)

(2) زریں ادبی سیاسی اقتباسات:

ان خطوط میں فیض نے اہم ادبی/سیاسی نکات کو پیش کیا ہے جنہیں ڈاکٹر تقی عابدی نے

زریں اقتباسات میں پیش کیا ہے۔

3-خطوط میں صحت اور بیماریوں کا تذکرہ:

جیسا کہ اس سے پہلے بھی تقی عابدی نے فیضؔ کی بیماریوں کے حوالے سے ایک مضمون لکھا ہے۔مگر ساتھ ہی تقی عابدی نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ان خطوط کی مدد لیے بغیر فیض کی بیماریوں کی تشخیص ممکن نہ تھی۔

4-کلامِ فیضؔ تقسیم تدوین اور تشہیر:

تقی عابدی بتاتے ہیں کہ ان خطوط میں صرف چند ایک خطوط ایسے ہیں جن میں کہیں ذکر آیا ہے کہ جن میں فیضؔ کے اپنے کلام کو استاد صوفی کو دکھانے یا چراغ حسن حسرت کو دیکھ لینے کے لیے کہا ہے تاکہ زبان کا مسئلہ نہ رہے۔ورنہ اس کے علاوہ کسی بھی خط میں اس قسم کا ذکر نہیں ہوا ہے۔

5-خطوط میں قرآنی اشارات:

افتخار عارف کے نام لکھے گئے خطوط کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فیضؔ نے کئی مقامات پر قرآنی آیات کا استعمال کیا ہے جس سے فیضؔ کی عربی پر مہارت اور قرآنی علوم سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے مثال کے طور پر ایک خط میں لکھتے ہیں:

1-''ایمان یا عقیدہ تو ''لَکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین'' کے ضمن میں آتا ہے''(۴۳)

ماحصل یہ کہ اگر تحقیق نگار کسی بھی چیز میں کوئی نیا پہلو تلاش کرنا چاہے تو کوئی مشکل نہیں بس وہ نظر درکار ہے جو لوہے کی کان سے ہیرا تلاش کر لے۔ اور تقی عابدی اس فن میں ماہر ہیں۔

''قصہ سازش اغیار کیوں یا نہ کیوں''؟ تقی عابدی نے فیض ہی کے مصرعے کو موضوع بنا کر مضمون لکھا ہے۔ جس میں فیض نے صنعت ایہام سے استفادہ کر کے تقی عابدی کے الفاظ میں یہ سوال کیا ہے کہ کیا راولپنڈی سازش کیس کو خارجی طاقتوں کی سازش کہہ سکتا ہوں کہ یہ خارجی حکومتوں کی سازش کا کیس ہے لیکن کیا میں اس کو بیان کروں یا چپ رہوں اس بابت تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''فیض نے اسے خارجی طاقتوں کی سازش کہہ کر اس قصہ کو اپنی نثر میں کم اور اپنی نظم میں زیادہ بیان کیا ہے۔ فیض کے جیل کے حالات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی لیکن راولپنڈی سازش مقدمہ پر کھل کر فیض شناسوں نے گفتگو شاید اس لیے بھی نہیں کی کہ ہر حکومتِ وقت کے کچھ پردہ نشین حضرات کا نام بلا واسطہ یا بالواسطہ اس میں شامل ہو جاتا تھا جن سے ان کی رسم و راہ تھی۔'' (۴۴)

یوں تو فیض دو بار قید ہوئے مگر تقی عابدی کے اس مضمون کا محور راولپنڈی سازش کیس ہے، فیض مارچ 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے

اور چار سال ایک ماہ قید کاٹی اور اپریل 1955 کو جیل سے رہائی ملی۔ دوسری بار پریذیڈنٹ ایوب خان کے سیفٹی ایکٹ کی وجہ سے لاہور میں۔ دسمبر 1958 سے اپریل 1959 یعنی پانچ مہینے لاہور قلعہ جیل میں محصور رہے۔

تقی عابدی نے اس مضمون میں راولپنڈی سازش کیس کی اصلی وجہ بیان کی ہے جس میں انہوں نے فیضؔ کے کچھ انٹرویوز سے مدد لیتے ہوئے کیس کی اصلی حقیقت واضح کی ہے ساتھ ہی دوران قید فیضؔ جن حالات وواقعات سے دوچار رہے انہیں بھی اپنی تحریر کا محور بنایا ہے۔ تقی عابدی نے لکھا ہے کہ اس کیس میں کئی افراد شامل تھے جن میں گیارہ فوجی افسر گیارہ سویلین اور ایک خاتون بیگم اکبر خان تھی۔ انہوں نے فیض کے انٹرویوز کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس سازش کے پیچھے فیضؔ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی انہیں سزا ملی۔ اس کے علاوہ ان تمام افراد کے نام بھی درج کیے ہیں جن کو اس سازش کیس میں سزا دی گئی تھی۔ ساتھ ہی قید کے دوران لکھی گئی شاعری کا بھی حوالہ دیا ہے جو انہوں نے مختلف قید خانوں یعنی سرگودھا، منٹگمری حیدرآباد کراچی اور لاہور وغیرہ کی قید کے دوران لکھی۔ جیسے:

؎ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

؎ فیضؔ آتے ہیں راہِ عشق میں سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

ے ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

تقی عابدی کا ایک اور مضمون بنام ''فیض کا مرثیہ امام'' میں انہوں نے فیض کو بطور مرثیہ نگار بھی پیش کیا ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو کا شاید ہی کوئی عظیم شاعر ایسا ہوگا جس نے مرثیہ کی طرف توجہ نہ کی ہو اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ''قلی قطب شاہ'' کے دیوان میں بھی (5) مرثیے شامل ہیں جن میں تقی عابدی کے مطابق (3) مکمل اور (2) ناتمام جو سولہویں صدی کی یادگار ہیں۔

تقی عابدی نے لکھا ہے کہ خدائے سخن میر تقی میرؔ کے چونتیس (34) مراثی اور (5) سلام مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور میر انیس کے 213 مرثیے اور 112 سلام ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مرزا غالبؔ کا ایک (3) بند کا ناتمام مرثیہ اور ایک سلام اردو میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک مکمل نظم فارسی میں بہ عنوان 'واقعہ کربلا' لکھی جو درحقیقت مرثیہ ہی ہے۔

> ''بیسویں صدی کے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی نے بھی (9) مرثیے کئی سلام متعدد قطعات و رباعیات رقم کیے جس کو حال ہی میں حلال نقوی نے مرتب کیا'' (۴۵)

فیض احمد فیضؔ نے بھی ''مرثیہ امام'' لکھا جو بارہ بند اور 75 مصرعوں پر مشتمل ہے یہ مرثیہ

لکھا تو 1964 میں گیا مگر 1978 میں ''شام شہر یاراں'' میں شائع ہوا۔ اس بابت ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں:

''فیض کا مرثیہ ان کے مجموعے ''شام شہر یاراں'' میں شائع ہوا۔ یہ مرثیہ لاہور کی مجلس عزا میں فیض نے خود پیش کیا تھا اور فیض نے یہ مرثیہ 1964 میں کہا تھا''(۴۶)

پروفیسر گوپی چند نارنگ فیض کے اس مرثیے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جہاں تک فیض کے اس مرثیہ امام کا تعلق ہے یہ ایک جدید مرثیہ ہے جس میں فیضؔ نے جدید تجربات کیے ہیں۔ اور بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں یہ مرثیہ پہلے بند سے آخری بند تک موضوع کے لحاظ سے حدودِ مرثیہ میں شامل ہے اگرچہ اس میں کلاسیکی مرثیے کے اجزاء نظر آتے ہیں لیکن بعض اجزا کی چھاپ ضرور دکھائی دیتی ہے۔ میر انیسؔ نے مرثیہ کے تین لازم جُز بتاتے ہیں یعنی عمدہ زبان و بیان اعلیٰ مضمون اور درد وغم۔

؎ لفظ بھی چُست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہ تینوں لازم جُز فیض کے مرثیہ کا ڈھانچہ ہے اس مرثیہ پر میر انیس کے شاہکار مرثیہ کا خاص اثر دکھائی دیتا ہے جس کا مطلع ہے:

جب زلف کو کھولے ہوئے لہلائے شب آئی

پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی" (۴۷)

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ مرثیہ کا ایک بند یہاں پیش کیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے صبح کی منظر کشی عمدہ طریقے سے کی ہے۔

پھر صبح کی لو آئی رُخ پاک پہ چمکی

اور ایک کرن مقتل خوفناک پہ چمکی

نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی

شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی

دم بھر کے لیے آئینہ رو ہوگیا صحرا

خورشید جو اُبھرا تو لہو ہوگیا صحرا

تقی عابدی لکھتے ہیں کہ مرثیوں کا سماجی ارتقاء اس صورت میں ہو رہا ہے کہ ان میں عالمیت ہے اور بین الاقوامیت بھی اور شاید یہی شعری اور تہذیبی تہذیب آج کی مرثیت کا عروج بنتی ہے کیونکہ اس رنگ میں غزلیں اور نظمیں بھی لکھی جا رہی ہیں اور طویل مرثیے بھی جو بیانیہ کے ساتھ ساتھ فکر کی اور محسوسات کے طریقوں کو نہیں چھوڑتے ہیں۔

فیض کے مرثیے کے حوالے یہاں تقی عابدی کی بات پر ہی اپنی بات کو ختم کرتی ہوں کیوں کہ ان جملوں سے قارئین خود اندزہ کر سکیں گے اور زیادہ دلائل بھی درکار نہ ہوں گے۔

''فیض صاحب کے الفاظ مصرعے اور اشعار مرثیے کے شاعری کو تجلی اور جلال بخشنے کے ساتھ ساتھ بلند آہنگ بھی بنا دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ سرمایہ بہت مختصر ہے مگر شاعری کی دنیا میں جو حساسیت گمشدگی، باطنی شدت اور دل دہلا دینے والی اور اعصاب شکن(Nerve Shattering) کیفیت اس مختصر سے سرمایہ میں ہے''(۴۸)

تقی عابدی نے ایک مضمون جو ان کی کتاب فیض فہمی میں شامل ہے اپنے آپ میں دلچسپی کا حامل ہے جس کا عنوان ہے ''فیض نے انٹرویو لیا'' یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ فیض کے دو درجن سے زیادہ انٹرویو مطبوعہ شکل میں موجود ہیں جن کے انہوں نے کافی تسلی بخش جواب بھی دیئے ہیں مگر اس مضمون کی نوعیت دوسری ہے یعنی اس مضمون میں فیض انٹرویو دینے کے بجائے کسی دوسرے کا انٹرویو لے رہے ہیں۔ اور جس کا انٹرویو کیا گیا ہے وہ کوئی عام شخصیت نہیں بلکہ سوویت یونین کے مقبول و معروف افسانہ نگار ''چنگیز اتمانوف'' ہیں جو قرغزستان کے رہنے والے تھے اور قرغز زبانوں میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ جیسا کہ تقی عابدی نے لکھا ہے ان کے افسانوں کے مجموعوں میں ''الوداع گل سرائے'' مدرس ''سفید جہاز''، ''جمیلہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ واضح رہے کہ یہ انٹرویو ماسکو ٹیلی ویژن سے ریلے کیا گیا تھا۔ چنگیز اتمانوف ''لینن' انعام یافتہ بھی تھے اور ساتھ ہی سپریم سوویت کونسل کے ممبر بھی تھے۔ فیض نے جس انداز سے یہ انٹرویو کیا ہے اس سے یہ بھی صاف ہوتا ہے کہ فیض اس میدان

میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ یہ تقی عابدی کی ژرف نگاہی اور محنت کا نتیجہ ہے کہ ہمیں فیضؔ کو اس حوالے سے بھی پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فیضؔ نے بھی کبھی کسی شخصیت کا انٹرویو لیا۔ لہٰذا فیض فہمی کے باب میں اور فیض کو سمجھنے میں اس مضمون سے بھی کافی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ اس بات سے بے خبر تھے۔ مگر تقی عابدی نے اس گوشے کو بھی منظر عام لا کر چھوڑا ہے جو اپنے آپ میں ان کی محنت اور لگن کا ایک واضح ثبوت ہے۔

''نذرانہ عقیدت'' کے عنوان سے تقی عابدی نے جو مضمون تحریر کیا ہے اس میں انہوں نے علیحدہ علیحدہ شعراء حضرات کے نذرانہ عقیدت کو جو انہوں نے فیضؔ کے ہجر میں اپنے اشعار کی صورت میں پیش کیے ہیں کو یکجا کیا ہے اور من وعن پیش کیا ہے۔

مقالے کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام شعرا کے اسم گرامی اور چند شعر بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں تا کہ قاری خود انہیں پڑھ کر کہ فیضؔ کی عظمت اور مقبولیت کا اندازہ لگا سکیں اور یہ بھی کہ تقی عابدی نے کتنی محنت کے ساتھ ان کو یکجا کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

افتخار عارف نذر فیضؔ

جو فیضؔ سے شرف استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہل درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں

احمد فرازؔ بہ یادِ فیضؔ

احمد فرازؔ نے اکثر وبیشتر فیضؔ کے مجموعہ کلام کے ناموں کو شعری پیرائے میں استعمال

کر کے فیض کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے جو اپنے آپ میں انفرادیت رکھتے ہوئے قارئین کی دلچسپی کا باعث ثابت ہوگا لہٰذا ان کے تمام اشعار کو یہاں من عن پیش کر رہی ہوں ۔ان اشعار کی دلکشی سے فراز کی شاعری کا بھی اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:۔

قلم بدست ہوں حیراں ہوں کہ کیا لکھوں
میں تری بات کہ دنیا کا تذکرہ لکھوں
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں
جہاں یزید بہت ہوں حسن اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمین کو بھی کربلا لکھوں
ترے بغیر ہے ہر نقش ''نقش فریادی''
تو پھول ''دست صبا'' پر ہے آبلہ لکھوں
مثال ''دست تہ سنگ'' تھی وفا ان کی
تو کس طرح انہیں یاران با صفا لکھوں
حدیث کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو قصۂ تعزیر ناروا لکھوں
جگہ جگہ ہیں ''صلیبیں میرے دریچے میں''
سوا اسم عیسٰی و منصور جابہ جا لکھوں

گرفتہ دل ہے بہت شام شہریاراں آج
کہاں ہے تو تجھے حال دلبراں لکھوں
کہاں گیا ہے ''میرے دل مرے مسافر'' تو
کہ میں تجھے رہ ومنزل کاماجرا لکھوں
تومجھ کو چھوڑ گیا لکھ کہ ''نسخہ ہائے وفا''
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں
خدا نکردہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

- احمدوحیداختر:۔

عنوان بدل بدل کے سناتے ہو بار بار
افسانۂ حیات تمہاری نظر میں ہے

- ابوالخیرکشفی:۔ نذرفیضؔ

ارباب ہوش منزل آسودگی میں ہیں
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آئے ہیں

- اداجعفری:۔ وہ جوفیضؔ تھا

وہ چلا گیا

وہ جو آبروئے چمن بھی تھا

جو نثار سروسمن بھی تھا

جو غرور دارِ رسن بھی تھا

● اسلم فرخی: نذرِ فیضؔ

وہ اس طرح شب تاریک غم گذار گیا

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار گیا

● امجد اسلام امجد:۔ فیضؔ صاحب

بہت خوش بخت ہیں آنکھیں

جنہوں نے ان کو دیکھا ہے

● اشرف جاوید:۔ نذرِ فیضؔ

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

کچھ زندہ رہے کچھ نام کیا

کچھ رنگ بکھیرے کاغذ پر

پھر ان میں جا بسرام کیا

● پروین شاکر:۔   پروین شاکرؔ

تہ خاک

کیا چراغ وقت نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا
کف دست باد صبا سے پھول یہ کیا گرا
چمن نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں
ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں

نام	عنوان
• حبیب جالب:	فیضؔ
• اختر حسین جعفری:	فیضؔ
• حسن رضا عباس	
• حمیدہ شاہین:	فیضؔ
• رفعت سروش	:فیض منزل

تجھے رفیق کہوں، ہم سفر کہ راہ نما
میری نوا میں تیرا سوز وساز شامل ہے

• رؔعنا اکبر آبادی — رنگ پیرہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
• رضا ہمدانی — بیزار فضا درپے آزارِ صبا ہے
• رشید احمد لاشاری

- عبدالغفار عزمؔ — لندن فیضؔ
- سلام مچھی شہری — فیض اِک چراغ فکر
- عبیداللہ علیم — گرمی شوق نظارا اثر تو دیکھو
- سالک الہاشمی
- شاہد ماہلی — نذر فیضؔ
- شبنم رومانی
- جاوید شاہین
- شمسی طہرانی
- فارغ بخاری
- فہمیدہ ریاض
- قتیل شفائی
- کشور ناہید
- منو بھائی
- مرتضٰی برلاس — دم ہوئے بیمار دو کیوں نہیں دیتے
- محسن بھوپالی
- محسن احسان

- منظر مفتی دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
- شان الحق حقی قطعاتِ تاریخ وفات
- رئیس امروہوی
- شہاب کاظمی
- حنیف اسعدی
- مغیث الدین فریدی
- یزدانی جالندھری

دل سے یزدانی آئی ہے پیہم صدا
مطرب بزم ساز غزال ''چپ ہوا''

تقی عابدی نے اپنے ایک دوسرے مضمون جس کا عنوان انہوں نے فارسی کے مصرعہ ''اے بسا آرزو کہ خاک شد'' رکھا ہے جس کے معنی ہیں کہ تمام آرزوئیں خاک ہوگئیں یعنی کوئی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اس مضمون میں تقی عابدی نے مستند حوالوں جن میں خطوط۔ تحریریں تقریریں اور انٹرویو شامل ہیں کی مدد سے وہ نکات بروئے کار لائے ہیں جو فیض کی زندگی میں پورے نہ ہوسکے بقول فیض بعض چیزیں تکمیل کے قریب پہنچیں تھی لیکن آج تک شائع نہ ہوسکیں۔ بعض کام بالکل شروع ہی نہ ہوسکے۔ جن میں خاص طور پر ان کی وہ نظم اہم ہے بقول تقی عابدی کہ جس میں وہ اپنی آپ بیتی کے ساتھ گذشتہ نصف صدی کی جگ بیتی پر

ایک طولانی رزمیہ اور بزمیہ نظم لکھنے والے تھے، لیکن صد حیف کے یہ کام نہ ہوسکا تقی عابدی ان تمام کاموں کی فہرست جو فیض کرنے کی خواہش رکھتے تھے اس مقالے میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے حوالہ جات بھی درج کیے ہیں۔ لحاظ اِن کاموں کی سرسری فہرست یہاں درج کی جارہی ہے تا کہ کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکے کہ ایسے کون سے کام تھے جو وہ کر نہ سکے۔

- پاکستان ٹائمز کے اداریوں کی جمع آوری کرنا چاہتے تھے جو ہو نہ سکی۔ تقی عابدی کے مطابق جناب رحمٰن اختر اس سلسلے میں کام کررہے ہیں۔
- ادب لطیف اور لیل ونہار کے اداریے جمع نہ ہوسکے۔ تقی عابدی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں مرزا ظفرالحسن کام کررہے ہیں۔
- راوَلپنڈی سازش کیس کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے
- پاکستانی ادب (شعر وافسانہ) کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے تھے۔
- روزنامہ جنگ کراچی سے صحافتی مراسلت کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہتے تھے۔
- اردو شعرا کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے تھے۔
- شیکسپیئر کے کھیل کا ترجمہ شروع کیا تھا۔
- کریکٹر بننے کی خواہش تھی مگر کبھی موقع نہ ملا۔
- عالم فاضل بننے کی خواہش رہی۔

- Pillars of Community کا نصف ترجمہ کیا۔
- کلاسیکی شاعروں کے کلام کا انتخاب :یعنی (کلاسیکی شاعروں سے حالی تک)

متذکرہ بالا تمام نکات تقی عابدی کی زیر مطالعہ تصنیف فیض فہمی سے اخذ کئے گئے ہیں جنہیں تقی عابدی نے اپنے تحریر میں پیش کیا ہے ۔ ماحصل یہ کہ تخلیق چاہے جیسی بھی ہو اگر ایک محقق اس سے کوئی نکتہ نکالنا چاہے تو مشکل کام نہیں ہے ، کیوں کہ اس کام کے لیے لگن اور محنت درکار ہے اور تقی عابدی میں وہ جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نئے نئے زاویوں سے ان کے (فیض) کے خطوط تحاریر، انٹرویو وغیرہ پر روشنی ڈال کر اکثر کچھ نیا تلاش کر لیتے ہیں ۔اور قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

اللہ ان کے قلم میں اور نور بھر دے۔اس مضمون کی نسبت یہی کہنا کافی ہوگا کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کے ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے (غالبؔ)

''فیضؔ نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا'' جیسا کے عنوان سے ظاہر ہے اس مضمون میں تقی عابدی نے فیضؔ کے خطوط سے موصول ہوئی معلومات کے مطابق ان تمام کتب کی تفصیل بحوالہ خطوط اس مضمون میں پیش کر دی ہے اور ساتھ ہی ان تمام کتب کی فہرست معہ مصنف بھی درج کی ہے۔ جن کا فیضؔ نے مطالعہ کیا تھا۔ ان کتب میں شاعری تاریخ ادب

بائیوگرافی ڈراما ناول متفرقات فلسفہ لغت مزاح زبان وغیرہ تمام طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ فیض نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اس بات کا پختہ ثبوت ان کے وہ خط ہیں جوانھوں نے قیدوتنہائی کے دوران لکھے اور جن کا حوالہ تقی عابدی نے بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے عظیم شعرا وسیع مطالعہ کے حامل تھے اوراکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ چونکہ شاعری میں تجربہ اورمشاہدہ کائنات کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے پیدا ہوتا اور بقول تقی عابدی ''قطرہ میں دجلہ دکھانے کے لئے قطرہ کا مطالعۂ ضروری ہے۔ اس مضمون کی بابت تقی عابدی لکھتے ہیں:۔

> ''بڑے شعراء فطرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ علوم کے مطالعے میں بھی غرق رہتے تھے تاکہ چراغ سے چراغ جلایا جائے اورقطرہ میں دجلہ نہ صرف دیکھا بلکہ دکھایا جائے''''ہم سمجھتے ہیں کہ فیضؔ نے بھی (انیس کی طرح) ایک من سے سومن کا کام لیا اس لئے وہ شعرنثر ڈرامے صحافت، تدریس ریڈیو اورفلم سازی میں اپنے پیروں پر جمے رہے۔''اگر فیض کے جیل سے لکھے ہوئے خطوط نہ ہوتے تو ہمیں دوسرے شعراء کی طرح فیضؔ کی بھی مطالعہ کردہ کتابوں کا پتہ نہ چلتا۔''(۵۰)

فیض نے عربی ، فارسی ،اردو انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کا مطالعہ کیا شعر وادب کے علاوہ علوم ،عروض لغات پڑھا ناول اور ڈراموں سے بھی فیض یاب رہے تقی عابدی نے خطوط

سے حاصل کی گئی کتابوں کی مکمل فہرست درج کی ہے مگر یہاں تفصیل سے گریز کیا جارہاہے۔

''فیض کے بہتر (۷۲) ادبی نشتر'' اس تحریر میں تقی عابدی نے فیض کی تمام ترتحریروں تقریروں اورتفسیروں سے انتخاب کرکے ایک گلدستہ تیار کیاہے جس کامقصد فیض فہمی کے دائرے کووسیع کرنے کے ساتھ ساتھ ہرگوشے پر روشنی ڈالنا بھی ہے تاکہ کسی حد تک فیض کی علمیت شعروادب سے واقفیت تنقیدی ثروت ان کی مانی ہوئی تخلیقی قوت کے ساتھ ظاہر ہوسکے۔ بقول تقی عابدی یوں تو فیض محفل میں ایک پوری انجمن ہوتے ہوئے بھی عموماً خاموش رہتے تھے لیکن تحریروں میں ان کاقلم جب منہ کھولتا تھا تو گوہر اگلتا تھا'' تقی عابدی نے ان تمام ادبی نشتروں کواپنے اس مضمون میں درج کیاہے۔مقالے کی طوالت کے مدنظر میں یہاں صرف ۲ یا ۳ اقتباسات ہی درج کروں گی تاکہ قاری اس سے اندازہ کرسکیں اورمذکورہ کتاب چونکہ بنیادی ماخذ کادرجہ رکھتی ہے لحاظ تفصیل سے گریز کیاجارہاہے۔

(ا)''ادب سماج کے اجتماعی فکر کی پیداوار ہوتاہے اس فکر کی صورت بدلتی ہےتو ادب کارنگ بھی دوسراہوجاتاہے''۔(میزان)

(۲)''ادب کلچر کا سب سے ہمہ گیرسب سےنمائندہ سب جامع اور سب سے مؤثر جزو ہے کلچر کے باطنی اورنظریاتی پہلو پرنظر ڈالیےتو مجموعی عقیدوں قدروں تجربوں اور امنگوں کاتعین تعریف اورتفسیر سب سے زیادہ

ایک ہی کے نطق قلم سے ہوتی ہے''۔(میزان)(۵۱)

''فیض کے لطیفے'' اس مضمون میں تقی عابدی نے چند لطائف اور چند ظریفانہ نکات پیش کئے ہیں مثال کے طور پر یہ لطیفہ دیکھیں:

''۱۹۸۱ء کی بات ہے فیض لندن آئے ہوئے تھے قیام لندن کے دوران وہ ہر روز کچھ دیر کے لئے اردو مرکز (پکاڈلی) ضرور تشریف لایا کرتے۔ افتخار عارف اردو مرکز کے معتمد اعزازی تھے اور اس زمانے میں موٹر ڈرائیونگ سیکھ رہے تھے کار کے آگے''L'' کی تختی لگی ہوتی اور ان کے برابر میں کوئی تجربہ کار لائسنس ہولڈر بیٹھا ہوتا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی لندن آئے ہوئے تھے فیض صاحب اور گوپی چند نارنگ صاحب کو ایک ہی دن لندن سے واپس ہونا تھا۔ دونوں کے ہوائی جہازوں کا فلائیٹ ٹائم بھی قریب قریب ایک ہی تھا پرواز مختلف۔ افتخار عارف اپنی کار میں ان دونوں کو لے کر ہتھیر وایر پورٹ کی طرف اس طرح چلے سامنے افتخار عارف کے برابر نیازی بیٹھے تھے اور پچھلی نشست پر فیض صاحب اور گوپی چند نارنگ بیٹھے تھے۔ راستے میں سامنے سے ایک گاڑی کسی قدر ڈگمگا گئی اس پر نارنگ صاحب نے کہا۔

'' فیض صاحب ! اردو شاعری کا مستقبل خطرے میں معلوم ہوتا ہے۔'' فیض صاحب نے برجستہ کہا۔

''اردو تنقید کا مستقبل بھی کچھ خاص زیادہ محفوظ نہیں ہے۔''(۵۲)

تقی عابدی نے فیضؔ کے کلام سے ایک اور انکشاف کیا ہے کہ فیضؔ نے ایک نعت بھی لکھی جو ان کے مجموعہ کلام ''غبار ایام'' میں موجود ہے جس کی تاریخ اور مقام تخلیق کا کہیں ذکر نہیں ملتا یہ نعت جو غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے جو مردف ہے اور ردیف ''تُو'' ہے۔ یہ نعت فارسی زبان میں ہے اور اس کے پانچ اشعار ہیں جس کا مطلع یوں ہے:

اے تو کہ ہست ہر دل محزوں سرائے تُو

آوردہ ام سرائے دگر از برائے تُو

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے حضور ہر رنجیدہ دل آپ کی رہائش گاہ ہے میں بھی ایک اور رہائش گاہ آپ کے لئے لایا ہوں یعنی حضور اکرم چوں کہ یہ رنجیدہ دل میں رہتے ہیں اور اس کے درد سے واقف ہیں اس لئے میں بھی اپنا درد بھرا دل لایا ہوں تا کہ آپ میرے دل میں قیام کر کے میرے درو غم سے آشنا ہوں۔

تقی عابدی اس نعت کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کا ہر شعر محروم، مجبور، مظلوم اور مغموم افراد کے جذبات کی عکاسی اور ان کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے، فیضؔ کی اس مختصر جامع نعت میں نعت کے کسی اسامی اور ثانوی موضوع کا ذکر نہیں لیکن یہ تجلی واردات سے لبریز عقیدت سے سجی ہوئی جذبات نگاری ہے جس پر خارجی مشاہدات اور تجربات کی گہری چھاپ ہے۔''(۵۳)

تقی عابدی نے اس نعت کے تمام اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

''شام غربت'' کے عنوان سے تقی عابدی نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے فیض کی نظم ''شام غربت'' جو کہ اُن کے مجموعہ 'غبار ایام'' میں شامل ہے پر تبصرہ کیا ہے یہ نظم ترکیب بند کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس کے ہر بند میں تین مصرے ہیں اور اس کی تاریخ تصنیف اور مقام تصنیف بھی معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ تقی عابدی لکھتے ہیں:

''نظم کا موضوع' شام غریباں، ہے۔ اس شام کو کربلا کے میدان میں اہل بیت کے خیمے جلائے گئے شہدائے کربلا کے سر نیزوں پر بلند کیے گئے اور امام حسینؑ کے اعزاء اور اقارب کو اسیر کیا گیا فارسی عربی کی طرح اردو شاعری میں بھی شام غریباں کا ذکر بڑے درد سے کیا گیا ہے ۔مصرعوں میں درد اور تنہائی کا احساس اتنا شدید ہے کہ قاری کے دل کے دھڑ کنے کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔''(۵۴)

اشعار دیکھیے:

؎درد سا درد ہے تنہائی سی تنہائی ہے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے
درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جائے

(شام غربت)

''فیض اور ایرانی انقلاب'' اس مضمون میں تقی عابدی نے فیضؔ کی ان دو نظموں کا تجزیہ کیا ہے جو انھوں نے ایرانی انقلابی جدو جہد پر لکھیں ۔اقبال کے بعد فیضؔ اردو کے دوسرے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے ایرانی انقلاب کے لئے خصوصاً نظمیں لکھیں۔ پہلی نظم فیضؔ کے مجموعہ کلام ''دست صبا'' میں شامل ہے جس کا عنوان ہے ''ایرانی طلبہ کے نام جو امن اور آزادی کی جدو جہد میں کام آئے ۔''

دوسری نظم ''و یبقیٰ وجہ ربک'' ہے جو ''میرے دل میرے مسافر'' میں شامل ہے۔

ے یہ کون جواں ہیں ارض عجم
اے ارض عجم اے عرض عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی کس ہاتھ لگی

بقول تقی عابدی ایرانی عوام ہی نہیں خواص بھی جن میں ادیب وشعراء شامل ہیں اس عمدہ نظم سے واقف ہیں جو ان کے انقلاب کے لئے خصوصاً اور دنیا کے لئے روزمرہ ہوتے ہوئے انقلابات کے لئے عموماً لکھی گئی ہے۔

دوسری نظم جس کا ذکر کہیں کہیں ملتا ہے جو''مرے دل مرے مسافر'' میں شامل ہے۔ تقی عابدی نے لکھا ہے کہ سوائے آغا ناصر کسی ادیب یا شاعر نے اس نظم کی وجہ تصنیف بیان نہیں کی ہے۔ جس کی دلیل کے طور پر انہوں نے'' آغا ناصر'' کی وہ تحریر جو انہوں نے''ہم جیتے جی معروف رہے'' میں لکھی ہے کا با قاعدہ حوالہ بھی پیش کیا ہے

ویبقیٰ وجہ ربک:

''ہم دیکھیں گے۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

وہ دِن کے جس کا وعدہ ہے

جو لوحِ ازل میں لکھا ہے

جب ظلم وستم کے کوہ گراں

روئی کی طرح اڑ جائیں گے''

اس نظم کی بابت تقی عابدی نے لکھا ہے کہ

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظم فیض نے ایران کے اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر لکھی اس نظم کا عنوان بھی قرآن کریم کی آیت ہے۔ یہ آیت قرآن کی مشہور آیت ,کُل مَن عَلَیھافَانْ'' کے فوری بعد ہے یعنی تمام جاندار فنا ہو جائیں گے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس باقی رہے گی جو احسان اور عظمت

والی ہے ،مزید برآں اس نظم میں فیضؔ نے قیامت سے پہلے اوراس کے
دوران پیش آن والے واقعات بیان کئے ہیں۔'' (۵۵)

نظم کے چند اشعار:

جب ظلم وستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پانو تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
ہم اہل صفا مردودِ حرم
مسند پر بیٹھائے جائیں گے

ان نظموں کو زیرِغور لاکرتقی عابدی نے ہماری توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے کہ فیضؔ کی وہ نظمیں جواپنے آپ میں انفرادیت رکھتی ہیں اوراپنی نوعیت کی خاص نظمیں ہیں پر جتنی توجہ دینی چاہئے اتنی محققین وناقدین نے نہیں دی ہے۔لہٰذاان کا یہ مضمون ہمیں یہ تحریک بھی دیتا ہے کہ اہل ادب کواس جانب بھی توجہ دینی چاہئے ۔فیضؔ قرآن اورعلوم قرآن واحادیث سے واقفیت رکھتے تھے اورترقی پسند شعراء میں شائد ہی کوئی شاعر ایسا ہو کہ جس کا عنوان قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہو یہ بھی فیضؔ کی انفرادیت کااہم ثبوت ہے۔

''جومیراتمہارارشتہ ہے'' (فیض کے خطوط سرفراز کے نام۔دامن یوسف کا تارتار تجزیہ)

جیسا کہ خود عنوان سے بھی ظاہر ہے اس مضمون میں تقی عابدی نے ان خطوط کا ذکر کیا ہے۔ جو فیض نے سرفراز اقبال کو لکھے ان خطوط کو بیگم سرفراز اقبال نے ۱۹۸۸ء میں فیض کی وفات کے بعد ضروری تبصروں اور تشریحوں کے ساتھ ''دامن یوسف'' کے نام سے لاہور سے شائع کیا تقی عابدی ''دامن یوسف'' کی بابت لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کا اصل موضوع فیض کے پچپن (۵۵) سے زیادہ خطوط ہیں جن میں نجی معاملات ذہنی کیفیات فکری اتار اور چڑھاؤ قومی ملی بین الملی مسائل کے علاوہ کچھ ایسے الفاظ جملوں میں جمائے گئے ہیں جن سے پاکیزہ محبت اور پر خلوص عشق کا مراغ ملتا ہے۔''(۵۶)

خطوط کے مجموعہ ''دامن یوسف'' میں تین خط سبط حسن کے اور پانچ چھ کے قریب خط ابن انشاء کے بھی شامل ہیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اس مجموعہ میں سرفراز اقبال کا کوئی خط شامل نہیں ہے جن کا فیض نے جواب لکھا ہے۔ البتہ جوابی خطوط سے اشارہ ملتا ہے کہ سرفراز بیگم نے بھی خطوں کے جواب لکھے ہیں۔

تقی عابدی نے لکھا ہے کہ ان خطوں میں متن رسمی نوعیت کا ہے خط عزیزی سرفراز سے شروع ہو کر مخلص فیض پر ختم ہوتا ہے جو بعد میں پیاری سرفراز ہو کر پیار اور فقط فیض پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون کے حوالے سے پیش کئے گئے خطوط کے مطالعے سے فیض اور

،سرفراز اقبال کے پرخلوص عشق اور پاکیزہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی فیض کی بیماریوں اور وطن پرستی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

''دامنِ یوسف'' میں ان خطوط کے بارے میں سرفراز لکھتی ہیں:

''میں جب فیض صاحب کے ان خطوں اُن کی باتوں ان کے لفظوں اور اِن کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں ہی میرا زادِ سفر ہوگا اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان ایمان کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب مری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہوگی تو حدِ نظر پر کسی مقدس سمت سے اچانک کوئی خوشبو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی: ارے بھئی! میرے خط کہاں ہیں؟ وہیں دنیا میں چھوڑ آئی ہو؟ کاش ایسا ممکن ہوتا۔'' (۵۷)

یہاں ایک خط بطورِ مثال پیش کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین اندازہ کر سکیں۔

''پیاری سرفراز...... تمہارا کہنا بالکل غلط ہے کہ تمہیں ملاقات کی ہم سے زیادہ طلب ہے تمہارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سامان موجود ہے یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے بالکل House Arrest کی سی کیفیت ہے اسی وجہ سے ہم دامن چھڑوا کر کبھی ادھر اُدھر نکل جاتے ہیں

لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے ۱۰۴ نمبر اور اب سنا ہے کسی نئے تاج محل میں ہے۔ بہت سا پیار۔ فیض''(۵۸)

ماحصل یہ کہ تقی عابدی نے سرفراز اقبال کی کتاب ''دامن یوسف'' کا تجزیہ پیش کر کے ہماری معلومات میں اہم اضافہ کیا ہے جو کہ فیض فہمی کے حوالے سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیتا ہے۔ اس مضمون سے ہمیں سرفراز اقبال اور فیض کے معاشقہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے اکثر و بیشتر لوگ ناواقف تھے۔ لہٰذا اس زاویے سے فیض کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے ساتھ ہی یہ خط دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ آخر میں فیض کے وہ اشعار جو انھوں نے سرفراز اقبال کو خط میں تحریر کئے ہیں درج کئے جا رہے ہیں:

اب تو لگتا ہے کہیں کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچے میں کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
شاید وہ کوئی وہم تھا ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا

اب بیر نہ الفت نہ کوئی ربط نہ رشتہ
اب نہ کوئی تیرا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

تقی عابدی نے ''جدول تصانیف'' کے عنوان سے فیضؔ کی تمام تصانیف کی فہرست درج کی ہے جن میں منظوم منشور غزلوں نظموں قطعات فردیات تراجم۔ نذرانے ڈرامے۔ کلیات فیض میں اساتذہ کے منقولہ اشعار۔ انتسابات تصانیف پر خودنوشے مقدمات اور دیگر تحاریر کو منظوم اور منشور صورت میں علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا ہے ساتھ ہی شماریات پر مبنی فہرست بھی درج کی ہے۔ تصانیف کی تعداد۔ سال اشاعت غزلوں کی تعداد اشعار کی تعداد، نظموں کی تعداد قطعات کی تعداد، ان کے اشعار کی تعداد وغیرہ وغیرہ کو نہایت ہی سلیقے سے علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا ہے اور حوالے پیش کئے ہیں۔ جن میں چند ایک کو یہاں نقل کیا جارہا ہے تا کہ قاری خود اندازہ کر سکے کہ تقی عابدی نے کن مشکل مراحل کو طے کر کے اپنی بات ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

تصانیف	تعداد
۱۔ کل کلیات (سارے سخن ہمارے اور نسخہ ہائے وفا)	۲

۲۔ کل مجموعہ کلام	۷
۳۔ کل غزلیں	۸۲
۴۔ کل اشعار غزل	۴۷۸
۵۔ کل نظمیں	۱۸۰
۶۔ کل قطعات	۴۱
۷۔ کل اشعار قطعات	۸۳
۸۔ کل فردیات	۳
۹۔ کل گیت	۸
۱۰۔ کل فلمی گیت	۱۰
۱۱۔ کل پنجابی نظمیں	۶
۱۲۔ کل پنجابی گیت	۳
۱۳۔ کل متفرقات	۲۹
۱۴۔ کل تعداد تراجم	۲۱
۱۵۔ کل نظمیں نذرانہ	۸
۱۶۔ کل تعداد غیر مدون کلام	۳۸
۱۷۔ کل نثری تصانیف	۱۱

تصانیف

۱۔ نقش فریادی ۱۹۴۰ء

۲۔ دست صبا ۱۹۵۲ء

۳۔ زنداں نامہ ۱۹۵۶ء

۴۔ دست تہہ سنگ ۱۹۶۵ء

۵۔ سروادیِ سینا ۱۹۷۱ء

۶۔ شام شہر یاراں ۱۹۷۸ء

۷۔ مرے دل مرے مسافر ۱۹۸۰ء

۸۔ غبارِ ایام (فیض کے آخری زمانے کی شاعری کا مجموعہ جو اُن کی رحلت کے بعد مرتب ہوا اور نسخہ ہائے وفا میں شامل ہے)

۹۔ سارے سخن ہمارے (کلیات) ۱۹۸۲ء

۱۰۔ نسخہ ہائے وفا ۱۹۸۶ء

منثور

۱۔ میزان (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۲ء

۲۔ صلیبیں مرے دریچے میں ۱۹۷۱ء

۳۔ متاعِ لوح و قلم (تحریریں اور متفرق) ۱۹۷۳ء

۴۔ سفر نامہ کیوبا ۱۹۷۴ء

۵۔ ہماری قومی ثقافت ۱۹۷٦ء

٦۔ مہہ وسال آشنائی (سفر نامہ، یادیں، تاثرات) ۱۹٦۰ء

۷۔ پاکستان ٹائمز کے اداریے ۱۹۸۰ء

۸۔ قرض دوستاں (مقدمے، دیباچے، فلیپ) ۱۹۸۴ء

۹۔ انتخاب پیام مشرق۔ (منظوم اردو ترجمہ) ۱۹۷۷ء

۱۰۔ مقالات فیض ۱۹۹۰ء

۱۱۔ فیض احمد فیض اور پاکستان ثقافت ۲۰۰٦ء

جیسا کہ شروع میں ذکر آچکا ہے کہ تقی عابدی نے بیان کردہ تمام تصانیف خواہ منظوم ومنشور تمام کی تعداد سال اشاعت وغیرہ کی بہترین طریقے سے فہرستیں تیار کی ہیں مگر مضمون کی طوالت کی خاطر تمام کو یہاں پیش کرنے سے گریز کیا گیا ہے البتہ ان کی فہرستوں کو دیکھنے اور پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تقی عابدی نے کتنا وقت صرف کر کے تلاش اور کھوج کے بعد سن اشاعت غزلوں کی تعداد نظموں کی تعداد ان کے علاوہ اشعار کی تعداد وغیرہ وغیرہ کو درج کیا ہے اور حوالے دیئے ہیں۔ان کا یہ کارنامہ اپنے آپ میں ایک انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ جہاں تک راقمہ کو علم ہے ابھی تک کسی بھی ناقد و محقق نے اس طرح فیض سے جڑی تصانیف شماریات پر مبنی تجزیہ نہیں کیا ہے۔لہٰذا تقی عابدی کا یہ کام لائق تحسین ہے۔

طبابت سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے اتنی محنت صرف کر کے ایک انوکھا کارنامہ انجام دیا ہے جسے آئندہ وقت میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس کتاب کی محنت اور لگن دیکھ کر تقی عابدی کی تحقیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے میں گریز نہیں ہے کہ تقی عابدی کا شمار اول درجے کے محققین و ناقدین میں ہوتا ہے۔

''تخلیق فیضؔ پر ایک نظر'اس عنوان کے تحت تقی عابدی نے فیضؔ کی تمام تخلیقات کی تعداد۔ مصنف ، مطبع / تاریخ خطوط کی تعداد۔ کن کے نام لکھے گئے اور کس کتاب میں اور کب اور کتنے شائع ہوئے وغیرہ کی تفصیل درج کی گئی ہے ''فیض پر مرتبہ'' کتب ورسائل کے عنوان کے تحت تقی عابدی نے ان کتب ورسائل کی تعداد مصنف / مؤلف/ مطبع معہ تاریخ درج کی ہے۔ جو فیض کے حوالے سے مرتب کی گئی ہیں جس کی تعداد تقی عابدی نے (۵۶) درج کی ہے۔ ''فیض پر مرتبہ مضامین کا ذخیرہ'' کے عنوان کے تحت فیضؔ کے حوالے سے ترتیب دیئے گئے مضامین کی تعداد کتاب ریفرنس معہ تاریخ اور مضمون نگاروں کے ناموں کا اندراج کیا ہے جن کی تعداد (۳۳۰) ہے۔

تقی عابدی نے اپنے اخری مضمون ''فیض کا غیر مدون کلام'' میں فیض احمد فیضؔ کے اس کلام کی فہرست درج کی ہے جو مطبوعہ شکل میں مختلف رسائل و جرائد میں شامل ہے مگر ان کے کسی مطبوعہ مجموعہ میں شامل نہیں ہے ،لہٰذا تفصیل سے گریز کرتے ہوئے تقی عابدی کی تحریر کو ہی پیش کیا جا رہا ہے تا کہ غیر ضروری طوالت سے بچا جا سکے۔

''ہم نے فیضؔ کی تصانیف کی جدول میں تقریباً (۴۰) غزلوں نظموں قطعوں اور گیتوں کے حوالے دیئے ہیں جو فیضؔ کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں، لیکن مطبوعہ شکل میں مختلف رسالوں اور کتابوں میں موجود ہیں یہ رسالے اب نایاب ہیں ہماری کوشش کے باوجود صرف سولہ سترہ غزلیں نظمیں اور قطعے اور گیت حاصل ہوئے ہیں''۔(۵۹)

تقی عابدی نے مختلف کتب ورسائل سے موصول ہوئی سولہ سترہ کے قریب غزلوں، نظموں گیت اور قطعوں کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ جس سے ریسرچ ز مستفید ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس غیر مدون کلام میں پنجابی اور انگریزی کلام کے علاوہ کچھ تراجم بھی شامل ہیں۔

ماحصل یہ کہ تقی عابدی نے تنقید فیضؔ کے حوالے سے فیضؔ فہمی کے تمام گوشوں کو وا کر دیا ہے انہوں نے اپنے ۴۲ مضامین میں ان تمام موضوعات کو سمویا ہے جو اکثر وبیشتر محققین اور ناقدین کی نظروں سے اوجھل رہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ جن پر کم توجہ دی گئی یا جن پر شروع سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ تقی عابدی نے خطوط، تقاریر، تحاریر وغیرہ جیسے بنیادی ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے فیض فہمی کو ایک انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ فیض کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی بن جاتا ہے۔

حواشی

(۱) فیض فہمی۔ از۔تقی عابدی۔سن اشاعت 2011 صفحہ نمبر۔19

(۲) ایضاً صفحہ نمبر 95

(۳) ایضاً-صفحہ نمبر 95

(۴) ایضاً

(۵) ایضا صفحہ نمبر 122

(۶) ایضاً:صفحہ نمبر 134

(۷) ایضاً:

(۸) ایضاً صفحہ نمبر)158

(۹) ایضاً صفحہ نمبر 186

(۱۰) ایضاً صفحہ نمبر 192

(۱۱) ایضاً۔صفحہ نمبر 195

(۱۲) ایضاً صفحہ نمبر 59-258

(۱۳) ایضاً صفحہ نمبر 295

(۱۴) فیض فہمی از۔ تقی عابدی صفحہ نمبر 323

(۱۵) ایضاً :صفحہ نمبر 330

(۱۶) ایضاً :صفحہ نمبر 332

(۱۷) ایضاً صفحہ نمبر 355

(۱۸) ایضاً صفحہ نمبر 356

(۱۹) ایضاً صفحہ نمبر 356

(۲۰) ایضاً صفحہ نمبر 361

(۲۱) ایضاً صفحہ نمبر 408

(۲۲) 519ایضاً صفحہ نمبر

(۲۳) ایضاً صفحہ نمبر 38-537

(۲۴) ایضاً صفحہ نمبر 548

(۲۵) ایضاً صفحہ نمبر 689

(۲۶) ایضاً صفحہ نمبر 689

(۲۷) ایضاً صفحہ نمبر 691

(۲۸) ایضاً صفحہ نمبر 691

(۲۹) ایضاً صفحہ نمبر 764

(۳۰) ایضاً

(۳۱) ایضاً

(۳۲) ایضاً صفحہ نمبر 811

(۳۳) ایضاً صفحہ نمبر 893

(۳۴) ایضاً صفحہ نمبر 893

(۳۵) ایضاً صفحہ نمبر 938

(۳۶) ایضاً صفحہ نمبر 946

(۳۷) ایضاً صفحہ نمبر 947

(۳۸) بحوالہ فیض فہمی از تقی عابدی۔ سن اشاعت 2011 صفحہ نمبر 977

(۳۹) ایضاً صفحہ نمبر 990

(۴۰) ایضاً: صفحہ نمبر 996

(۴۱) ایضاً: صفحہ نمبر 1024

(۴۲) ایضاً صفحہ نمبر 1032

(۴۳) ایضاً صفحہ نمبر 1037

(۴۴) ایضاً صفحہ نمبر 1065

(۴۵) ایضاً صفحہ نمبر 1080

(۴۶) بحوالہ فیض فہمی ''اردو مرثیہ پاکستان میں-ضمیر اختر نقوی، صفحہ نمبر 1080

(۴۷) پروفیسر گوپی چند نارنگ بحوالہ فیض فہمی، صفحہ نمبر 1083

(۴۸) ایضاً

(۴۹) ایضاً صفحہ نمبر 1091

(۵۰) فیض فہمی از۔ڈاکٹر تقی عابدی۔سن اشاعت 2011 صفحہ نمبر 1174

(۵۱) بحوالہ فیض فہمی، صفحہ نمبر، 1205

(۵۲) بحوالہ فیض فہمی۔تقی عابدی، 2011ء، صفحہ نمبر 1283

(۵۳) ایضاً

(۵۴) فیض فہمی از۔تقی عابدی، 2011ء، صفحہ نمبر 1315

(۵۵) ایضاً صفحہ نمبر 1335

(۵۶) ایضاً صفحہ نمبر 1341

(۵۷) بحوالہ فیض فہمی۔از تقی عابدی صفحہ نمبر 1345

(۵۸) ایضاً صفحہ نمبر 1342

(۵۹) صفحہ نمبر 1387

باب پنجم

تقی عابدی اور حالی فہمی

الف۔حاؔلی کا عہد اور اُردو شاعری

حاؔلی کے عہد میں اردو شاعری کی جو اصناف رائج تھیں ،ان میں روایتی رنگ صاف نظر آتا ہے۔اسی روایتی انداز میں ہمیں دنیا اور مافیہہ کے مسائل پر بھی گفتگو مل جاتی ہے۔ان کے دور میں بھی زیادہ تر شعراء صنف غزل کی جانب ہی راغب تھے تاہم انھوں نے نظمیہ شاعری پر زور دیا اور خود بھی بہت اچھی اور شاہکار نظمیں کہیں،اس سے بھی اس دور کے شعرا نے اثر لیا اور پھر نظموں کی جانب بھی ایک رجحان نظر آتا ہے۔قصیدہ کی روایت دم توڑ رہی تھی اور مرثیہ حسب دستور مذہبی عقیدے کی روشنی میں اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔یوں تو غزل،نظم،مرثیہ اور دیگر اصناف میں حاؔلی کے دور میں اردو ادب کی آبیاری کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچ جائے گی لہٰذا اس مختصر مضمون میں مختلف اصناف کے بڑے اور بے حد اہم قلم کار جو کہ حاؔلی کے عہد میں اردو شاعری کی نمائندگی کر رہے تھے کے فن پر ہی گفتگو مقصود ہے۔یہاں میں اپنی گفتگو کا آغاز صنف نظم سے کرتی ہوں۔

حاؔلی کے عہد میں پابند نظم کا رواج عام تھا ،حالانکہ نظم نگاری کی دوسری صورتیں بھی دھیرے دھیرے خود کو مستحکم کر رہی تھیں۔پابند نظم ایسی نظموں کو کہتے ہیں جن میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو۔نئے انداز کی ایسی نظمیں جن کے بندوں کی ساخت مروجہ ہیتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصروں میں قوافی کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو لیکن ان کے تمام مصرے برابر ہوں اور ان میں قوافی کا

کوئی نہ کوئی التزم ضرور پایا جائے، پابند نظم کے زمرے میں شامل ہیں۔ حالؔی کی ایک لازوال نظم 'مناجات بیوہ' جن میں انہوں نے اردو شاعری کو خیالی دنیا سے نکال کر زمینی حقیقتوں اوراس کے مسائل سے ادباء وشعراء کے ذہنوں کواس جانب راغب کرنے اوراس کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کا رجحان ملتا ہے، سے چند بند ذیل میں درج ہیں۔ ان بندوں کو درج کرنا یہاں میرا مقصد صرف اورصرف یہ ہے کہ قاری اس بات سے روشناس ہو جائے کہ حالی نے ابتداء میں کیسے اپنے خیالات کونظم کی صورت میں کامیابی کے ساتھ ڈھالا:

آہ سے اس کی مشکل جینا
درد فقت تھا سارا سینا
دل میں تمنا ،داغ جگر میں
شیون لب پر ،یاس نظر میں
نالے شب کو اس کے سن کر
مر گئے کتنے سر کو دھن کر

(مناجات بیوہ)

سرور جہان آبادی

حالؔی کے عہد میں درگا سہائے سرور جہان آبادی (پ۔۱۸۷۳ء و۔۱۹۱۰ء) کا نام ایک اہم نظم گو کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔انھون نے جو کچھ بھی لکھا،اس پر پوری

توجہ صرف کی ان کی وطنی موضوعات پر مبنی نظمیں پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان کے جیسا محبّ وطن بہت مشکل اور دوسرا کوئی پیدا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ اسی طرح جب انھوں نے قومی موضوعات پر قلم اٹھایا تو اس میں بھی اپنی مثال آپ بن گئے۔ ان کی طبیعت میں وارفتگی تھی۔ ان کی شعری فضا میں گنگا، جمنا، کوئل، بھنورا، پدمنی، دمینتی، ہنس وغیرہ کلیدی الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں جو مایوس فضا ملتی ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا اکلوتا بیٹا عین جوانی میں انتقال کر گیا تھا، اس کا ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر بھی گہرا اثر پڑا۔ ان کی مختلف نظموں سے چند بند ذیل میں درج ہیں۔

پھولوں کا کنج دل کش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

(گلزار وطن)

جگر کے داغوں نے کی ہے چمن کی تیاری
کہو کہ دیدۂ تر جوئے خوں کرے جاری

(بے ثباتی دنیا)

کسی مست ناز کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی، دل بے قرار سو جا

(دل بے قرار سو جا)

اکبرالہ آبادی:

اکبر حسین اکبرالہ آبادی (۱۸۴۵ تا ۱۹۲۱) اردو کے مزاحیہ ادب میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔بعض کتب میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء بھی درج ہے۔انھوں نے کافی تعداد میں غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی اصل شناخت اور انفرادیت طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ہے۔انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو محض ہنسنے ہنسانے کے ذریعہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی اصلاح کے ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔انھوں نے انگریزی تعلیم کے ذریعہ ہندوستانی سماج میں رائج ہونے والے منفی معاشرتی رجحانات پر گہری چوٹ کی ہے۔مغربی تہذیب کی اندھی تقلید نے آج ہمارے معاشرے کو کس مقام پر کھڑا کر دیا ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔اکبر اتنے دور اندیش تھے کہ انہیں ان خرابیوں کا احساس بہت پہلے ہو گیا تھا۔وہ معاشرے کی خامیوں کو بڑے دلچسپ انداز میں ابھارتے ہیں اور لطیف پیرائے میں طنز کرتے ہیں جو ناگوار نہیں گزرتا۔ان کے یہاں شیخ، بدھو، جمن، کلو، اونٹ، ٹٹو، گائے وغیرہ نئی نئی وضع کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔اسی طرح انھوں نے انگریزی الفاظ سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسنوں سے ذکر ہو الفت کا ،چاہ کا

رکیے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسیں
ویل مولوی ، یہ کام نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ ، جھک کے کروں آپ کو سلام
پھر نام بھی جو لیں حضور خانقاہ کا
(قطعہ)

چکبست:

پنڈت برج نارائن چکبست (۱۸۸۲ تا۱۹۲۶) کی ولادت فیض آباد (اتر پردیش) میں ہوئی لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور وکالت کرنے لگے۔جلد ہی ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔ان کا ذہنی میلان ابتدا سے ہی شاعری کی طرف تھا۔وہ دوستوں کا دل بہلانے کے لئے کبھی کبھی شعر کہہ لیتے ہیں۔لیکن اہل ادب جانتے ہیں کہ ان کی مختلف موضوعات پر نظم کہنے کی خداداد صلاحیت نے انہیں اردو ادب میں کیا مرتبہ عطا کیا ہے۔انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن جلد ہی حب الوطنی کے جذبے کے تحت قومی نظمیں لکھنے لگے۔ان کی نظموں میں قدرتی مناظر کی عکاسی بیداریٔ وطن کے جذبات آزادی کی تڑپ اور درد مندی کے پہلو نمایاں ہیں انھوں نے احباب بزرگوں اور قومی رہنماؤں کے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ان کی شاعری میں میر انیس اور مرزا دبیر کی شاعری کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہ وفا کی منزلیں اول ہوئی تمام
(رامائن کا ایک سین)

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
(آواش قوم)

وہ صبح کوہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
(کشمیر)

اقبالؔ:

علامہ داکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۳ تا ۱۹۳۸) کو شاعر مشرق اور شاعر اسلام کے خطابات سے نوازا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکی شاعری کو کسی بھی حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ قومی حصار ہو، زمانی حصار ہو یا پھر علاقائی۔انھوں نے اپنی شاعری سے پوری دنیا میں ہندوستانی تہذیب اور ایشیا کے تمدن کے ساتھ ساتھ بعض مغربی عناصر پر جو روشنی ڈالی ہے، وہ ان کے آفاقی شاعر ہونے پر دال ہے جب وہ 'رام' نظم لکھتے ہیں تو شری رام چندر جی سے ان کی گہری عقیدت جھلکتی ہے۔جب وہ گرونانک پر لکھتے ہیں تو الگ کیف میں ڈوبے

نظر آتے ہیں۔ جب ان کا قلم محمدﷺ کی نعت میں جھکتا ہے تو اس کا سرور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مرزا غالب، مسجد قرطبہ اور فلسفۂ حیات اور دینی دنیاوی اور اخروی زندگی کے متعلق اپنے شعری خیالات کا اظہار جس اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ قومی یکجہتی کے تعلق سے بھی انھوں نے بہترین نظمیں تحریر کی ہیں۔

لب ریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند

(رام)

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

(نانک)

جوش ملیح آبادی:

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی (۱۸۹۶ تا ۱۹۸۲) کی آواز کو تقسیم ہند کے پہلے اقبال کے بعد اردو نظم نگاری کی سب سے معتبر آواز مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس پر اختلاف بھی ہے۔ لیکن ان کی عوام وخواص میں شہرت ومقبولیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ ان کے یہاں شباب کا جوش ہے تو انقلاب کا ولولہ بھی بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی

شاعری سے شعراء کی پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔شاعر شباب۔شاعر انقلاب بھی کہلائے۔حالانکہ انھوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ابتدا میں فطرت کی تصویر کشی اور منظر نگاری ان کا خاص رجحان تھا اور اسی سبب انھیں شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔اپنی ابتدائی نظموں میں وہ ایک جذباتی ،رنگین مزاج اور حسن پرست نوجوان نظر آتے ہیں۔تحریک آزادی کی فضا میں جب وطن اور سیاسی مسائل نظموں کا موضوع بننے لگے۔تو ان موضوعات پر انھوں نے بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں اور شاعر فطرت سے شاعر شباب اور شاعر انقلاب بن گئے۔۔

؎ کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے،گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور ٹوٹ رہی ہیں زنجیریں

(شکست زنداں کا خواب)

ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ،کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

(ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام)

ضعف سے آنکھوں کے نیچے پتلیاں پھرتی ہوئی
اوج خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئی

(مفلس)

حالؔی کے عہد میں غزلیہ شاعری:۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر دور کی طرح مولانا الطاف حسین حالؔی (۱۸۸۷ تا ۱۹۱۴) کے دور میں بھی غزل اپنی خصوصیات کی بنیاد پر مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ حالی نے خود غزلیں کہی ہیں اور بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں۔ وہ غزل کو تصنع اور مبالغے سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ ان کا شعری ذوق نہایت بالیدہ اور رچا ہوا تھا، اس لئے ان کی غزلیں لطف و اثر کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی ہیں، انکی غزلیں پست رکیک اور مبتذل مضامین سے پاک ہیں۔ چند اشعار۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

شاد عظیم آبادی:۔

علی محمد شاد یعنی شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶ تا ۱۹۲۷) نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہیں جو سادگی

اور گھلاوٹ،ترنم وشیرینی،کیف وسروراور اثر وتاثیر کی بدولت اردو ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔اردوغزلیہ ادب پر انکا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ ایک وقت میں جب غزل کا زور اور اثر کم ہونے لگا تو انھوں نے اسے اپنے فن سے ایک نئی زندگی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔غزل کو نکھارنے ،سنوارنے اور استحکام بخشنے کا ہنر ان سے بہت سے ادبا وشعرا نے سیکھا۔انکی غزلوں کی خاص خوبی زبان و بیان کی سادگی اور صفائی ہے۔واردات قلبی کے ساتھ اخلاق،فلسفہ اور توحید ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ان کے اظہار میں انھوں نے جس لطیف انداز بیان سے کام لیا ہے،وہ سادہ سے خیال کو بھی دل پذیری اور اثر پذیری سے ہم کنار کرتا ہے:۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

اب بھی اک عمر میں جینے کا نہ انداز آیا
زندگی !چھوڑ دے پیچھا مرا مین باز آیا

باغ بہشت کا سماں ،دل کو یہیں دکھا دیا
اس کی زباں پہ ہم نثار،جس نے ترا پتا دیا

اقبالؔ:۔

اقبالؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی، لیکن جلد ہی نظم کی طرف راغب ہو گئے اور شاعر مشرق کہلائے۔ان کی غزلوں کا سرمایہ ان کی نظموں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن جو بھی ہے اس میں زبان برتنے کا فنکارانہ انداز ملتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری سے بھی اور موضوعات کے اعتبار سے بھی مختلف جہات میں اضافہ کیا ہے۔انکے فن کارانہ برتاؤ سے اردو شاعری میں نئے خیالات کے اظہار کی مختلف راہیں کھلیں۔نئی تشبیہات و استعارات اور تراکیب نے جگہ پائی اور اس طرح اردو غزلیہ شاعری نئے امکانات بھی پیدا ہوئے۔ان کی غزلوں میں وسعت اور گہرائی کا اندازہ ذیل میں درج ان کے چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
کبھی اے حقیقت منتظر !نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزار سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ تو زمیں کے لئے ہے، نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے ،تو نہیں جہاں کے لئے

حسرت موہانی:

سید فضل الحسن حسرت موہانی (۱۸۷۵ تا ۱۹۵۱) کو طالب علمی سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا، انکی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے کئی کتابوں میں پیدائشی سن ۱۸۸۱ اُ ۱۸۸۰ بھی آیا ہے۔ وہ تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک رہے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن آزادیٔ کامل جس کا نعرہ انھوں نے گاندھی جی سے بھی پہلے دیا تھا، اس سے کم کسی بھی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ اردو غزل کو از سر نو مقبول بنانے میں جبکہ حالی اور آزاد کے زیر اثر غزل کے فرسودہ مضامین کے بجائے اس سے بھی آگے بڑھکر جب غزل کی صنف کو ہی معتوب ٹھرایا جانے لگا تو حسرت موہانی نے بھی اس غلط نظریہ کے خلاف اپنے غزلیہ فن کے ذریعہ قلمی جہاد کیا۔ انھوں نے غزل کے موضوعات میں عشق کی تہذیبی فکر اور اسے اظہار کے لئے زبان کی شائستگی سے اہل ادب کو آشنا کیا۔ ان کے اشعار میں درد و اثر کے ساتھ شیرینی و دلکشی اور طرز ادا میں شگفتگی اور لطافت ملتی ہے۔ عشقیہ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی، واردات قلب کی عکاسی، تصوف کی چاشنی، سیاست کی ترجمانی، آزادی کی تڑپ اور ان کے خود کے کہنے کے مطابق 'زبان لکھنو میں رنگ دہلی کی نمود' ان کے کالام میں امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں۔

ؔروشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

نگاہ ناز ،جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
شب فرقت میں یاد اس بے خبر کی بار بار آئی
بھلانا ہم نے بھی چاہا،مگر وہ بار بار آئی

فانی بدایونی

شوکت علی خاں فانی بدایونی (۱۸۷۹ تا ۱۹۴۱) نے پہلے شوکت اور بعد میں فانی تخلص اختیار کیا۔ان کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔اول درجے کی فنکاری ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے۔انھیں بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا لیکن والد شاعری کے سخت خلاف تھے لہٰذا وہ چھپ چھپ کر شعر کہتے تھے اور کسی استاد کی اصلاح بھی نہ لے سکے۔عدم تعاون کی مایوسی نے ان کی شاعری میں بڑی شدت اختیار کر لی ۔خیال کی گہرائی اور درد انگیزی ان کے اشعار میں جا بجا ملتی ہے ۔انھوں نے حسن وعشق کو بھی موضوع سخن بنایا ہے اور تصوف ومعرفت کی جانب بھی اپنی شعری توجہ مبذول کی ہے لیکن ان کا اصل موضوع غم حیات ہے۔ان کی شاعری کی عام فضا رنج والم اور یاس وحرماں اور ناکامی ونامرادی وغیرہ رہے ہیں۔موت ان کے یہاں ایک محبوب کی حیثیت رکھتی ہے ۔اس وجہ سے انھیں یاسیت کا امام بھی کہا جاتا ہے۔

اِک معمہ ہے،سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے،خواب ہے دیوانے کا
کسی کے ایک اشارے میں،کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی،موت کو بہانہ ملا
آ ! ورنہ جانتا ہوں فریب نظر کو میں
دیکھوں الٹ کے پردۂ زخم جگر کو میں

اصغر گونڈوی:

اصغر حسین اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ تا ۱۹۳۶)اصغر بہت کم گوشاعر تھےلیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے کلام سے اہل ادب کومتوجہ کیا۔ان کے منفرد رنگ کی ابتدا 'نشاط روح' سے ہوتی ہے۔وہ فرسودہ اور پیش پا افتادہ مضامین سے گریز کرتے تھے۔انھوں نے اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح منشی خلیل احمد وجد بلگرامی سے لی۔بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو بھی دکھائیں۔اس کا اثر یہ ہوا کہ زبان و بیان اور خیالات دونوں اعتبار سے ان کا کلام عامیانہ پن سے پاک ہوگیا۔ان کے لب و لہجے میں ایک متانت آمیز رنگینی ،زبان و بیان میں ایک عالمانہ وقار پایا جاتا ہے۔

پاتا نہیں جو لذت آہ و سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں
پھر میں نظر آیا نہ تماشہ نظر آیا
جب تو نظر آیا، مجھے تنہا نظر آیا
اسرار عشق ہے دل مضطر لئے ہوئے
قطرہ ہے بے قرار سمندر لئے ہوئے

یاس یگانہ چنگیزی:

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی (۱۸۸۴ تا ۱۹۵۶) پہلے یاس تخلص کرتے تھے بعد میں یگانہ ہو گئے۔ ان کی شخصیت میں انانیت بہت زیادہ تھی جس کا اثر انکی شاعری پر بھی ہے۔ ان کے ہم عصر شاعروں سے معرکے رہے جس کے سبب وہ مرزا غالب کے بھی خلاف ہو گئے اور اپنے سے اختلاف رکھنے والوں جن میں کثیر تعداد مرزا غالب کے شاگردوں کی تھی۔ ان کے کلام میں قوت اور زور ہے۔ بانک پن اور آزادہ روی ان کے مزاج کا حصہ تھی جس کا اثر انکے کلام میں موجود ہے۔ فکر کی تازگی اور احساس کی جدت نے ان کی شاعری میں ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو کہ اپنا لطف رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں فکری گہرائی اور تہہ داری زیادہ نہیں ہے۔ روزمرہ کی بول چال کے ایسے الفاظ بھی جو کہ ادبی زبان کا حصہ اس زمانے

میں میں تسلیم کئے جاتے تھے،کہیں کہیں انکا استعمال بھی انھوں نے معنی میں تیزی اور تندی لانے کے لئے کیا ہے۔

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا
خودی کا نشہ چڑھا ،آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا
چلے چلو ! جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

آرزولکھنوی:

سید انور حسین آرزولکھنوی (۱۸۷۲ تا ۱۹۵۱)لکھنؤ کے شعراء میں خاصے مشہور تھے۔ ہندوستانی زبان جس کووہ خالص اُردو مانتے تھے میں اُنھوں نے اپنی دھاک جمائی۔'سریلی بانسری' میں ان کے ایسے کلام کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس پابندی کے ساتھ اور آسان زبان میں لکھنے کے باوجود وہ اپنے خیالات اور جذبات کا نہایت خوبی سے اظہار کر لیتے ہیں۔وہ ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ ایسے سلیقے سے لاتے تھے کہ کلام کا لطف بڑھ جاتا تھا وہ لکھنوی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں یہی وجہ کہ لکھنوی غزل کونکھارنے میں ان کا

کردار بہت اہم رہا۔

اول شب وہ بزم کی رونق،شمع بھی تھی،پروانہ بھی
رات کے آخری ہوتے ہوتے ختم ہوا یہ افسانہ بھی
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے پانی ،ڈوب چلا مے خانہ بھی
ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے،رقص میں ہے پروانہ بھی

حالؔی کے عہد میں مرثیہ نگاری:

حالؔی کے عہد میں مرثیہ نگاری نگاری کی وہی عام روایت نظر آتی ہے جو پہلے کے ادوار میں تھی۔جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیے 'حسین اور انقلاب' میں مرثیہ نگاری کے فن کو عصری مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی۔دلیل کے طور پر ایک بند ذیل میں درج ہے۔

ہم راز !یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ
دو دن کی زندگی کا غم ایں و آں نہ پوچھ
کیا کیا حیات ارض کی ہیں تلخیاں نہ پوچھ
کس درجہ ہول ناک ہے یہ داستاں نہ پوچھ

تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرط شرم سے منھ ڈھانپنے لگے

حالؔی کے عہد میں مثنوی نگاری:

حالؔی کے عہد میں ایک مثنوی نگار بےنظیر شاہ وارثی (۱۸۶۳ تا ۱۹۲۹) ایک باکمال مثنوی نگار کی حیثیت سے اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی مثنوی میں مناظر فطرت کی عکاسی جس روانی ،سادگی ،سلاست اور وارفتگی کے ساتھ کی ہے،وہ انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ان کا کوئی دیوان شائع نہ ہوسکا۔کہا جاتا ہے کہ ایک سفر کے دوران ان کا دیوان کہیں گم ہو گیا۔مثنوی نگاری میں امیر مینائی سے مشورہ سخن لیتے تھے۔ان کی ایک مثنوی 'طلوع آفتاب' سے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر
شعائیں چمکتی ہیں اشجار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
پرندے زمیں پر اترنے لگے
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے

ب۔حالؔی کی تنقید نگاری کا مجموعی جائزہ

ادب کے نام سے جو چیزیں لکھی جاتی ہیں اُن میں کوئی شاعری لکھتا ہے جس میں غزل نظم وغیرہ شامل ہیں کوئی انشائیہ تو کوئی سفر نامہ لکھتا ہے۔جنہیں ہم ادبی تحریریں یا ادبی تخلیق کہتے ہیں لیکن ان تمام کے ساتھ ایک اور چیز لکھی جاتی ہے جسے ہم تنقید کہتے ہیں جو ان تمام اصناف کا جائزہ لیتی ہے ۔ان کی اچھائیوں اور برائیوں کا جائزہ لیتی ہے انہیں پرکھتی ہے ۔اور یہ دیکھتی ہے کہ یہ شاعری کتنی اچھی ہے اور کتنی خراب ہے۔ یہ افسانہ کس پائے کا ہے اس میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا خامیاں ہیں جو تحریر ادب کو پرکھنے جانچنے اور ادب کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی خاطر لکھی جاتی ہے اسے ہم ادبی تنقید کہتے ہیں۔ عام طور پر تنقید کے معنی برائی کے لئے جاتے ہیں لیکن ادب کے حوالے سے اس کا مطلب ادب کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنا ہے لیکن ان خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ خوبی ہے اور یہ خامی بلکہ اس کے لئے دلیل پیش کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ یہ خوبی اگر ہے تو یہ زبان کی خوبی ہے۔صنائع بدائع تشبیہ اور استعارے کی خوبی ہے الفاظ کی خیالات کی فکر کی خوبی ہے اگر برائی ہے تو یہ بتانا پڑتا ہے کہ زبان کے کیا نقائص ہیں۔منظر نگاری کیوں اچھی نہیں ہے خیالات بلند کیوں نہیں ہیں گویا یہ تمام چیزیں جن کا ہم جائزہ لیتے ہیں انہیں تنقید کہتے ہیں۔

اردو ادب کے تعلق سے انیسویں صدی کا آخری زمانہ یعنی 1857 کے بعد کا زمانہ تہذیبی

سماجی اور تاریخی سطح پر کافی اہمیت کا حامل ہے جس کے اثرات ہمارے ادب پر بھی قائم ہوئے اور کئی نئی اصناف بھی متعارف ہوئیں۔ مثلاً تنقید، سوانح، ناول افسانہ، نظم وغیرہ یہ تمام اصناف جو کہ نئی تھیں یہ اپنے ساتھ نئے لوازمات بھی لے کر آئیں۔ جن کی کوئی خاص معیار بندی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر نظم۔ اس کا نہ تو کوئی خاص موضوع اور نہ ہیئت۔ پھر سوانح ہے جو کبھی ناول اور کبھی تاریخ کی طرز پر لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تنقید کی بھی کوئی معیار بندی نہیں ہوئی تھی اور نہ تنقید کا لفظ حالؔی کے زمانے میں اتنا عام تھا ابھی تک تذکرے لکھے جاتے تھے اور ان کا بھی ایک محدود رویہ تھا وہ تذکرہ نویسی کی پوری تاریخ سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ وقت کے تقاضے بدل چکے ہیں صرف علم معنی بیان اور بدیع کی روشنی میں ادب کی جانچ پرکھ ایک محدود عمل ہے صنائعی کا نام شاعری نہیں ہے۔ چنانچہ حالؔی نے دو چیزوں کی خاص طور پر بنیاد رکھی ایک تو نظریہ قائم کیا دوسرا عملی تنقید کسے کہتے ہیں یہ بیان کیا۔ حالی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کسی صنف کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور اس طرح انہوں نے اردو میں تنقید کا پہلا پتھر رکھا۔ اس کے بعد امداد امام اثر آئے انہوں نے بھی کچھ باتیں ان سے لیں اور کچھ نئی باتیں بھی شامل کیں۔ حالؔی نے Scientifically چیزوں کو سمجھا تھا اور معروضیت کے ساتھ پیش کیا تھا اس لئے یہ کام امداد امام اثر نہیں کر سکے۔ حالانکہ وہ حالؔی کے مقابلے میں مغربی ادب سے زیادہ واقف تھے مگر کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکے۔ جس کی وجہ سے اثر کی تنقید انتشار کا شکار ہوگئی لیکن اگر ہم حالؔی اور شبلی کا موازنہ کریں تو یہاں بھی وہی سوال اٹھتا

ہے کہ جس طرح حاؔلی کا ذہن مرتب ذہن تھا انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا مگر شبلی کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکے۔ ان کے (شبلی) ہاں کہیں اثر آفرینی ہے کہیں جمالیاتی طریقہ کار ہے کہیں رومانیت ہے جبکہ حاؔلی کے ہاں معروضیت ہی معروضیت ہے۔ اس اعتبار سے حالی کے مقالے میں شبلی کا ایک محدود تصور ادب ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ان لوگوں نے جو تنقید کے سلسلے میں بنیادیں رکھیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔

حاؔلی اردو تنقید میں بنیاد ساز کی حیثیت رکھتے ہیں مقدمہ شعر وشاعری ان کے شعری مجموعے کا مقدمہ ہے۔ جو اتنا طویل ہو گیا کہ اپنے آپ میں موضوعی خطاب بن گیا۔ مقدمہ شعر وشاعری 1893ء میں شائع ہوئی۔ ان سوسوا سو برسوں میں حاؔلی کے تنقیدی عمل ان کے تصور شعر ان کے نظریہ تنقید پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ایک نظریہ تشکیل دینے کی سعی کی ہے۔ ''مقدمہ شعر وشاعری'' دو حصوں پر مبنی ہے۔ پہلا حصہ نظری تنقید جب کہ دوسرا حصہ عملی تنقید پر مبنی ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا پھر دوسرے حصے میں مختلف اصناف پر یعنی غزل قصیدہ رباعی مرثیہ مثنوی وغیرہ پر اس کا اطلاق کیا ہے۔ اس طرح یہ ایک طرح اطلاقی تنقید بھی کہلائی۔ جب ''مقدمہ شعر وشاعری'' شائع ہوا تو چاروں اور مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حالی کو خیالی اور ڈفالی کہا جانے لگا۔ مگر آخر کار مخالفتوں کا طوفان تھم گیا اور حاؔلی کے کارناموں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور ہر کوئی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ''مقدمہ شعر وشاعری'' اردو کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب

ہے۔اور مولانا الطاف حسین حالؔی اردو کے پہلے نقاد ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مقدمہ کو اردو تنقید کا پہلا نمونہ قرار دیا اور پروفیسر آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کے پہلے منشور کا نام دیا۔

حالؔی کی شاعری کے سلسلے میں الگ الگ عنوانات سے بیان کئے گئے خیالات کی عصری معنویت سے کسی بھی نقاد کو انکار نہیں۔گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی وزیر آغاز، وارث علوی اور ممتاز حسین نے شاعری کے حوالے سے ان کے (حالؔی) نظریات اور تصورات کو عصر حاضر کے مغربی دانشوروں کے نظریات و تصورات کو سامنے رکھ کر ان کا ترجمہ کیا ہے۔ زبان تخیل نیچر، تہذیب، بحر وزن اصلیت اور مبالغہ وغیرہ پر خاص طور سے حالؔی کے نظریات پر جو وضاحتیں کی ہیں ان سے مقدمہ شعر وشاعری کی عصری معنویت واضح ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے بانی، گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات کا آغاز ہی حالؔی کی تصنیف 'مقدمہ شعر وشاعری کی عصری معنویت' کے اعتراف سے کیا ہے۔

> ''اردو میں تھیوری یعنی ادبی نظریہ سازی کی پہلی باضابطہ کتاب حالی کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' ہے، یوں تو شعریات کا احساس پہلے سے موجود چلا آتا ہے لیکن اسے منضبط کرنے کی اولین کوشش حالؔی نے ہی کی۔ مقدمہ نے عہد سرسید کی اصلاحی اور اخلاقی شعریات کی تشکیل نو کی ہی تھی۔ بعد کی

تحریکوں (ترقی پسند اور جدیدیت) اختلاف و اتفاق کے زیادہ تر مقامات
مقدمہ ہی سے فراہم ہوتے رہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنی
آئیڈیالوجیکل ترجیحات کی تکمیل وترسیل کے لئے حالی ہی کی افادیت اور
مقصدیت کی لے کو آگے بڑھایا اور یہی حقیقت بھی ہے کہ جدیدیت میں
زیادہ تر ردعمل اسی افادیت اور مقصدیت کے خلاف ہے۔ قطع نظر دونوں
کے ادبی اکتسابات سے اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ جس کی
تشکیل تو کی تھی ویسی توجہ نہ ترقی پسندوں نے اپنی تھیوری پر کی اور نہ
جدیدیت پسندوں نے''(۱)

حالی کی ناقدانہ حیثیت اور مقدمہ شعر وشاعری کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر
عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''مقدمہ شعر وشاعری حالی کے دیوان کا مقدمہ ہے۔ اردو میں اصول
تنقید کی سب سے پہلی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے
۔ اس میں انہوں نے شعر وشاعری کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے
دیکھا ہے۔ اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے۔ اردو زبان پر تنقید کی یہ
پہلی کتاب ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی
گئی ہے۔''(۲)

مولانا حالی نے اپنے روؤی عربی یا مشرقی ناقدین کے منتشر تنقیدی خیالات اورشعری روایات سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن حالی نے مغربی تنقیدی رجحانات کو بھی مدنظر رکھا اس کے بعد باقاعدہ اصول تنقید مرتب کئے جس سے تنقیدی نظریات وتصورات ایک واضح شکل میں سامنے آئے۔ بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''حالی نے باقاعدہ اصول تنقید مرتب کرکے اردو شاعری کو جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے راستہ کھول دیا۔انہوں نے قدیم وجدید نظریات کو آپس میں سمو کر اردو تنقید میں اس فن کی باضابطہ بنیاد ڈالی جس پر نئی عمارت کا کام جاری ہےاور جدید تنقید اس کے سہارے چل رہی ہے۔''(۳)

حالی کے مقدمہ کو اردو کا نقش اول تو سب نے مانا ہے لیکن حالی کو ایک معتبر نقاد کم ہی لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔کلیم الدین احمد نے جہاں حالی کا ''مطالعہ محدود اور تنگ نظر ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے مذاق اڑایا ہے وہیں شمس الرحمٰن فاروقی نے حالی کو 'احساس کمتری کا شکار بتایا ہے، لیکن وارث علوی عصر حاضر کے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے حالی کو اردو کا سب سے بڑا نقاد قرار دیا ہے۔ وارث علوی کو یہ احساس ہے کہ حالی پہلے نقاد ہیں جنہوں نے پہلی بار اچھے ادب کو اچھا اور ادنیٰ ادب کو غیر معیاری کہا۔

''وہ جس موضوع پر بات کرتے ہیں اس سے واقف ہوتے ہیں شعر وادب سے ان کی واقفیت ایک فنکار کی واقفیت ہے وہ اچھے اور برے شعر

میں تمیز کر سکتے ہیں وہ اچھی شاعری کی قوتوں کو جانتے ہیں اور بری شاعری
کی کمزوریوں کو بھی پہنچانتے ہیں۔''(۴)

حالی نے غزل پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ شعر میں صرف ذاتی تجربہ ہی بیان کیا جاسکتا ہے یعنی جس نے عشق نہیں کیا وہ عشقیہ شاعری بھی نہیں کرسکتا لیکن نورالحسن نقوی نے اپنی کتاب ''فن تنقید نگاری'' میں اس بات کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

''یہ بات بھی غلط ہے کہ شعر میں صرف ذاتی تجربہ ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ تخیل کی آنکھ شاعر کو کل کائنات کی سیر کراتی ہے اوراسے ہر تجربے سے گذار سکتی ہے۔ یہ نہ تو کوئی جواں شاعر کسی بوڑھے کے دل کی کیفیت بیان کر سکے اور مرد کسی نسوانی کردار کے ساتھ انصاف نہ کر سکے نابینا سورداس نے ان دیکھی دنیا کی ہو بہو تصویر کھینچ دی اور شیکسپیئر نے جو ملک نہیں دیکھے تھے ان کا نقشہ اتار دیا۔''(۵)

حالی کا اردو غزل پر یہ الزام بھی تھا کہ اس کے مضامین محدود ہیں اور اس وجہ سے غزل کے مضامین میں تکرار پائی جاتی ہے اور ایک ہی بات کو الٹ پلٹ کر بار بار بیان کیا جاتا ہے۔ شراب، ساقی، صراحی اور جام کا اس طرح ذکر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس برائی کی طرف مائل ہو مگر نورالحسن نقوی نے اس الزام کو بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ غزل پر مضامین کے تکرار کا جو الزام ہے وہ بھی غلط ہے وہ کہتے ہیں کہ شاعر کا کمال ہی ایک بات کو ہزار انداز

سے کہنے کی قدرت رکھتا ہے۔

کلیم الدین احمد جو اپنی سخت گیری کی وجہ سے کافی مشہور ہیں اور جن کی تنقیدی نشتروں سے کم ہی لوگ بچ پاتے ہیں وہ اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں حالی سے بیزار بھی ہیں اور کئی مقامات پر ان سے متاثر بھی نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''خیالات ماخوذ واقفیت محدود نظر سطحی فہم وادراک معمولی غور وفکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ وشخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کل کائنات''(۶)

بعض ناقدین نے کلیم الدین احمد کے اس قول کی تردید بھی کی ہے۔جس میں ڈاکٹر اختر انصاری کا نام قابل ذکر ہے۔وہ اپنی کتاب ''حالؔی اور نیا تنقیدی شعور'' میں لکھتے ہیں۔

''حالؔی کے خیالات نہ تو ماخوذ ہیں نہ واقفیت محدود ہے مقدمہ شعروشاعری مشرقی علوم و ادبیات اورادبی روایات سے گہری واقفیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔اسی گہری واقفیت کی بنیاد پر حالؔی نے اپنے تنقیدی نظریات کی عمارت کھڑی کی ہے۔''(۷)

کلیم الدین اپنے قول پر قائم نہیں رہ پائے اور جلد ہی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''اردو تنقید کی ابتداء حالی سے ہوتی ہے پرانی تنقید محذوف اور مقصود کے جھگڑوں زبان ومحاورات کی صحت واسناد ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور کیا۔اپنے

زمانے اپنے ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔(۸)

کلیم الدین احمد آج کے ناقدین کو حالؔی پر ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ آج کے ناقدین کا مغربی مطالعہ کافی وسیع ہے۔مگر باوجود اس کے وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ مقدمہ شعروشاعری سے بہتر آج تک کوئی کتاب وجود میں نہیں آسکی ہے۔

حالؔی کی سادگی سے مراد یہ ہے کہ شعر آسان خیال اور آسان الفاظ کے ذریعے پیش کیا جائے تا کہ قاری کو اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو بعض ناقدین نے اس بات سے اتفاق بھی کیا ہے مگر بعض اس سے متفق بھی نہیں ہیں۔اس کے بعد انہوں نے شعر میں اصلیت کی بات کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مبالغہ آرائی سے انحراف کیا جائے اور سچ کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔اصلیت کے متعلق بھی ناقدین نے الگ الگ آراء دی ہیں۔ یہاں زیادہ اقوال سے گریز کرتے ہوئے صرف ایک مثال پیش کی جارہی ہے۔ وزیر آغا زاپنی کتاب تنقید اور جدید اردو تنقید میں اصلیت سے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''حالؔی اصلیت سے مراد محض حقیقت کی فوٹوگرافی نہیں لیتے بلکہ داخلی جذبے کی اہمیت کا اقرار کرتے ہیں جو نفس الامر میں، عقیدہ میں یا عندیہ میں موجود ہو تو کوئی حرج نہیں یہاں حالی نے Realism کے مفہوم کو کشادہ

کر کے تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔"(۹)

سادگی اور اصلیت کے بعد حالی نے "جوش" کی بات کی ہے۔ جوش سے ان کی مراد شعر میں بے ساختگی سے ہے جس سے یہ محسوس ہو شعر بے اختیار شاعر کی زبان سے نکل گیا ہے نہ کہ کوشش کر کے کہا گیا ہے اور جس شعر میں یہ خوبی ہو اس کی تاثیر میں کمی نہیں ہوگی۔

اگر چہ کلیم الدین احمد حالؔی کے نظریہ سادگی سے خاص متاثر نہیں ہیں لیکن انہیں حالؔی کا نظریہ جوش کافی پسند ہے۔ انہیں افسوس بھی ہے کہ شعراء حضرات حالؔی کے اس نکتے کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں پا ئے اور نہ عمل کر پائے۔

"حالؔی نے سچ کہا ہے کہ جوش سے مراد یہ نہیں کہ مضمون خواہ مخواہ نہایت زور دار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے ممکن ہے کہ الفاظ نرم وملائم اور دھیمے ہوں مگر ان میں غایت درجہ کا جوش چھپا ہو۔ کاش اردو شعراء اس جملے کی اہمیت کو سمجھیں۔"(۱۰)

سادگی اصلیت اور جوش کے علاوہ مولانا حالؔی نے شعر کے لئے قافیہ اور وزن کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ عبدالحق حالؔی کے وزن اور قافیہ سے متعلق رقمطراز ہیں:

"وہ اس کے قائل نہیں کہ وزن سے شعر میں خوبی اور اس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے لیکن وہ وزن کو شعر کے لئے لازمی نہیں سمجھتے۔ اسی طرح وہ قافیہ کو بھی شعر کے لئے ضروری خیال نہیں کرتے۔"(۱۱)

متعدد ناقدین نے حالؔی کی تنقید نگاری کے متعلق اپنی آراء پیش کی ہیں بعض نے ان سے اتفاق کیا ہے تو بعض نے انحراف بھی کیا ہے۔ مضمون کی طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے زیادہ مثالیں پیش کرنا مشکل ہے۔اس لئے چند اقوال پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے۔

مقدمہ شعر وشاعری : مقدمہ شعر وشاعری پہلی بار۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کل ۳۸ ،ابواب پر مشتمل ہے۔ابتدائی ابواب میں شعر کی خوبیوں اور خامویں پر بحث کی گئی ہے جبکہ بقیہ ابواب میں شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔مولانا نے اپنی کتاب کا آغاز ''شعر کی مدح وزم'' کے عنوان سے کیا ہے۔جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ شعر کی مدح وزم آج بھی ہورہی ہے۔اور ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے انہوں نے برائیوں کے ساتھ ساتھ اچھائیوں کو بھی گنوایا ہے۔اور دلائل بھی پیش کی ہیں اور بعض محققین کی آراء سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے شعر کو''میجک لنیٹرن'' سے تشبیہ دی ہے۔

مولانا حالی کے نزدیک شاعری کی صلاحیت اور نعمت کو ذاتی محنت سے حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ کوئی بھی شخص شعر کی تاثیر سے انکارنہیں کرسکتا کیونکہ شعر اپنے سامع پر کوئی نہ کوئی تاثر ضرور چھوڑتا ہے پھر چاہے خوشی ہو دکھ ہو یا درد ہو۔شعر کی پسندیدگی کے بارے میں کہتے ہیں کہ شعراء اپنے بیان کے سحر سے عوام کے دلوں پر راج کرتے نظر آتے ہیں اور تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے۔یہاں تک کے شاعر کے عیب یعنی دنیا کو پسند ہوتے ہیں اس کی بانسبت ''بائرن'' کی ایک مثال جو حالؔی

نے پیش کی ہے یوں ہے:

> ''لوگ اس کی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے اوراس کی نشانیاں اور یادگاریں سینت سینت کر رکھتے تھے اس کے اشعار حفظ یاد کرتے تھے او رویسے ہی اشعار کہنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ خودبھی ویسے ہی دکھائی دینے لگیں۔ اکثر تو آئینہ سامنے رکھ کر مشق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر ویسی ہی شکن ڈال لیں جیسی کے لارڈ بائرن کی بعض تصویروں میں پائی جاتی ہے۔بعضوں نے اس کی ریس میں گلو بندھ باندھنا چھوڑ دیا تھا۔''(۱۲)

حالؔی کے خیال کے مطابق سیاسی مشکلات میں بھی شعر سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں اپنے اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایتھنز کی مثال دی ہے ،جس نے اپنی شکست کے بعد اپنے اشعار سے لوگوں کو یقین دلا کر ریاست کو آزاد کروایا تھا۔ حالؔی نے بڑی خوبصورتی سے ایشیائی اور مشرقی شعراء کے کلام کی تاثیر کا ذکر بھی کیا ہے۔جس میں اعشی جاہلیت کے شعراء رودکی اور عمر خیام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے اس بات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے کہ شاعری وہ ہے جو ناشائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے اور اگر شعراء شاعری کی بنیاد فضول باتوں اور اصلیت سے بڑھ کر نہ رکھیں تو پڑھنے والے کے دل پر ایک تاثر قائم کرنا شاعری کی فطرت میں شامل ہے۔انہوں

نے بعض محققین کی آراء سے ثابت کیا ہے کہ سماج کا اثر شعر پر برابر ہوتا ہے جب تک انسان کی علم سے واقفیت محدود ہوتی ہے شعر کی ترقی تب تک ہی ہوسکتی ہے کیوں کہ علم کے ترقی کرنے سے اورقاری میں شعر کے متعلق جانچ پرکھ کرنے کی عادت سے تخیل میں کمی ہوجاتی ہے اورشعر کی بنیاد بھی تخیل پر ہوتی ہے۔

حالؔی کے خیال میں شاعری تعلق اخلاق سے ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اگر چہ شعراء اخلاقی تعلیم کی تربیت نہیں کر پاتے لیکن انصاف کے ترازو میں اگر شعر کو تولا جائے تو بڑی حد تک اخلاقی درس دینے میں مددگار ہوتا ہے انہوں نے شعر کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یورپ کے ایک محقق کے خیالات کو بطور مثال پیش کیا ہے۔جس کے مطابق دنیا کے کاموں میں معروضیت کی وجہ سے دل سے جو جذبات واحساسات ختم ہوجاتے ہیں۔روزگار کی تلاش اور مشکلات کا سامنا کرتے کرتے انسان جب تھک جاتا ہے تو اس سے فرار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ شعر ہے جو اس وقت مرہم کا کام کرتا ہے۔کیونکہ ہر قوم اپنی عقل وفہم کے مطابق شاعری سے اخلاقی درس لے سکتی ہے اور ایک کامیاب قوم کے لئے یہ کافی ضروری ہے۔

حالؔی نے شاعری کو سوسائٹی کی تابع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دنیا کا دستور ہے جس طرح سماج کے خیالات عادتیں اور خواہشات بدلتے ہیں اسی طرح شعر کی حالت بھی خود بخود بدلتی رہتی ہے۔جھوٹ خوش آمد اور انعام کا شوق درباروں کی واہ واہی آہستہ آہستہ ایماندار انسان کی نیت میں خلل پیدا کر دیتے ہیں اسی طرح بہت سے شاعر اصلی شعراء کی

نقل کرتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ شعرا نے سماج کی ضرورت کے مطابق شعر لکھے ہوں جو قومی اخلاقی اصلاح کے بجائے اس کو بگاڑنے کا ایک آلہ بن جاتے ہیں۔

حالؔی نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں یعنی صاحب ابن عباد کے زمانے میں شعر سے متعلق فلسفیوں اور محققین کی رائے کیسی تھی اس کے علاوہ اس مقدمہ میں انہوں نے کثرت سے مسلم شعراء کا کا ذکر کیا ہے اس حوالے سے حالؔی نے یورپ کے ایک مورخ کی رائے بھی پیش کی ہے جو عربی کے شعراء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''صرف عرب کی قوم میں اتنے شاعر ہوئے ہیں کہ تمام جہاں کی قوموں کے شاعر شمار میں ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔'' (۱۳)

اس کثرت کی حالی وجہ بتاتے ہیں ایک مدح وستائش پر ملنے والے انعام کی لالچ دوسری قسم کے قابل اور نا قابل اشعار پر قارئین کی طرف سے ملنے والی واہ واہی ، حالی نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ بڑی شاعری سماج اور زبان وادب کو زیاں پہنچاتی ہے۔موضوعات کے محدود ہونے اور شاعری کے بگڑنے سے لٹریچر زبان اور سماج پر برے اثرات پڑتے ہیں۔

شاعری کی اصلاح کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں کہ جب شعر میں مبالغہ حد سے زیادہ داخل ہو جاتا ہے تو اس کی اصلاح کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ ان کے نزدیک وہی شخص شاعری کر سکتا ہے جو بغیر جھجک کے شعر کہہ سکتا ہو۔ ورنہ استعارات وتشبیہات کا بے حد ذخیرہ

تو معمولی مضمون کے لئے موجود ہے شعر کے لئے طبع کا موزوں ہونا حالؔی نہایت ضروری خیال کرتے ہیں ۔ حالؔی شعر کے لئے وزن کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں مگر نظم کے لئے اسے ضروری خیال کرتے ہیں ۔ وہ یوں لکھتے ہیں :

> ''انگریزی لفظ میں دو لفظ متعلق ہیں ایک ''پوئٹری'' اور دوسرا 'ورس' اس طرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں ایک ''شعر'' اور دوسرا ''نظم'' اور جس طرح ان کے ہاں وزن کی شرط پوئٹری کے لئے نہیں بلکہ ''ورس'' کے لئے ہے اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہئے ۔'' (۱۴)

ان کے خیال کے مطابق وزن شعر میں ضروری نہیں البتہ اگر ہو تو اس سے شعر کی خوبی اور اثر دو گنا ہو جاتا ہے ۔ انہوں نے قافیہ کے حوالے سے بھی بحث کی ہے ۔ انہوں نے قافیہ کو شعر کے لئے نہیں بلکہ نظم کے لئے ضروری قرار دیا ہے ۔ بے شک قافیہ شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے مگر اس کی پابندی سے شاعر اپنے خیالات کو قارئین کے سامنے نہیں رکھ پاتا کیونکہ پہلے اسے قافیہ ڈھونڈنا پڑتا ہے پھر اس کے مطابق ہی کوئی خیال ترتیب دینا پڑتا ہے ۔ شعر کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شعر کے متعلق ''مکالمے'' کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے ۔ شاعری ایک قسم کی نقالی ہے جو مصوری بت تراشی اور ناٹک کے لئے کلیساں ہے وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ انسان کا راز اور گہری کیفیت کا اندازہ ان تینوں

سے نہیں بلکہ شاعری سے ظاہر ہوتا ہے۔

مقدمہ میں حالی نے شاعری کے لئے تین شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے ۔ ان کے نزدیک سب سے پہلی اور لازمی چیز جو شاعر کو دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ ''تخیل'' ہے تخیل خیال کی پرواز کا نام ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کر کے زمانہ حال میں کھینچ لاتا ہے۔

شاعر کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہر واقع کو اس طریقے سے اور خوبصورتی سے بیان کرے کہ اس واقع کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تخیل کے بارے میں حالی کہتے ہیں کہ شاعر کے تخیل کی پرواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہئے کہ قارئین یا سامعین کا اس تک رسائی حاصل کرنا دشوار ہو جائے تخیل کے متعلق وہ یوں لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔''(۱۵)

جہاں تک تخیل کی بلند پروازی کی بات ہے کہ تو اس کی واضح مثالیں شعراء کے کلام سے دی جاسکتی ہیں اور عصر حاضر میں بھی شعراء کے کلام میں یہ خوبی پائی جاتی ہے زیادہ مثالوں سے گریز کرتے ہوئے ایک دو اشعار بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں تا کہ قاری کو اس بات

کااندازہ ہوسکے کہ عصر حاضر کے شعرا بھی کس حد تک حآلی کے بتائے ہوئے اس اصول کی پیروی کرر ہے ہیں۔

تیرے آنے کا دھوکا سا رہا
دیا سا رات بھر جلتا رہا
(ناصؔر کاظمی)

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا کوئی
(شکیب جلاؔلی)

اس کیلئے مولانا حالی نے مرزا غالبؔ اور خواجہ حافظ کے اشعار کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام فعال اچھا
(غالبؔ)

حالی کے نزدیک شاعری کی دوسری شرط مطالعہ کائنات ہے شاعر کو تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ پوری کائنات اور خاص طور پر انسانی فطرت کا بغور مطالعہ کرنا ضروری ہے بلکہ یوں کہنا موزوں ہوگا کہ ہر چھپے ہوئے پہلو کا مشاہدہ لازمی ہے۔اس نسبت سے حالی نے غالبؔ اور والٹر اسکاٹ کی شاعری کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہاں پر کچھ اشعار بطور مثال پیش کئے جارہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء نے کس خوبی سے کتنی اچھی طرح اپنی شاعری میں استفادہ کیا ہے یوں تو متعدد شعراء کے اشعار کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے مگر مضمون کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے عصر حاضر کے شعراء کے کلام سے ایک دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

ہوئے ظلم یہی ہے تو دیکھنا ایک دن
زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا
(ناصر کاظمی)

دیار دِل نہ رہا بزم دوستاں نہ رہی
اماں کی کوئی جگہ زیر آسماں نہ رہی
(شہریار)

حالی نے شاعری کی تیسری شرط ''تفحص الفاظ'' کو قرار دیا ہے ، یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے کے بعد الفاظ کی تلاش ضروری ہے کیوں کہ الفاظ ہی کے ذریعے شاعر اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے شاعر کے لئے لازمی ہے کہ وہ کسی شعر کو ترتیب دیتے وقت لفظوں کا انتخاب کر کے انہیں اس طرح ترتیب دے کر قاری کو اس کے مقصد تک رسائی حاصل ہو سکے اور شعر کی ترتیب ایک صبر آزما مرحلہ ہے جہاں شاعر کو صبر سے کام لینا پڑتا ہے ایک لفظ کے لئے ستر ستر کنویں جھانکنے پڑتے ہیں اور ہزاروں بار کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے

اس سے متعلق حالؔی نے روم کے مشہور شاعر ''ورجل'' کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ ''ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔''(۱۶)

ابن خلدون کی رائے کو دہراتے ہوئے حالؔی نے مضمون لکھنے کا دارومدار الفاظ پر بتایا ہے نہ کسی معنی کو جس میں انہوں نے لفظ کو پیالہ اور معنی کو پانی سے تشبیہ دی ہے غرض یہ کہ پانی تو ایک ہی ہوتا ہے صرف سونے مٹی کانچ یا چاندی کا پیالہ اس کی قدر و قیمت کو بڑھا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ''ابن خلدون'' کا جھکاؤ الفاظ کی طرف ہے جبکہ حالی کہتے ہیں کہ ہر پانی ایک جیسا نہیں ہوتا کڑوا اور گندا پانی صاف پانی کے برابر نہیں ہوسکتا۔اس لئے انہوں نے ابن خلدون سے اختلاف کیا ہے کیوں کہ حالؔی کا جھکاؤ زیادہ معنی کی طرف ہے۔

ابن رشیق کا ماننا ہے کہ شاعر کو اعلیٰ طبقہ کا کلام یاد ہونا چاہئے جو شاعر اپنے اساتذہ اور عالم و فاضل لوگوں کے کلام کو ذہن میں رکھے گا تو اسکے لئے شعر کہنا آسان ہوگا مگر حالؔی نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے ان کا ماننا ہے کہ جب تک اساتذہ کا کلام نظروں کے سامنے ہوتا ہے تب تک وہی اسلوب ذہن میں رہتا ہے۔جس سے شاعر میں نئے پیرائے میں شعر کہنے کی قابلیت نہیں رہتی اور فن شعر کو زیادہ ترقی نصیب نہیں ہوتی۔

پھر ملٹن نے سادگی جوش اور اصلیت کو شعر کی خوبی بتایا ہے۔سادگی سے ملٹن کی مراد یہ

ہے کہ شعر حقیقی واقعات پر مبنی ہو نہ کہ خواب وخیال پر اور پھر ''جوش'' کی بات آتی ہے تو شعر ایسا نہ ہو جو جوش کی حالت میں کہا گیا ہو بلکہ ایسا شعر ہو جو قاری کے دل میں ولولہ پیدا کرے۔ مگر مولانا حالی کے نزدیک ان تینوں خوبیوں میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ حالی کے نزدیک کلام میں سادگی کی یہ حد ہونی چاہئے کہ خیال اگر کتنا ہی بلند اور مشکل کیوں نہ ہو مگر پیچیدہ نہیں ہونا چاہئے اس کے الفاظ روزمرہ کے الفاظ ومحاورات کے قریب ہوں۔ حاؔلی کا یہ خیال بھی ہے کہ سوؔدا اور ذوؔق جیسے بڑے شاعر بھی ایسی سادگی کو نہ نبھا سکے۔مولانا کے مطابق شاعری کی دوسری خوبی اصلیت سے مراد یہ نہیں کہ شعر کا مضمون حقیقی واقعات پر ہی مبنی ہو بلکہ جو مضمون لکھا ہے اصل میں اسی ارادے سے لکھا ہو کہ قاری اس پر اعتبار کر سکے حالانکہ زیادہ تر اصلیت ضروری ہے مگر تھوڑی بہت کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔انہوں نے مبالغہ کے استعمال کو خلاف اصلیت قرار دیا ہے۔یعنی وہ جھوٹی تعریفیں جو کسی شخص میں ایک فیصد بھی موجود نہ ہوں بیان کی جارہی ہوں۔

شاعری کی تیسری خوبی ''جوش'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مضمون ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے جس سے ایسا معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے شعر نہیں لکھا بلکہ خود شعر نے شاعر کو لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔یعنی جوش سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ شعر نہایت ہی جوشیلے انداز میں بیان کیا جائے بلکہ نرم ملائم اور دھیمے ہوں جن میں آخر درجے کا جوش وولولہ ہو اس کے متعلق حالی یوں لکھتے ہیں:

''ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری
سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں۔''(۱۷)

زمانہ کی ترقی اور رفتار کے مطابق حالی نے شاعری کیلئے اپنی سمجھ بوجھ اور رائے کا مشورہ دیا ہے ۔ حالی کا ماننا ہے کہ جس حد تک ہو سکے جھوٹ اور مبالغہ سے گریز کرنا چاہئے ۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے حقیقت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے ۔ان کے مطابق جھوٹ اور مبالغہ کی حدود میں داخل ہونے سے شاعری کا زوال شروع ہو جاتا ہے ۔ سچ سے ان کی مراد یہ نہیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے بلکہ جھوٹ سے شعر کی تاثیر جاتی رہتی ہے ۔

نیچرل شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض حضرات نیچرل شاعری کو جو نیچر سے تعلق رکھتی ہو یا جس سے مسلمانوں یا کسی قوم کی ترقی اور زوال ہوا سے سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اس کے معنی ہیں جو شاعری لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے نیچرل ہو یعنی الفاظ روز مرہ کی عام بول چال کے اور ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی ہمیشہ قدیم شعراء کے ہاں نظر آتی ہے حالی نے دلائل کے طور پر میر حسنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، مومنؔ، داغؔ، غالبؔ، ناسخؔ اور میرؔ کے چند اشعار کو پیش کیا ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومنؔ)

حالی کوغزل سے بہت اعتراض ہیں غزل ان کے نزدیک عشق وعاشقی تک ہی محدود ہے ان کے مطابق جو انسان عشق نہیں کرتا وہ ایسے مضمون نہیں باندھ سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل میں شراب وساقی جام وصراحی کے الفاظ کا استعمال ایسا ہوتا ہے کہ قاری اس طرف مائل ہوجائے اور غزل میں ایک ہی مضمون کو الٹ پھیر کر کئی طریقوں سے پیش کیا جاتا ہے یعنی اس کے مضامین محدود ہیں اور ضائع اور بدائع کے اکثر استعمال سے غزل کو بچنا چاہئے کیوں کہ اس سے شعر کی تاثیر کم ہوتی ہے۔

حالی قصیدے کو سخت ناپسند کرتے ہیں کیوں اس میں حد سے بڑھ کر خوش آمد اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جس سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ حالی نے مرثیے کو کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے کیوں کہ اس میں انہیں اخلاق نظر آتا ہے اور اسے (مرثیہ) اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق قرار دیا ہے۔

آخر میں مثنوی پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ سب سے کارآمد صنف ہے کیوں فارسی اور اردو شاعری کی کسی بھی صنف میں مسلسل بیان کی قابلیت نہیں ہے اور مثنوی کا ایک شعر دوسرے شعر سے اس طرح جڑا ہوتا ہے جیسے کہ زنجیر ہو، اردو کی تمام عشقیہ مثنویات میں سے انہوں نے میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، اور مرزا شوقؔ کی مثنویوں کی سراہنا کی ہے۔

ماحصل یہ کہ حالؔی کی تنقید اسی طرح کا ایک تجربہ تھی جس طرح نئی نظم کے تجربے آرہے تھے کسی نئی صنف کو اخذ کرنے اور اسے اپنے تجربے کا حصہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی نہ

کسی سطح پر مقبول عام روایت سے چھٹکارا پانے اور کسی نئی روایت کی بنیاد رکھنے کے در پے ہیں۔ادب کی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا انقلابی عمل کہلاتا ہے حآلی ایک بہت بڑے نظم نگار تو نہیں بن سکے لیکن انہوں نے شاعری کا جو تصور دیا اور حقیقت نگار کی طرح جس طور پر متوجہ کیا اس میں بلا کی کشش اور طاقت تھی ، حآلی وہ پہلے نقاد تھے جنہوں نے پہلی بار تنقید کے فن کا تجربہ کیا اور اس میں اتنی قوت سمودی کہ پورے مشرقی منظر نامے اور تنقیدی منظر نامے کی کایا پلٹ گئی۔

حآلی اپنے انفراد میں ایک تحریک کے طور پر نمودار ہوئے تھے اور جو منصوبہ لے چلے تھے اور جس قوت استقلال اور استدلال کے ساتھ انہوں نے اپنا نظریہ پیش کیا اس کی دور رسی اور جزرسی کا دنیا کو قائل ہونا پڑا۔ان کے نزدیک شاعری ہمارے جذبوں اور ہماری روح کو اہتزاز بخشنے کا ذریعہ ہے جس کا سیدھا تعلق ان کی نظر میں اخلاق و کردار سے ہے۔

حواشی

(۱) گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات ومشرقی شعریات، صفحہ نمبر۱۰۲

(۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اردو تنقید پر ایک نظر، صفحہ نمبر۴۶

(۳) ڈاکٹر فخر السلام اعظمی ادب نما ناشر شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، یوپی، صفحہ نمبر۴۸۰

(۴) وارث علوی۔ حالی مقدمہ اور ہم۔ ناشر اردو ڈائٹرز گلڈ آباد، ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر۱۲

(۵) پروفیسر نور الحسن نقوی۔ فن تنقید نگاری، ۲۰۱۳، صفحہ نمبر۱۲۱

(۶) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، صفحہ ۱۰۷

(۷) اختر انصاری، حالی اور نیا تنقیدی شعور صفحہ نمبر۲۵

(۸) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر۔ صفحہ نمبر۴۶

(۹) ڈاکٹر وزیر آغا۔ تنقید اور جدید اردو تنقید، صفحہ نمبر۱۶۷

(۱۰) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر۔ صفحہ نمبر۴۶

(۱۱) مولوی عبدالحق افکار حالی۔ صفحہ نمبر۱۰۲

(۱۲) حالی۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ ناشر بک ٹاک لاہور، ۲۰۰۸ء، صفحہ نمبر۸

(۱۳) مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ نمبر۲۰

(۱۴) ایضاً صفحہ نمبر ۳۰

(۱۵) ایضاً، صفحہ نمبر ۳۷

(۱۶) ایضاً صفحہ نمبر ۴۵

(۱۷) ایضاً صفحہ نمبر ۶۰

ج۔ تقی عابدی اور تنقیدِ حالؔی

تقی عابدی اُردو زبان کے اوّل درجہ کے تنقید نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اُنہوں نے اکثر ادیبوں پر تحقیق کی ہے اور اُن کی تصانیف پر نہایت عمدہ تنقید بھی کی ہے ۔ جہاں تک مولانا حالی کا تعلق ہے، تقی عابدی نے ان کے ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں ۔جن میں کلیاتِ حالی، مسدّس حالی، حالی فہمی، حالی کی نظمیں، حالؔی کی غزلیں، قطعاتِ حالی، رباعیات حالؔی، حالؔی کے شخصی مرثیے، قصائد حالؔی، بچّوں کے حالؔی، حالؔی کی نعتیہ شاعری اور دیوانِ حالؔی فارسی شامل ہیں۔ بہر حال موجودہ مضمون میں اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے میں یہاں محض تین کتابوں یعنی حالی فہمی، مسدّس حالؔی اور کلیاتِ حالؔی کے حوالے سے بات کروں گی اور بحثیت حالی کے ایک معتبر نقاد کہ تقی عابدی کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کروں گی۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کی دو کتابیں '' حالؔی فہمی'' اور '' مسدس حالؔی'' جہلم بُک کارنر نامی پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی ہیں '' مسدس حالؔی'' ۲۰۱۵ء میں اور '' حالؔی فہمی'' ۲۰۱۶ء میں۔جبکہ تیسری کتاب '' کلیاتِ حالؔی'' ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی نے دیدہ زیب کاغذ پر شائع کی ہے۔تقی عابدی نے یہ تینوں کتابیں مولانا حالؔی کی صد سالہ برسی کے تعلق سے شائع کرائی ہیں۔ ذیل میں راقمہ نے ان تینوں کتابوں پر ترتیب مضامین

کے حساب سے نظر ڈالنے کیک وشش کی ہے۔ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے اس کا اندازہ قاری حضرات ہی لگا سکیں گے۔

(۱) حالؔی فہمی

کتاب کے شروع میں مصنف نے اپنا تفصیلی تعارف لکھا ہے جس میں تقی عابدی اپنا نام سیّد حسن عابدی اور ادبی نام تقی عابدی بتاتے ہیں۔ تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۵۲ء اور مقام پیدائش دہلی (انڈیا) تحریر کیا گیا ہے۔ ان کا پیشہ طبابت اور ذوق شاعری نیز ادبی تحقیق وتنقید ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے علاوہ ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا میں بھی قیام فرماتے ہیں۔ چار بچوں کے باپ اور پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'اقبال کے عرفانی زاویے، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، روشِ انقلاب، عروسِ سخن، ادبی معجزہ، رُباعیاتِ دبیر، دیوانِ غالب فارسی، فیضؔ فہمی، رباعیاتِ انیؔس، کلیاتِ حالؔی، مسدس حالؔی، حالؔی کی غزلیں، حالؔی کی نعتیہ شاعری، نیز حالی فہمی' بھی شامل ہیں۔

تقی عابدی مذید لکھتے ہیں کہ فی الحال وہ 'تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانی لا فانی، تجزیہ رباعیاتِ فراق گورکھپوری، رباعیاتِ بیدل نیز باقیاتِ فیضؔ' سمیت کئی تالیفات پر کام کر رہے ہیں۔

کتاب 'حالی فہمی' کے صفحہ نمبر [۵] پر اس کی فہرستِ عنوانات دی گئی ہے جس میں مضامین کی تعداد کافی طویل ہے اور ہر مضمون مولانا حالؔی کی ادبی زندگی کے کسی خاص پہلو کی

نشاندہی کرتا ہے۔ صفحہ نمبر [۸] پر مصوّر آفتاب ظفر کے ہاتھوں بنائی گئی حالؔی کی تصویر اور صفحہ [۹] پر حالؔی کی ایک تصویر کے نیچے کیپشن میں ان کے نام کے ساتھ دورِ حیاتی ۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۴ء لکھا گیا ہے۔ صفحہ نمبر [۱۰] پر مولانا حالؔی کی ایک تحریر کا عکس اور صفحہ نمبر [۱۱] پر ڈپٹی نظیر، مولانا شبلی نعمانی و دیگراں کے ساتھ حالؔی کی ایک تصویر دی گئی ہے۔ بارہویں اور تیرہویں صفحہ پر مولانا حالی کے نام سر سیّد کے ایک مکتوب کا عکس چھاپا گیا ہے جبکہ صفحہ نمبر ۱۴ اور ۱۵ پر اُسی مکتوب کو خوش خطی میں لکھا گیا ہے۔ یہ خط سر سیّد نے [۱۰] جون ۱۸۷۹ء میں شملہ سے حالی کو بھیجا تھا جس میں مسدّس حالؔی کی وصولی پر شکریہ ادا کیا گیا ہے، ساتھ ہی کتاب کو پڑھ لینے کے بعد اس پر مختصر مگر ماہرانہ تبصرہ بھی کیا ہے۔

کتاب کے صفحہ [۱۶] پر شجرہ مولانا حالؔی درج ہے جس میں حالؔی کے خاندان کے کئی چشم و چراغوں کے نام ترتیب سے درج ہیں۔ شجرہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان نے ایسے کئی گوہر پیدا کئے جنھوں نے اُردو زبان وادب کی ترقّی کے لئے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان میں خواجہ غلام السّیدین [مصنّف آندھی میں چراغ]، صالحہ عابد حسین [مصنفہ یادگار حالؔی]، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید، اور خواجہ سجاد حسین کے نواسے خواجہ احمد عباس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

'حالی فہمی' کے صفحہ نمبر [۱۷ تا ۲۴] پر خواجہ الطاف حسین حالؔی کے ہمعصر ادیبوں و شاعروں کی تصاویر قاری کی نظر کو کشش کرتی ہیں۔ ان میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، سر سیّد احمد خاں

، میر مہدی مجروح، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی، مرزا داغ دہلوی، امیر مینائی، حسرت موہانی، اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، نظامِ دکن میر محبوب علی پاشا، نیز بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ صفحہ [۲۵] سے شروع کر صفحہ نمبر [۳۴] تک چلتا ہے۔ اس میں مصنف ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مولانا حاؔلی کو اُردو شعر و ادب کا مجدد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حاؔلی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ تقی عابدی کے مطابق حاؔلی نے سرسیّد کی تحریک پر مسدّس لکھی تھی جو ایک شاہکار ثابت ہوا:

> ''یہ سچ ہے کہ حالی نے سرسید کی تحریک پر 'مسدّس' لکھا۔ مسدس کا سب سے پہلا ایڈیشن جون ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ جس کو پڑھ کر سرسید نے مکتوب لکھا تھا۔ ہم نے اس کو اس دستاویز کا جزو بنایا ہے۔ سرسید کا یہ کہنا کہ بارگاہِ ایزدی میں (عرض کروں گا کہ) خالی ہاتھ نہیں آیا بلکہ مسدّسِ حاؔلی لکھوا کر لایا ہوں، اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سرسید مسدّس حالی کے گرویدہ تھے۔''(۱)

حاؔلی کی تمام تر تعریف لکھنے کے باوجود تقی عابدی تنقید کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جہاں کہیں بھی خامی نظر آتی ہے وہ اس کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں۔ چنانچہ حالی پر چند ایک

موقعوں پر طوالت کا الزام لگاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''طوالت و تکرار حالی کی نظموں کا سب سے بڑا عیب ہے۔ مثلاً 'مناجات بیوہ' جو حالی کی بہترین نظم ہے، اس میں طوالت و تکرار نے اس (نظم) کو کم اثر کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعض حصّوں کو نکال بھی دیا جائے تو نظم پر کوئی منفی اثر نہیں پڑھ سکتا۔''(۲)

ڈاکٹر تقی عابدی بتاتے ہیں کہ انھوں نے کلیاتِ حالؔی کی ترتیب اور تدوین میں اصنافی ترتیب کو پسند کیا ہے مگر منظومات کے سنین کا تعین کرنے کی بھی حتی الوسع کوشش کی ہے تا کہ زمانی ترتیب بھی قائم رہ سکے۔ پیش لفظ کے آخر میں مصنف نے کتاب کے پبلشر جناب امر شاہد اور تحقیقی معاونین ڈاکٹر بیدار بخت اور کرنل انور احمد کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔

حالؔی کی کہانی حالؔی کی زبانی

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اپنی کتاب ''حالی فہمی'' کے آغاز میں چھ ابواب خود مولانا حالؔی مرحوم سے نقل کئے ہیں تا کہ قارئین کے سامنے حالؔی کی شخصیت خود بخود اُبھر کر سامنے آ جائے اور پھر اُنھیں حالؔی کو اُن سے روشناس کرانے میں بھی آسانی رہے۔ ایک ماہر مصنف کی یہی علامت ہے کہ وہ پہلے اپنے قاری کو [motivate] یعنی آمادہ کرتا ہے اور پھر اپنی بات اس کے سامنے رکھتا ہے۔ تقی عابدی کے بقول مولانا الطاف حسین حالی نے نواب عماد الملک بہادر مولوی حسین بلگرامی کی فرمائش پر اپنی سوانح عمری لکھی جسے انھوں نے موجودہ عنوان

کے تحت مِن وعن پیش کیا ہے۔ بہر حال ہم یہاں اس مضمون کا خلاصہ ہی بیان کرتے ہیں:

مولانا الطاف حسین حالی کی ولادت ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت میں ہوئی جو شاہ جہاں آباد (یعنی دہلی) سے ۵۳ میل دُور جانب شمال میں واقع ہے۔ اس قصبہ میں قریب سات سو سال سے قوم انصار کی ایک شاخ آباد چلی آ رہی ہے جس سے ان کا تعلق تھا۔ ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن دہلی کے تخت پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے چل کر ہندوستان آئے۔ ان کا سلسلہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے۔

خواجہ ملک علی کو بلبن کے دربار میں ملازمت مِل گئی اور پانی پت کی جاگیر بھی عنایت ہوئی۔ اُنہوں نے پانی پت میں انصار محلّہ آباد کیا۔ ان کے والد انصاری اور والدہ سیّدہ تھیں۔ ان کی والدہ ان کے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں جب کہ والد بھی محض [۹] برس کی عمر میں دُنیا سے گذر گئے۔ بڑے بھائی نے قرآن حفظ کرایا اس کے بعد ایک مقامی بزرگ سیّد جعفر علی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

حالی [۱۷] سال کی عمر میں گھر سے نکل کر دہلی چلے گئے اور وہاں عربی زبان کے علاوہ صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ قریب ڈیڑھ سال بعد یعنی ۱۸۵۵ء میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے اصرار پر پانی پت واپس لوٹ آئے۔ پھر ۱۸۵۶ء میں انھیں حصار میں کلکٹر کے

دفتر میں چھوٹی سی نوکری مِل گئی ۔ مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں سرکاری نظام درہم برہم ہو گیا اور حالی واپس پانی پت جا کر تقریباً چار سال تک بیروزگار رہے۔

دِلّی میں اپنے قیام کے دوران حالی صاحب مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ جب انھوں نے غالبؔ کو اپنی ایک دو نظمیں دکھائیں تو بولے:

"اگر چہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" (۳)

غدر کے بعد فکرِ معاش نے حالیؔ کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلندشہر سے شناسائی ہوگئی۔ اور پھر قریب آٹھ سال تک انھیں کے ساتھ رہے۔ اس دوران دونوں کو فنِ شاعری کے سمجھنے میں ایک دُوسرے سے مدد ملی ۔ نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد حالیؔ کو پنجاب گورنمنٹ بُک ڈپو لاہور میں ملازمت مِل گئی جہاں وہ انگریزی سے اُردو میں کئے گئے تراجم کی زبان درست کرتے تھے۔ اس طرح انھیں انگریزی زبان سے بھی دلچسپی ہوگئی۔ یہ کام وہ چار برس تک کرتے رہے اور پھر دہلی میں اینگلو عربک سکول میں مدرس بن گئے ۔ اس دوران سرسیّد مرحوم نے تحریک دلائی کہ حالیؔ مسلمان قوم کی موجودہ پستی و بدحالی کو منظوم بیان کریں۔ جس پر حالیؔ نے "مد و جزر اسلام" کے عنوان سے مسدّس لکھی۔

حالیؔ نے اُردو نثر میں بھی چند ایک کتابیں لکھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے غالبًا

۱۸۸۷ء میں اُنہوں نے پہلی کتاب ''تریاقِ مسموم'' کے نام سے لکھی ۔ایک کتاب ''مجالس النساء'' کے عنوان سے لکھی جو قصّہ کہانی کی طرز پر لکھی گئی تھی ۔اس کتاب پر انگریزی سرکار نے انھیں انعام بھی دیا اور یہ کتاب سرکاری مدارس میں بھی لاگو کی گئی ۔ دِلّی میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے'' حیاتِ سعدیؒ'' کے نام سے ایک کتاب شیخ سعدی شیرازی کی زندگی اور ادب سے متعلق لکھی جو بے حد مقبول ہوئی ۔اسی طرح مرزا غالبؔ مرحوم کی زندگی اور نظم ونثر کے بارے میں بھی اُنھوں نے'' یادگارِ غالب'' نیز سر سیّد مرحوم کی زندگی اور کارناموں پر'' حیاتِ جاوید'' کے نام سے کتابیں لکھیں ۔ اِن کے علاوہ کئی تدریسی کتابیں بھی لکھی اور متعدد مضامین اخبارات و رسالوں میں شائع کئے ۔اُردو کے علاوہ فارسی وعربی زبانوں میں بھی حالی کی کئی تصانیف مشہور ہوئیں ۔

دیباچہ دیوانِ حالؔی

'حالی فہمی' کا یہ دُوسرا مضمون ہے جو حالؔی نے اپنی کتاب'' دیوانِ حالیؔ'' کے لئے لکھا تھا اور ظاہر ہے یہ بھی خود حالؔی کے الفاظ میں ہی ہے ۔نفسِ مضمون اس طرح سے ہے :

ایک زمانہ تھا جب شاعری اور عشق بازی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا ۔اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے اظہار کا مناسب ذریعہ بھی ہیں ۔اور دونوں اقسام کے جذبات کا تعلق عمرِ شباب سے ہے ۔ چنانچہ یہ سلسلہ اُردو شاعری میں ایک مُدت تک چلتا رہا۔ پھر وہ دور بھی آیا کہ اہلِ نظر اپنی اس قدیم روایت پر نظرِ ثانی کرنے لگے اور روایتی شاعری کو

زندگی کی حقیقتوں سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقول حالؔی:

''غزل وتشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔'' (۴)

زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمّی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ وبلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے، کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضروری ہیں۔ چنانچہ حالؔی نے چند نظمیں قوم کی حالت پر بھی لکھیں۔

''دیوانِ حالی'' کے دیباچے میں آگے چل کر حالؔی لکھتے ہیں:

''کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعے کو اور نیز اُن نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں اور نہ طرزِ بیان ہی میں ایسی کوئی جدت، جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور وہ یہ سمجھ کر بے اختیار پکار اُٹھیں کہ [ھٰذاالذی رُزِقنامِن قبل] پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دُوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں۔'' (۵)

آگے چل کر حالؔی مذید لکھتے ہیں:

''ایک شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اُس کو اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ دکھاتا اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔''(۶)

حالی نے یہاں واضح کیا ہے کہ شاعر کے اندر فطرتِ انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خدا داد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر بھی پرہیز گاروں کی سوسائٹی کا ایسا نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی ویسا نہ کر سکتے ہوں۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیز گاروں اور پارساؤں کے حلقے سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رِند و اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربہ اُتار دیتا ہے کہ گویا انھیں میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے حالؔی نے انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیئر کا ذِکر کیا ہے جو خود تو درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اعلیٰ خاندان کی عورتوں کی مجالس کبھی نہ دیکھی تھیں مگر اس نے تصوّر کی آنکھ سے '' میکبتھ، جولیٹ، کیتھرائن'' وغیرہ خواتین کے

کرداروں کواس طرح پیش کیا ہے جیسے وہ خود اسی سماج سے تعلق رکھتا ہو۔اسی طرح ایرانی شاعر فردوسی اور ہندوستانی شاعر میر انیسؔ نے میدانِ جنگ کے صدیوں پرانے مناظر یوں بیان کئے ہیں گویا وہ خود موقع پر نظارہ کرر ہے ہوں۔

گویا حالیؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعر کو یہ الزام مت دو کہ'' وہ لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر مگر خود اپنے تیئں بھول بیٹھے ہیں۔'' بلکہ ان کی نسبت یوں کہنا چاہئے کہ ''وہ دوسروں کو وہ بات کہتے ہیں جس پر خود عمل پیرا نہیں ہوتے۔'' یعنی شاعر لوگ عمل کی ذمے داری لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

آگے چل کر حالیؔ شاعر کا فلسفی یا مورّخ سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فلسفی یا مورّخ کے پیغام میں اختلاف نقصان دہ ہے مگر شاعر کو اس سے مطلب نہیں۔ وہ تو اس منظر کو بیان کرتا ہے جسے وہ تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی فوٹو گرافر کی طرح کسی بھی چیز کے ہر پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے اگر چہ اس میں تضادات ہی پائے جاتے ہوں۔ شاعر لوگ کبھی کبھی خیر کو شر اور شر کو خیر کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً عقل، علم، دولت اور عزت عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں، مگر شعراء ان کی جا بجا مذمت بھی کرتے ہیں ۔اس کے برعکس دیوانگی، نادانگی، رندی اور ذِلت عموماً مذموم و مردود خیال کی جاتی ہیں مگر شاعر ان کی مداح سرائی کر دیتا ہے۔ گویا وہ ایک نادان بچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہسنے لگتا ہے مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے اور نہ ہسنے کا۔ لہٰذا

شاعر کو سمجھنے کے لئے اُسی جیسا دِل قاری کے پہلو میں ہونا ضروری ہے ۔ ....

[مفہوم]

آخر میں حاؔلی نے اس بات پر مایوسی ظاہر کی ہے کہ موجودہ سماج شاعری کو مدرسوں میں لے آیا ہے حالانکہ وہاں پر شاعری کا ذوق ہی نہیں پایا جاتا۔ اُدھر موجودہ سوسائٹی شاعروں کو عقل و دانائی سے خالی سمجھتی ہے۔ ایسے میں شاعری کا مستقبل کیا ہوگا، اس کے بارے میں حتمی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔

ضمیمہ اردو کلیات نظم حاؔلی

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے ''حالی فہمی'' کے صفحہ نمبر ۵٦ پر ''دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات نظم حاؔلی'' کو تیسرا مضمون بنایا ہے۔ یہ بھی حالی کے اپنے الفاظ میں ہے۔ یہاں ہم اس مضمون کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں :

> حالی کے مطابق تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک ہندوستان کے مسلمان بالطبع فارسی زبان میں نظم و نثر لکھنے اور خط و کتابت کرنے کے عادی تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت لوگ اسلاف کے طریقے پر چلنا پسند کرتے تھے ۔ دوسری طرف اُردو زبان ان کی مادری زبان ہوتے ہوئے بھی محض شعر وسخن تک محدود تھی ۔ رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب سے یہ

میلان کم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ پہلے عربی اور پھر فارسی زبان میں بھی
طبع آزمائی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور شاعر و ادیب اُردو کی طرف مائل ہوتے
گئے۔............[مفہوم]

مولانا حالؔی کو جب ۱۸۶۳ء میں جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے نواب محمد مصطفیٰ خاں کی مجلس میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اُن دنوں انہوں نے فارسی و عربی میں شاعری کی۔ مگر آہستہ آہستہ ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ اب عربی فارسی کا کوئی خواہاں نہیں کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے پرانی قدروں کو پامال کر دیا تھا اور اب ایک نیا سماج وجود میں آ رہا تھا۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچی کہ حالؔی کو عربی و فارسی کے اپنے قلمی مسودے (جو انہوں نے بہت پہلے لکھ رکھے تھے) بیکار لگنے لگے۔ بقول حالؔی:؎

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات چونکہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے اور وہ قومی خصوصیات کی یادگار بھی تھے، لہٰذا ان کو ضائع کرنا گوارہ نہ ہوا۔ چنانچہ یہ مسوّدات حالؔی نے اپنے ''کلیاتِ نظم'' اُردو کے آخر میں بہ طور ضمیمے کے ملحق کر دئے۔

مسدّس مدوجزرِ اسلام

حالی کی مسدس ''مدوجزر اسلام'' کا دیباچہ یہاں صفحہ [۶۰] پر نقل کر کے ڈاکٹر تقی

عابدی نے ''حالی فہمی'' کو مزید دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے تا کہ قاری کو پہلے خود مولانا حالیؔ مرحوم کی تحریروں سے روشناس کرایا جائے اور پھر خود ان کے متعلق اپنی رائے رکھی جائے۔ ہم یہاں اس دیباچے کا بھی مختصر جائزہ لیں گے:

بچپن کا زمانہ ایک طرح سے بادشاہی کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اس دور میں انسان غم اور فکر کی باتوں سے نا آشنا ہوتا ہے۔ مولانا حالیؔ کا بچپن بھی ایسا ہی تھا۔ پھر جب جوانی آئی تو صورتِ حال مختلف تھی۔ خود لکھتے ہیں کہ:

> ''باغ جوانی کی بہار اگر چہ قابلِ دید تھی، مگر دُنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ خود آرائی کا خیال آیا نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اُٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا:

> پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
> اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (۷)

بچپن سے ہی حالی کا رُجحان شاعری کی طرف تھا، لہٰذا کچھ نہ کچھ لکھنے میں لگے رہتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے غزل، نظم اور قصیدہ میں خوب طبع آزمائی کی۔ مگر لکھتے ہیں کہ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے محض اپنا اعمال نامہ خراب کیا ہے۔ کیوں کہ شاعری کے جذبے سے متاثر ہو کر دِل کی بھڑاس تو نکالی مگر تعلّی سے کام لیتے ہوئے بڑے کو بہت بڑا اور چھوٹے کو بہت چھوٹا کہہ دیا۔ اور کہیں تو جھوٹ اور سچ کی تمیز تک نہ رہی:

"غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔" (۸)

حالؔی کے مطابق بیس برس کی عمر سے انہوں نے لکھنا شروع کیا اور چالیس سال تک پہنچتے پہنچتے عربی، فارسی نیز اُردو زبانوں میں بہت کچھ لکھا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اسی دوران ان کی مُلاقات سر سید احمد خاں صاحب سے ہوئی جنہوں نے حالؔی سے فرمائش کی کہ وہ مسلمانوں کی بد حالی کے بارے میں ایک کتاب لکھیں۔ سر سیّد کی باتوں میں وہ اثر تھا کہ حالؔی ان کی فرمائش ٹال نہ سکے۔ چنانچہ حالی خود فرماتے ہیں:

"ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دِل سے ہی نکلی تھی دِل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑہی میں ایک اُبال آیا۔ افسردہ دِل، بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنہی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈالی۔"(۹)

دیباچے کے آخری پیراگراف میں حالی نے مسدس کا تعارف بھی خوبصورت طریقے سے کرایا ہے جو اُنہی کے لفظوں میں بیان کرنا مناسب رہے گا:

"اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام

اسلام میں جاہلیت رکھا گیا ہے۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمی ﷺ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہوجانا، اور اس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دُنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزّل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئنہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خدو خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔''(۱۰)

المختصر مولانا حاؔلی نے اس خوبصورت دیباچے میں نہ صرف اپنی مسدّس ''مدوجذر اسلام'' کا دلچسپ تعارف کرایا ہے بلکہ قاری کو آمادہ بھی کر دیا ہے کہ وہ اسے ضرور پڑھے۔ یہ دیباچہ حاؔلی کی نثر نویسی کا مُنہ بولتا ثبوت تو ہے ہی، ساتھ ہی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ادب شناسی کا مظہر بھی ہے۔

متعلق بہ ضمیمہ مسدّس مدوجزر اسلام

حاؔلی نے ''مسدس مدوجذر اسلام'' ۱۲۹۶ھ بمطابق ۱۸۷۹ء میں شائع کی تھی جسے عوام و خواص میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں کی مانگ کے سبب اس کے سات ایڈیشن شائع کئے گئے۔ قریب سات سال بعد ۱۸۸۶ء میں جب اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن جاری کیا گیا تو اس میں حاؔلی نے مزید ایک دیباچہ جوڑ دیا جسے تقی عابدی نے زیرِ تبصرہ کتاب

''حالی فہمی'' میں نقل کیا ہے۔ اس مضمون میں حالی مرحوم نے کتاب کی مقبولیت کے لئے قارئین کی تعریف کی ہے اور اُمید بھی ظاہر کی ہے کہ قوم میں بیداری پیدا کرنے کا مصنف کا مقصد ضرور پورا ہوگا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

''گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہئے۔''(۱۱)

دیباچہ مجموعہ نظم حالؔی

مولانا حالؔی کا خود لکھا ہوا یہ ایک اور دیباچہ ہے جو ''مجموعہ نظم حالؔی'' کے لئے لکھا گیا۔ ''حالؔی فہمی'' کے اندر یہ صفحہ نمبر [۷۰] پر نقل ہے۔ اس کے شروع میں حالی لکھتے ہیں کہ ۱۸۷۴ء میں جب کہ وہ پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں کام کرتے تھے تب مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک پر 'انجمن پنجاب' نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جس کی مجلس ہر مہینے منعقد ہوتی تھی۔ اس میں یہ عزم ظاہر کیا گیا کہ اُردو شاعری کو خیالی اور عشقیہ روش سے بدل کر حقیقت کی طرف لایا جائے نیز اس کا دامن بھی وسیع کیا جائے۔ اس سے پہلے ۱۸۷۲ء میں سرسید احمد خاں نے پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تھا جس کا مقصد بھی اُردو ادب میں انقلاب لانا تھا۔ اور یہ تحریک کافی کامیاب ثابت ہوئی۔ البتہ مولانا حالؔی اس مجلس میں محض چار دفعہ شامل ہو سکے کیوں کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے دِلی منتقل ہو چکے تھے۔

بہر حال مولانا حالی طبیعتاً بھی خیالی یا عشقیہ شاعری کے خلاف تھے اور شاعری کو سماج سُدھار کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے ۔لہٰذا نئی تحریک نے ان کے مزاج کو اور جلا بخشی۔ چنانچہ حاؔلی نے ’’مجموعہ نظم حاؔلی‘‘ میں ایک نئی طرز شامل کرتے ہوئے چار مثنویاں درج کیں یعنی برکھا رُت ،نشاطِ اُمید ،حُبِ وطن اور مناظرہ رحم وانصاف۔ یہ چاروں مثنویاں مذکورہ مشاعرہ میں پڑھی گئیں۔ باقی تمام نظمیں الگ موقعوں پر لکھی گئیں۔اس دیباچے میں ایک اہم بات جو حاؔلی نے قارئین کے سامنے رکھی ہے وہ یہ ہے کہ حالی اگرچہ انگریزی ادب سے واقف نہیں مگر اس میں جدت پسندی کے رُجحان کی کچھ خبر ضرور رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تیئں اُردو زبان میں ’’نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔‘‘ وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ نسل اس بنیاد پر ایک رفیع الشان عمارت تعمیر کرے۔

اب تک ڈاکٹر تقی عابدی نے خود حاؔلی کے چند اہم مقدمات کو بطور نمونہ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔اس سے آگے تقی عابدی کے اپنے مضامین دئے گئے ہیں جو کہ ’’حالی فہمی ‘‘ کا ایک اہم کارنامہ ہیں۔

حاؔلی کی حیات اور شخصیت

اس مضمون میں ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے حاؔلی مرحوم کا تفصیلی تعارف لکھا ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کررہی ہوں۔

حالؔی کا پورا نام خواجہ الطاف حسین ہے۔ وہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش پانی پت ضلع کرنال ہے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش اس وقت کی انگریزی سرکار کے پرمٹ محکمہ میں ملازم تھے۔ ان کی وفات محض چالیس سال کی عمر میں ہوئی جب حالی صرف [۹] برس کے تھے۔ حالؔی کی والدہ ان کی ولادت کے فوراً بعد ہی دماغی توازن کھوبیٹھی تھیں۔ تب ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

حالؔی کے دادا خواجہ بوعلی بخش اور پردادا خواجہ محمد بخش تھے جن کا شجرہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جاملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جدِ امجد خواجہ ملک علی ہرات کے رہنے والے تھے اورغیاث الدین بلبن بادشاہ کے دور میں ہندوستان آئے تھے۔ بلبن نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہوکر ملازمت دی اور پانی پت میں جاگیر بھی عطا کی۔ لہٰذا یہ خاندان ۱۲۷۶ھ سے پانی پت میں مقیم ہوگیا۔

حالؔی کی والدہ سیّد خاندان سے تھیں جونزدیک ہی پانی پت میں آباد تھا۔ حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجیہ النساء تھیں۔ حالؔی سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے فوراً بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا لہٰذا ان کی پرورش والد اور بھائی بہنوں نے کی۔ پھر جب [۹] سال کی عمر میں والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تو بھائی اور بہنوں نے ان کی دیکھ بھال کی۔

گھر کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے حالؔی کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا، البتہ

انھیں گھر پر ہی قرآن پاک کی تعلیم دی گئی ۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں انھیں مقامی عالم حافظ ممتاز حسین کے پاس دینی تعلیم کے لئے بھیجا گیا جہاں اُنھوں نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔ بعد ازاں انھوں نے سید جعفر علی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور حاجی ابراہیم انصاری سے عربی صرف ونحو بھی پڑھی ۔ بعد میں دِلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور صرف ،نحو، منطق اور حدیث کا درس لیا۔ مگر ڈیڑھ سال کے بعد ہی واپس پانی پت جانا پڑا۔ وہاں گھر پر ہی جو کچھ پڑھنے کو مِلا پڑھ لیا، یا کسی سے تھوڑا بہت تلمذ کرلیا۔

بھائی بہنوں کے اصرار پر حالؔی نے [۱۷] برس کی عمر میں شادی کر لی ۔ اب بظاہر انھیں کوئی روزگار تلاش کرنا تھا تا کہ گھر کا خرچہ چل سکے ۔ ۱۸۵۶ء میں انھیں ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں معمولی سی ملازمت مِل گئی ۔ مگر ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت سے پیدا شدا حالات کے پیشِ نظر حالؔی کو واپس گھر آنا پڑا۔ اب وہ یہاں چار برس تک بیروزگار رہے البتہ اپنے شوق سے کچھ نہ کچھ تعلیم ضرور حاصل کی ۔ پھر ۱۸۶۱ء میں جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے نواب مصطفیٰ خاں کے پاس ملازمت مِل گئی جو آٹھ سال تک چلی اور بعد ازاں گورنمنٹ پریس لاہور میں ملازم ہوئے ۔

حالی کی بیوی اسلام النساء مزاج کی سخت مگر ذِمے دار خاتون تھیں ۔ وہ گھر کی ذمیداریوں میں مشغول رہتی تھیں مگر حالی کی مصروفیات میں ہرگز دخل نہیں دیتی تھیں ۔ حالؔی کو جو وظیفہ ملتا

تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے حوالے کر دیتے تھے اور خود گھر کی ذمے داریوں سے الگ ہو کر علم و ادب کی خدمت میں لگے رہتے تھے ۔ بی بی اسلام النسا ۱۹۰۰ء میں وفات پا گئیں۔ مولانا حالی کو اس کا سخت صدمہ ہوا جس کا اظہار ان کی مختلف تحریروں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

حالی کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے، مگر دو لڑکے اور ایک لڑکی ہی زندہ رہے:۔

۱- مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام الدین اور معروف سماجی کارکن صالحہ عابد حسین کا تعلق حالی کے خاندان سے ہی ہے۔

اس مضمون کے اوّل حصّے میں تقی عابدی نے خواجہ صاحب کا تعارف پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کو آسانی رہے۔ ساتھ ہی عام قارئین کی معلومات میں بھی اس سے بہت اضافہ ہوتا ہے۔ مضمون کے اگلے حصے میں حاؔلی کی خاندانی و سماجی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالی کا اپنے پوتوں اور نواسوں کی تربیت اور تعلیم پر پورا پورا دھیان دینا انھیں عام ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے جو عموماً اپنے ہی شغل میں مصروف رہتے ہیں۔ بچوں سے پیار اور شفقت گویا حاؔلی کی فطرت میں شامل تھا۔ خود اپنے ہی نہیں دوسروں کے بچوں سے بھی وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس سلسلے میں تقی عابدی ایک واقع لکھتے ہیں کہ:

”پانی پت میں ایک دفعہ حاؔلی تانگے میں بیٹھے گذر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا گندی نالی میں گرا پڑا اچھلا رہا ہے۔ آس پاس جمع

لوگ اسے دیکھ "رام رام" کر رہے ہیں مگر کوئی اسے نالی سے باہر نہیں نکال رہا۔ مولانا نے دیکھتے ہی تانگہ رکوایا، جا کر بچّے کو نکالا، اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے نکالے اور پتہ پوچھ کر ماں باپ کے پاس چھوڑ آئے۔" (۱۲)

حالی کے اخلاق و کردار کا ذِکر کرتے ہوئے تقی عابدی نے انیسؔ کا یہ شعر لکھا ہے:

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے (۱۳)

اس کے بعد اپنی رائے میں خواجہ صاحب کو بچوں کا دوست، دردمندوں کا ہمدرد اور حاجت مندوں کا سہارا قرار دینے کے ساتھ ہی ذاتی مشکلات میں قناعت پسند بھی حالی کو قرار دیا ہے پھر خواجہ کی خوبیوں کے متعلق دوسرے اکابرین کی آراء بھی پیش کرتے ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ غلام الحسنین، مولوی عبدالحق، نواب عمادالملک وغیرہ شامل ہیں۔

"بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالؔی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذِکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے دردِ دِل۔ یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں۔ در اصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔" (۱۴)

آگے چل کر تقی عابدی نے حالؔی کی انسان دوستی کا ذکر کرنے کے بعد ان کے مذہب سے متعلق بھی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ حالی عقیدے کے لحاظ سے حنفی سنّی مسلمان تھے مگر

ان کی بیگم شیعہ عقیدہ کی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں میں کبھی اختلاف پیش نہیں آیا۔ حالی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار اُنہوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے اور رسولِ پاک سے انکی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تو حالؔی مرحوم کی نعتیں ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے حالؔی کی قناعت پسندی، مسافرت، شمس العلماء کا خطاب اور خوراک و پوشاک سے متعلق بھی کافی تفصیل لکھی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کا عکس اُبھر کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

حالؔی کی شاعری کے آغاز سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں کہ "ہمیں تحقیق وتلاش کے باوجود یہ صحیح طور معلوم نہ ہوسکا کہ حالؔی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے۔"

وہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۱ء میں جب حالی دوسری بار [یعنی ملازمت کی خاطر] دِلّی آئے تو شعر وسخن کی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ گویا وہ بچپن سے شاعری کرنے لگے تھے تو اب ان کی شہرت ہونے لگی تھی۔ ورنہ نو آموز شعرا کو تو اتنی بڑی محافل میں کوئی کم ہی بُلا تا ہے۔ حالؔی نے خود مرزا غالبؔ سے مُلا قاتوں اور کلام دکھانے کا ذِکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۲۳،۲۴ سال کی عمر میں شاعری کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر تقی کے مطابق حالؔی کا شعر پڑھنے کا انداز فطری تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔

مضمون کے آخر میں مصنف نے حاؔلی کی بیماری کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حاؔلی کو پان اور تمباکو کی عادت تھی جو ان کی بیماری کا باعث بنے۔تقریباً جواں عمری میں ہی انھیں بواسیر کی تکلیف ہوگئی تھی۔نزلہ، کھانسی اور دمہ کی تکلیف بھی اکثر رہتی تھی۔نظر کی کمزوری بھی ان کے کام میں رکاوٹ بنتی رہی مگر انہوں نے علاج معالجہ اور عینک کا استعمال کر کے اپنا کام جاری رکھا۔مگر سب سے زیادہ جس بیماری نے پریشان کیا وہ ضعفِ دماغ (dementia) تھی۔

آخر یکم جنوری ۱۹۱۵ء کی پہلی رات قریب ایک بجے حاؔلی نے اس دُنیا کو خیر باد کہا اور اسی روز ظہر کے وقت ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اِنااللہ و اِنا اِلیہ راجعون۔ان کی قبر بوعلی قلندر کی درگاہ میں بنائی گئی۔

اس مضمون پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کس قدر محنت کی ہوگی اس کا اندازہ ہمیں اُن اقتباسات سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے جا بجا لکھے ہیں۔ جہاں کہیں ضرورت پڑی ہے انہوں نے راوی سے اختلاف بھی ظاہر کیا ہے اور اپنی رائے بھی رقم کی ہے۔مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حاؔلی شناسی کے میدان میں تقی عابدی کی یہ کوشش اب تک کی سب سے بڑی کوشش ہے۔

حاؔلی کی روایتی شاعری کا تجزیہ

یہ مضمون ’’حالی فہمی‘‘ کے صفحہ نمبر ۱۱۶ سے شروع ہوتا ہے۔اس میں تقی عابدی نے حالی

کی شاعری کے حوالے سے دلچسپ انکشافات کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حالیؔ ایک نہایت صوفی منش انسان تھے اور فطری شاعر بھی تھے۔ مگر شروع شروع میں وقتی رواج سے متاثر ہو کر انھوں نے عشقیہ شاعری بھی کی جو سب کی سب ان کے خیال کی پرواز ہے۔ مگر جب حالیؔ نے نئی طرز کی شاعری شروع کی تو عوام نے اسے بے حد سراہا۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے علامہ شبلیؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں خواجہ صاحب نے ایک وفد کے ساتھ حیدرآباد کا دورہ کیا، تاکہ علی گڑھ کالج کے لئے امدادی رقم جمع کر سکیں۔ اس وقت تمام شعراء نے روایتی عشقیہ شاعری کی مگر خواجہ صاحب نے جب روایت کے برخلاف یہ غزل پڑھی: ؎

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ

ہر دِل پہ چھا رہا ہے رُعبِ جمال تیرا (۱۵)

تو جوشِ تحسین کی ایک نئی سرگرمی لوگوں میں اُبھر آئی اور ہر شعر کی تعریف کی گئی۔

نقی عابدی کا کہنا ہے کہ:

''حالیؔ نے غمِ دِل کو بیچ کر غمِ دوراں اور غمِ انساں خریدہ۔ نفس نے غیرت دلائی، حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا شرم کی بات ہے۔ لہٰذا روایتی شاعری سے افادیتی شاعری کی طرف رجحان منتقل ہوا:

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعراء میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی (۱۶)

آگے لکھتے ہیں:

''حالؔی ایک شاعر باعمل تھے۔ جو کہتے تھے وہ کرتے تھے یا کم ازکم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جدید اُردو شاعری اور اردو تنقید نگاری کے بنیاد گذار کی زندگی میں شعری تخلیقات اور فکری رجحانات میں انقلاب آئے۔ چنانچہ پہلے خود منقلب ہوئے، اپنے کو بدلا پھر دوسروں کو نصیحت اور تاکید کی۔'' (۱۷)

اس کے بعد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے حالؔی کے کئی چنندہ اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں، جنہیں یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ کہنا چاہئے کہ تقی عابدی کی اس مضمون کے حوالے سے تحقیق بے حد قابلِ تعریف ہے۔

کلامِ حالؔی میں خارجی الفاظ اور محاورے

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق خواجہ حالؔی کی تصنیفات میں بعض موقعوں پر انگریزی، پنجابی اور ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مگر ساتھ ہی حاشیے پر ان کے معنی بھی دئے گئے ہیں۔ مثلاً ''گڈ سبجیکٹ، کنزرویٹو، لبرل، لیول، ڈیم فول، کنگ ڈم، میڈم، نیٹو

......(انگریزی)

سیوا، نچنت، ......(ہندی)

اسی طرح محاورے اور ضرب المثل وغیرہ کا استعمال بھی بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے:

یاں گیا بلّی کے بھاگوں ٹوٹ اگر چھینکا کہیں
پڑ گئی پشتوں تلک واں فاقہ مستوں کی بناء

ایک انار اور اس کو تکتے سینکڑوں بیمار ہیں
لے گی کس کس کی خبر تو قوم غافل ہے اگر

طبل ظاہر کی نمائش کے نہ بجتے تھے وہاں
جو برستے تھے زیادہ نہ گرجتے تھے وہاں

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے (۱۸)

ڈاکٹر تقی عابدی کے بقول خواجہ حالؔی نے فارسی کے چھے سو سے زیادہ اشعار اور عربی کے سو سے زیادہ اشعار لکھے ہیں جن کو انہوں نے سلیس نثری ترجمے کے ساتھ دیوانِ حالؔی فارسی میں شائع کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے حالؔی کو ادبی دُنیا کے سامنے پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حاؔلی کے نظریات اور افکار کا مطالعہ:

اس مضمون میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا حاؔلی کو ادب کے میدان میں امام کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات درست ہے کہ وہ مزاج کے نرم، گوشہ نشیں اور نمود و نمائش سے پرہیز کرنے والے تھے۔ مگر اُردو ادب کو اُنہوں نے وہ شاہکار دئے جن کی دُوسروں کے ہاں مثال نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں حاؔلی کی مسدّس مدّ و جزر اسلام ،مقدمہ شعر و شاعری، تعلیمِ نسواں، ستی نیز بچپن کی شادی جیسی نظموں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ اُس دور میں ان موضوعات پر کسی دوسرے اُردو ادیب کے ہاں اصلاح معاشرہ کی ایسی تصنیفات کی مثالیں نہیں ملتیں۔

تقی عابدی کا کہنا ہے کہ حاؔلی کے اپنے الگ نکتہ ہائے نظر ہیں۔ جن کا انہوں نے اپنی تحاریر کے ذریعے بھی پرچار کیا۔ وہ اپنے موقف پر قائم رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے بہترین دوست سر سید احمد خاں سے بھی ان کے چند ایک نکات پر اختلافات رہتے تھے۔ جن میں طریقۂ تعلیم بھی شامل ہے۔ سر سیّد کا خیال تھا کہ عورتوں سے زیادہ مردوں کی تعلیم ضروری ہے اور انھیں اعلٰی تعلیم یعنی ڈگریاں دلائی جانی چاہئے تا کہ ان کی سوچ بلند ہو۔ مگر حاؔلی اسے کھوکھلا دعویٰ سمجھتے تھے کیوں کہ خالی ڈگریوں سے مالی حالت بہتر نہیں بن سکتی جس کی مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ تیکنیکی تعلیم کے حصول پر زور دیتے تھے۔ حاؔلی کہتے ہیں:

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن و صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصادی نہ جراحی نہ کحالی نہ عطاری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری ،،(۱۹)

ایک اور جگہ حاؔلی لکھتے ہیں:

’’ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی دوڑ بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کئے ہوئے طلباء کی طرح سرکاری نوکری کے لئے اِدھر اُدھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگرداں و پریشاں رہے۔‘‘(۲۰)

پھر کہتے ہیں:

گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاست سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کشت کاری کریں آئین فلاحت سیکھیں(۲۱)

حالی نے اپنے کلام میں برصغیر کی مختلف قوموں سے اتحاد کی دعوت دی۔ حاؔلی جانتے تھے کہ انگریز حکمرانوں اور ہندوستانی مسلمانوں میں فاصلے اور نفرت کی دیوار کھڑی ہو چکی ہے۔ مسلمان جو کبھی اس زمین پر حکمران تھے، اب محکوم، بے مقام اور بے نشان ہیں۔
سرسیّد کی تحریک نے مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک طرف مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں کے لئے نفرت دُور کرنے میں مصروف تھے تو دُوسری طرف انگریزوں کے مسلمانوں کے بارے میں خدشات مٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حاؔلی سرسید کی کاروائیوں سے باخبر تھے اور ان کی تائید کرتے تھے۔ چنانچہ ایک موضوعاتی نظم میں لکھتے ہیں:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دُنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں،، (۲۲)

حاؔلی نے اُمت کا درد بیان کرتے ہوئے صاف کہا ہے کہ اگر کسی کو اُمت کی فکر نہیں تو وہ دیندار نہیں ہو سکتا:

دین کا دعویٰ اور اُمت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

ان سے کہہ دو ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا
قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت ، یہی منصب ہے جس کے واسطے
آئے ہیں دُنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیاء ،،(۲۳)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے حالؔی مرحوم کے نظریات و افکار کو اجاگر کرنے کے لئے خوب مشقت کی ہے ۔ اس محنت کا ثمرہ یقیناً یہ ہوگا کہ حالؔی کا کلام قارئین کے لئے زیادہ قابلِ رسائی بھی ہوگا اور مزید قابلِ فہم بھی بنے گا۔

حالی بحیثیت ترقی پسند شاعر اور ترقی پسند نقاد

ڈاکٹر تقی عابدی نے غالباً ایک طبقے کے اس زن کو دُور کرنے کی کوشش میں اس مضمون کے آغاز میں خود ہی یہ سوال کیا ہے کہ ''کیا حالؔی انگریز پرست تھے؟'' پھر وہ اس معاملے کی پوری چھان بین کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اگر ترقی پسند ہونا انگریز پرستی ہے تو پھر ترقی پسند تحریک تو انیسویں صدی کے آغاز میں ہی شروع ہو چکی تھی ، یعنی حالؔی کے جنم سے بھی پہلے ۔ نظیر اکبر آبادی اور منیر شکوہ جیسے شعراء کے کلام میں حقوق بشر کی حفاظت ، غریبوں اور زحمت کشوں کی حمایت نیز ستمگر حکمرانوں سے نفرت کا اظہار وضاحت سے پایا جاتا ہے ۔ پھر غالبؔ نے سرسید کی مرتب کردہ کتاب '' آئینِ اکبری'' کے لئے جو تقریز کی خاطر ۳۷ اشعار پر مشتمل مثنوی لکھی تھی وہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں پسماندگی سے نجات کی تلقین

کی گئی تھی۔ سرسید ان دِنوں غالبؔ اوران کے ہم نواؤں سے متفق نہیں تھے اس لئے اُنہوں نے اس وقت وہ تقریض شائع نہیں کی۔ مگر واقع یہ ہے کہ اندر ہی اندر سرسید اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ آئندہ وقت میں وہ اس راستے پر چلے جو اس مثنوی میں بتایا گیا تھا۔ غالبؔ نے کہا تھا:

''صاحبانِ انگلستاں را نگر
شیوہ و انداز ایناں را نگر
(انگریز حکمرانوں کو دیکھو، ان کی عادات اور طریقہ کار کو دیکھو)''(۲۴)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُردؤ شاعری میں ترقی پسند تحریک حالیؔ سے پہلے شروع ہو چکی تھی اور اس میں انگریز پرستی والی بات نہیں تھی بلکہ مسلمان قوم کو پسماندگی سے باہر نکالنا اس کا مطمع نظر تھا۔ اور حالیؔ نے بھی اسی تحریک سے اتفاق کیا۔ یہ اور بات ہے کہ حالیؔ کا کلام ترقی پسند رجحانات کی زیادہ ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے مسدس کے کچھ بندوں میں انگریزوں کی مشینی اور صنعتی ترقی کا ذِکر کر کے عوام میں اقتصادی سماجی اور سیاسی احساس کو بیدار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت و حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسب و دولت کی راہیں

پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں
کھلی ہیں زمانے پہ عالم کی خبریں
نہیں واقع کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا(۲۵)

حالی نے نئی روشنی کی طرف عوام کو راغب کیا اور ساتھ ہی قدامت پسندی سے غیرت بھی دلائی:

''بہت آستانوں کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در
مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں(۲۶)

اس کے بعد حالی قوم کو ترغیب دلاتے ہیں کہ اپنی حالت کو بدلنے کے لئے خود میدانِ عمل میں کود پڑو:

سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی
تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے
تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے

چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے (۴۷)

حاؔلی کے اس پیغام کا مسلمانوں نے کچھ زیادہ اثر تو نہیں لیا، مگر اس کے اثرات دیگر اقوام کے ادیبوں اور شاعروں کے کاموں میں نظر آنے لگے۔ چنانچہ عورتوں کے حقوق، غیر فطری اور غیر انسانی رسومات کی مخالفت، جدید علوم، صنعت وحرفت، صحافت، آزادی، اخوت نیز حقوق بشر جیسے معاملے اہمیت اختیار کرنے لگے اور پھر نصف صدی بعد یعنی ۱۹۳۰ء کے دہے میں روشن دماغوں نے اس تحریک کو ایک تنظیم میں منتقل کیا اور اسے ''انجمن ترقی پسند تحریک'' کا نام دیا گیا۔

یہی نہیں، حاؔلی نے سودیشی تحریک کی بھی حمایت کی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ خام مال کسی ملک کے کارخانوں کی بنیادی ضرورت ہے اور اسے برآمد کرنا اپنے مزدور اور کاریگر کو بھوکا مارنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح حاؔلی نے یونانی طریقۂ علاج کو قائم رکھے جانے کی بھی وکالت کی تا کہ مقامی لوگ غیر ڈاکٹروں کے محتاج نہ ہوں۔ کل ملا کر حاؔلی قوم پرست ہی ثابت ہوتے ہیں۔

مگر جیسا کہ ہر تصویر کا اُلٹا رُخ بھی ہوتا ہے، ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق میں یہ نکتہ بھی اُبھر کر سامنے آیا کہ حالی نے بعض موقعوں پر انگریزی سامراج کی بھی تعریف کی ہے۔ اس کے نتیجے میں مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ حاؔلی انگریز پرست تھے۔ انھوں نے انگریز شاہ و

ملکہ کی بھی تعریف کی بلکہ اس میں مبالغہ کی حد تک چلے گئے۔ ۔

''قیصر کے گھرانوں پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر''

اسی طرح انگریز غاصب قوم کی بھی مدح سرائی کی ہے:

خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن
تم زمیں کے ہو نمک مصلح ہو تم اقوام کے (۲۸)

تقی عابدی کہتے ہیں کہ مگر حالؔی کی یہ بدگمانی جلد ہی دُور ہو گئی اور انھیں یہ احساس ہو گیا کہ انگریز دراصل بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا۔:

بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑئے آدمی خوار سارے (۲۹)

آخر میں یہ کہنا ہو گا کہ تقی عابدی نے حالی کی تحاریر و تصانیف کے تمام گوشے قاری کے سامنے لاتے ہوئے یہ واضح کر دیا ہے کہ الطاف حسین حالؔی انسانیت کے اصولوں کی علم برداری کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوم کی فکر کی مگر غیروں کی خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

کیا حالؔی اُردو تنقید کے بنیاد گذار ہیں؟

تقی عابدی کہتے ہیں:

''تخلیق اور تنقید کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ تخلیقی وجود کے ہمراہ
تنقیدی شعور ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ شعور ہر تخلیق کار کی '' ہمت اوست'' سے
بندھا رہتا ہے۔ اور اس کا تعلق بھی زیادہ تر لاشعور ہی سے رہتا ہے۔ بڑا
شعری یا ادبی کارنامہ فن پارہ ایک عمدہ تنقیدی شعور کے بغیر وجود میں نہیں آ
سکتا۔ شعر کا سب سے پہلا نقاد خود شاعر ہوتا ہے۔'' ۳۰

ڈاکٹر تقی عابدی نے مندرجہ بالا اقتباس میں تخلیق اور تنقید کا رشتہ بخوبی واضح کر دیا ہے۔ اور وہ اسی پیمانے پر حالؔی کے کلام کو پرکھ بھی رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حالؔی سے پہلے غیر منظّم اور سرسری اُردو تنقید کی روایت موجود تھی۔ شاعر خود اپنے فن کا ناقد بھی ہے چنانچہ عمدہ تخلیقاتی سرمایہ بغیر تنقید کے وجود میں نہیں آیا، اگر چہ یہ تنقید شخصی اور لاشعوری ہی کیوں نہ ہو۔ شعری محافل اور مشاعرے بھی ایک حد تک تنقیدی دبستاں کا کام انجام دیتے ہیں جہاں شعر کے حسن وعیب، زبان و بیاں اور مضمون وخیال سے آگاہی ہوتی ہے۔

بہر حال، '...... ''مغربی لٹریچر کے تنقیدی رویّوں سے استفادہ کر کے
حالؔی نے اپنے تجربوں اور ماحول کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر بڑی عقل
مندی، متانت اور سنجیدگی کے ہمراہ اپنی بصیرت اور شعری افادیت کو قطعیت
کے ساتھ '' مقدمہ شعر و شاعری'' میں شائع کر کے منطقی اور علمی تنقید کا آغاز

کیا۔ اسی بناء پر وہ (حالؔی) اُردو تنقید نگاری کے بانی اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' اُردؤ ادب کی پہلی تنقیدی تصنیف قرار پاتی ہے۔''(۳۱)

خلاصہ یہ کہ تقی عابدی صاحب حالؔی کے دو تاریخی و علمی کارناموں: مقدمہ شعر وشاعری، اور مسدس مد و جزر اسلام کو اُردو تنقید کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت دیتے ہیں اور یہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

کس کس نے حالؔی کی مخالفت کی؟

ادب کی تاریخ ان شواہد سے بھری پڑی ہے کہ تقریباً ہر عظیم شاعر یا ادیب کو تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا ہے۔ اور یہی حال خواجہ حالؔی کا بھی ہے۔ تقی عابدی نے اس سلسلے میں ایک طویل فہرست اُن شاعروں اور ادیبوں کی درج کی ہے جو کھلے عام یا پھر مبہم طریقے سے حالؔی کے نقاد تھے۔

بقول تقی عابدی:

''مذہبی لوگ حالؔی کو سرسید کی بانسری اور نیچری کہتے تھے۔ حالؔی نے جو اُردؤ شاعری کی پاکیزگی کی مہم کو اپنا شعار بنایا تھا وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا کیوں کہ وہ حالؔی کو اہلِ دِلی اور لکھنؤ نہیں مانتے تھے۔ وہ حالی کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے۔''(۳۲)

ساتھ ہی حالؔی کی مسدس کی پذیرائی ان کے مخالفین کے لئے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی۔ اُدھر حالی کی موضوعاتی نظموں سے دوسرے شاعر مرعوب ہو رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اب ان کی روایتی عشقیہ شاعری سے لوگ توجہ پھیر سکتے ہیں۔ خود حالؔی بھی روایتی شاعری کی کھلم کھلا مخالفت کرتے تھے اس لئے روایتی ڈگر والے شعراء چراغ پا ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالؔی کو گستاخی بھرے خط ملنے لگے۔ اُدھر حسرت موہانی کے ''اُردوئے معلٰی'' اور سجاد حسین لکھنوی کے ''اودھ پنچ'' رسالوں میں ان کے خلاف تنقیدی مضامین اور کلام شائع ہونے لگا۔

تقی عابدی صاحب نے حالؔی کے خلاف شعراء کی صف آرائی کا تفصیلی بیان کیا ہے جسے یہاں بیان کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ مگر پورے مضمون کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حالؔی کو کل ملا کر اس نقطہ چینی سے شہرت ہی ملی، کیوں کہ بقول شخصے:

''بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔''

حالؔی سے منسوب فرضی عربی رسالہ کی حقیقت

ڈاکٹر تقی عابدی چونکہ حالی سے متعلق ہر تحقیقی گوشے پر وضاحت کا عزم رکھتے تھے اس لئے انہوں نے مذکورہ فرضی عربی رسالے کا ذِکر بھی کیا اور یہ بھی ثابت کیا کہ یہ محض کہی سُنی بات ہے جبکہ ایسے کسی رسالے کے وجود کا کہیں بھی پتہ نہیں چلتا، یہاں تک کہ خود حالؔی نے بھی ایسے کسی کتابچے کا اشارہ تک نہیں دیا۔ لہٰذا مصنفہ ہٰذا کے لئے بھی اس بارے میں خامہ

فرسائی کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

مضمون زیر بحث میں مصنف نے حالؔی مرحوم کی [۷۷] سالہ زندگی میں ایسے تمام منصوبوں کا ذِکر کیا ہے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ مثلاً حالی چاہتے تھے کہ: ☆ دہلی میں ایک بڑا مطبع کھولا جائے۔ جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابیں شائع کی جائیں۔ نیز قوم کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لئے ایک جریدہ بھی جاری کیا جائے۔ ☆ دوسری زبانوں کی شاہکار تصانیف کے اُردو میں تراجم کئے جائیں۔ ☆ عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک مکتب کھولا جائے۔ ☆ ایک ہائی سکول کھولا جائے۔ وغیرہ۔

مگر کسی نہ کسی وجہ سے یہ سب منصوبے شروع ہی نہ ہو سکے یا پھر آگے نہ بڑھ سکے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کو چنداں ضرورت نہیں تھی کہ ان خواہشوں کا ذِکر کریں جن کو وجود ہی نہ مِل سکا۔ پھر بھی انہوں نے اسے اپنے فرائض تنقید میں شامل کیا ہے تو اچھا ہی ہے۔

حالؔی اور اقبالؔ کے تاثرات

یہاں مصنف نے مولانا حالؔی اور علامہ اقبالؒ کی ایک دوسرے کے کلام کے تئیں عقیدت کی ایک جھلک پیش کی ہے جس کی ایک ایک مثال ذیل میں اختصار کے ساتھ دی جا رہی ہے:

انجمن حمایت اسلام کے ۱۹۰۴ء کے اجلاس میں اقبال نے جب اپنی نظم '' تصور درد''

پڑھی تو موقع پر حاضر ابو الکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، سر عبدالقادر، و دیگران نے جہاں اس نوجوان شاعر کے کلام کی زبردست تعریف کی وہیں حآلی نے ایک دس روپے کا نوٹ بھی انعام میں پیش کیا۔

سر محمد اقبآل بھی حآلی کے کلام کے زبردست مدّاح تھے۔ چنانچہ حالی کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر اُنہاں نے ایک جگہ یوں فرمایا تھا : ؎

طوافِ مرقدِ حآلی سزد ارباب معنی را
نوائے اؤ بجانہا فگند شوری کہ می دانم

(اہل فہم کو حآلی کی قبر کا طواف جچتا ہے، کیوں کہ ان کا کلام لوگوں میں وہ جوش پیدا کرتا ہے جس کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں)(۳۳)

مضمون ہذا اگرچہ مختصر مگر جامع ہے۔ اور اس بات کا ثبوت ہے کہ بڑے بڑے شعراء کے حلقے میں حآلی کا مقام کافی بلند ہے۔

حآلی کی جھڑپ شیخ واعظ اور مفتی کے ساتھ

اُردو شعراء میں سے اکثر نے شیخ واعظ اور مفتی کی ریاکاری پر طنز کیا ہے، مگر حآلی اس میدان میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اُس دور میں مسلمان غریبی اور جہالت سے دوچار تھے اور اکثر نیم خواندہ لوگوں کے بہکاوے میں آکر فرقہ پرستی اور غیر اسلامی عادات پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ حآلی مرحوم نے اس صورتحال کا بغور مشاہدہ کیا اور لوگوں کو بنیاد پرستی نیز توہمات

سے باہر نکالنے کی مہم شروع کی۔

تقی عابدی نے حآلی کی اسی جد و جہد کا ایک نقشہ اس مضمون میں پیش کرنے کے لئے جگہ جگہ سے مووا اکٹھا کیا ہے، جس کی مختصر روداد مندرجہ ذیل کی سطور میں بیان کی جا رہی ہے:

گر نہیں سنتے قول حآلی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا نہ تھا

☆

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حآلی پڑیں بس آپ
قصّہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

☆

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے
اسلام ہے فقیہ و ممنوں بہت تمہارا (۳۴)

غرض حآلی کے کلام میں جا بجا خود نما مذہبی رہنماؤں کے اخلاق و اطوار اور ان کے کردار و رفتار پر تلخ اور سچے اشعار ملتے ہیں۔ جن کو مصنّف نے بڑے سلیقے سے اس مضمون میں سجایا ہے۔

حالؔی مشاہیر کی نگاہ میں

یہ بات درست ہے کہ حالؔی کو ان کے معاصرین میں سے کم لوگوں نے سمجھا اور قدر کی مگر جو ان کو سمجھ سکے وہ ان سے پوری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی زندگی میں اور بعد کے وقتوں میں بھی جن جن لوگوں نے ان کی نظم اور نثر کو بغور دیکھا، ان کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ تقی عابدی نے اس ضمن میں چند نامور ہستیوں کے خیالات یہاں قارئین کی نذر کئے ہیں مثلاً :-

علامہ اقبالؔ کا کہنا ہے:

نگہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

خواجہ غلام الثقلین کے بقول:

''مولانا حالؔی یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان تھے اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔''

عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ

'' حالؔی وہ کولمبس ہیں جنہوں نے ہمارے لئے ایک ادبی جزیرہ تلاش کیا۔ وہ جزیرہ جو مرزا غالب کہلاتا ہے۔''

عبدالحق فرماتے ہیں کہ

''حالؔی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کی۔ لفظ کا صحیح
اور برمحل استعمال جس سے عبارت میں جان پڑ جائے اور لفظ بول اُٹھے کہ
لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ
کوئی حالؔی سے سیکھے۔''(۳۵)

چکبست کا خیال ہے کہ اُردو زبان پر مولانا حالؔی کا احسان ہے۔ ان کی یاد دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مولانا حالؔی غالبًا پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ آواز بلند کی تھی کہ زمانے کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہئے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ اِدھر گراہم بیلی کا دعویٰ ہے کہ حالؔی کی طرزِ نگارش اور اسلوب بیان مصنوعی آرائش و تصنع سے مبرّا ہے۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں کہ حالی کی نثر میں فصاحت متانت استدلال، اعتدال نیز توازن سموئے ہوئے ملتے ہیں۔

صفی لکھنوی نے تو حالؔی کی تعریف میں باقاعدہ ایک مرثیہ لکھا ہے جس کے دو اشعار یہاں درج کرنا مناسب سمجھتی ہوں:

عدی و عطار اس صدی کا
طینت میں اثر نہ تھا بدی کا

دِل آئینہ عشقِ سرمدی کا
پُتلا خُلقِ محمدی کا

گویا کہ مصنّف حالؔی سے متعلق کئی علماء و ادباء کی آراء جمع کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ ان آراء سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حالؔی کو اگر غلط نہ سمجھا جاتا اور ان سے متعلق غلط بیانی نہ کی گئی ہوتی تو نئی نسل انھیں اپنا مُرشد گردانتی۔

حالؔی کا مذہبی شعور اور عقیدہ

کلام وعمل کی روشنی میں

حالؔی مذہبی شخصیت کے مالک تھے۔لیکن اُن میں کسی اور مذہب سے بغض یا تعصب نہ تھا۔ مصنف نے یہاں حالؔی کی مذہبی زندگی سے متعلق چندلوگوں کے تاثرات درج کئے ہیں تا کہ قاری کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہو سکے کہ حالؔی بہت رواداد تھے۔ خواجہ حالؔی کی پڑنواسی صالحہ عابدہ حسین ''یادگارِ حالی'' میں لکھتی ہیں کہ حالؔی خودتو سُنّی عقیدہ رکھتے تھے مگران کی بیگم شیعہ تھیں۔ پھربھی دونوں بڑی رواداری سے زندگی بسر کرتے رہے۔تقی عابدی نے اس تعلق سے حالؔی کے چنداشعار بھی پیش کئے ہیں:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں(۳۶)

حالی کے قطعات کا اجمالی تجزیہ

ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق حالی نے مختلف موضوعات پر [۶۷] قطعات لکھے ہیں۔ انہوں نے ان کو موضوعات کے تحت ترتیب دی ہے۔مثلاً تنقیدی، سیاسی، معاشرتی اور اصلاحی وغیرہ۔انہوں نے نثر اور نظم میں جدید اور زندہ شعر کے علائم اور اثرات ظاہر کئے ہیں۔بقول ڈاکٹر تقی:

''حالی نے اچھے شعر کی بابت لکھا ہے کہ شعر میں شاعر ان ہی موضوعات پر قلم اُٹھائے جو اس نے خود کئے ہیں اور اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو یعنی شراب، رندی، میخانے کا مست و رنگین ذکر وہی کرے جو اس کا اہل ہے۔''

اس سلسلے میں ایک قطعہ بھی نقل کیا گیا ہے:

آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گر چہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
لایئے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی(۳۷)

حالی کے کئی قطعات عمدہ نکات کی ترجمانی انوکھے انداز میں کرتے ہیں جو ان کی فن پر قدرت اور معنی آفرینی کا ثبوت ہے۔ اچھے کام کے ذیل میں کہتے ہیں:

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا (۳۸)

حالؔی نے عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل پر صرف ''مناجات بیوہ'' اور'' چُپ کی داد'' ہی نہیں لکھی بلکہ کئی دوسری نظموں اور نثری تحریروں میں ان کی تعلیم اور حقوق کی پاسداری بھی کی ہے:

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر

بد مزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بد چلنی

کچھ برائی نہیں ڈھونڈتا ہو داماد اگر (۳۹)

ایسا لگتا ہے کہ جیسے اقبال نے ''یقین'' کا لفظ حالؔی سے لیا ہو۔ اس لئے کہ دونوں نے اس کا مطلب ایک سا لیا ہے۔ حالؔی قطعہ ''یقین'' میں لکھتے ہیں:

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست

دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا

تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بُت پرست

جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا

وہ مانگتا بتوں سے مُرادیں ہے عمر بھر

آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصور

تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے

وہ ہے کہ یہ ہے بندگی، اے بندۂ خدا (۴۰)

الغرض مصنف نے الگ الگ زاویہ ہائے نظر سے حالؔی کے قطعات پر اجمالی روشنی ڈالی ہے جس سے طلباء خاص طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

حالی کی غزلوں کا مختصر تعارف

عام خیال یہ ہے کہ حالی کی شروعاتی دور کی غزلیں تلف ہو چکی ہیں یا پھر انھوں نے خود ہی اپنا ابتدائی کلام منظرِ عام پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔ بہر حال ان کی غزلیات کا پہلا دور ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۴ء تک متعین کیا گیا ہے۔ تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''حالی کے کلام میں دورِ اوّل یا قدیم دور کی تمیں [۳۰] غزلیں شامل ہیں جن کے مجموعی اشعار کی تعداد [۳۰۸] ہے۔ حالی نے دورِ دوم یا جدید غزلیات کو ۱۸۷۴ء سے ۱۸۹۳ء کے درمیان لکھا۔ یہ وہ غزلیات ہیں جن کے اشعار نساخ کے تذکرہ سخن مطبوعہ ۱۸۷۴ء میں شامل نہیں بلکہ تمام غزلیات دیوانِ حالی مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں موجود ہیں۔''(۴۱)

حالی سعدی، میر، غالب، انیس اور شیفتہ سے متاثر تھے جس کی جھلک ان کی غزلوں میں بھی عیاں ہے:

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

الغرض تقی عابدی کا کہنا ہے کہ:

> ''حالی نے نہ صرف قطرے میں دجلہ دیکھا بلکہ دوسروں کو دکھایا۔ چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری میں شاعروں کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ حالی نے قدیم و

جدید غزلوں کی تشبیہات، استعارات اور اشارات کے قدیم ساغروں میں
نئی شراب بھری، زبان اور اسلوب کو نئے دور کے تقاضوں سے آشنا کروایا،
جو بعض شاعروں اور ادیبوں کی سخت مخالفت کے باوجود بھی موردِ تقلید قرار
دی گئی۔'' (۴۲)

حالی کی رباعیات کا مختصر جائزہ

حالی نے اُردو میں ۱۶۰] اور فارسی میں[۲۰] رُباعیات لکھی ہیں جن کا دورِ تصنیف ۱۸۶۳ء سے ۱۹۱۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔ان رباعیات کے موضوعات مذہبی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ، مذہبی نیز ذاتی رہے ہیں۔مگر اخلاقی قدریں ان کے یہاں زیادہ ہی ملتی ہیں۔تقی عابدی نے بھی یہاں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

'' حالی شاعری کو مقصد اور سماجی اخلاقی قدروں کو ابھارنے کے لئے
استعمال کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پاسدار تھے اور
انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرتوں سے نبرد آزما تھے۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دُنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں (۴۳)

تقی عابدی کا یہ بھی کہنا ہے کہ حالؔی رُباعیات میں میر انیسؔ سے بہت متاثر تھے۔ وہ میر کی زبان دانی اور تخیل کے عاشق تھے۔ حالؔی کے کلام میں میر انیس کے کلاؔم کی سادگی اور مکالموں کی نشست کا عمل محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حالؔی کے کلام میں سر سید

حالؔی نے اپنی کتاب ''حیاتِ جاوید'' میں سر سید کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ تمام عمر سر سید کے سچے دوست اور ساتھی رہے۔ انہوں نے فارسی میں بھی سر سید پر مرثیہ لکھا ہے جسے ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ تقی عابدی نے اس ضمن میں یوں لکھا ہے:

> '' حالی نے قطعات، قصیدہ اور مرثیہ میں سر سید کی قومی، سماجی، علمی اور اخلاقی خدمات کے ذِکر کے ساتھ ساتھ ان پر مسلمانوں کی جانب سے ہونے والے [تنقیدی] حملوں کا مُنہ توڑ جواب بھی دیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں سر سید کو معطون کر کے کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا نیز انہیں بے دین اور نیچری کہا گیا۔ حالؔی نے اس تکفیری دھندے کے خلاف آوز اُٹھائی۔''
>
> (۴۴)

مضمون کے آخر میں ایک نظم درج ہے جس میں حالؔی کی طرف سے سر سید کے ناقدین پر طنز کی گئی ہے:

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر بے خجستہ نے آ کے کی رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گردو پیش سے
لگتی ہے کیسے آ کے زرو سیم کی جھڑی،، (۴۵)

حالؔی پنجاب میں

حالی کے دو بڑے محسن مرزا غالبؔ اور مصطفیٰ خاں شیفتہؔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کر گئے جس سے دِلّی کی فضا میں ان کے لئے دلچسپی نہ رہی۔ دوسرے روزگار کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ اس لئے حالی نے لاہور (پنجاب) کا رُخ کیا جہاں انھیں سرکاری بک ڈپو میں پروف ریڈر کا کام مِل گیا۔ لاہور میں حالؔی چار سال تک رہے جہاں وہ انگریزی سے اُردو میں کئے گئے تراجم کے پروف پڑھتے تھے اور اُردؤ عبارت کو درست کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حالؔی

کی انگریزی ادب سے دلچسپی بڑھتی گئی ۔

لاہور اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ یہاں کرنل ہال رائڈ کی اسکیم سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے موضوعی مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ یہ مغربی طرز کے مشاعرے عوام کی توجہ کا مرکز بنے۔ حالؔی نے اپنی چار نظمیں : برکھا رُت ، نشاط امید ، مناظر رحم و انصاف نیز حُب وطن ان ہی مشاعروں میں پڑھیں۔ حالؔی نے ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد کے ساتھ پورا تعاون کیا کیوں کہ یہ دونوں ہی روایتی عشقیہ شاعری کے خلاف تھے۔ تقی عابدی اس تعلق سے یوں لکھتے ہیں :

> '' حالی محمد حسین آزؔاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب آبِ حیات'' پر اعتراضات ہوئے تو حالؔی نے کھل کر آزاد کی حمایت کی اور آزؔاد کو مزید کام کرنے کی صلاح بھی دی۔ حالؔی رسالہ ''اتالیق پنجاب'' کے سب ایڈیٹر اور بعد میں پنجاب میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔'' (۴۶)

حالؔی اور تذکرہ آبِ حیات

محمد حسین آزؔاد مرحوم کی یہ کتاب '' آبِ حیات'' قدیم تحریروں اور ادیبوں کو عوام سے روشناس کرانے کی غرض سے لکھی گئی تھی کیوں کہ قدیم ادب اور اس کے جاننے والے آہستہ آہستہ ناپید ہو چکے تھے اور یہ خزانہ ضائع ہو رہا تھا۔ حالی نے یہاں خود محمد حسین آزاد کے لفظوں میں سبب تحریر بیان کیا ہے:

''غرض خیالات مذکورہ بالہ نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔''(۴۷)

''آبِ حیات'' میں آزاد نے ولی دکنی سے انیس لکھنوی تک کے پونے دوسوسال کے عرصے کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور میں تمہیدی بیان اور اس دور میں شامل چند شعراً پر اظہار خیال کیا جو بڑا انوکھا کام تھا۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق تھا لسانی تبدیلیاں متروک الفاظ کی فہرستوں تک ہی محدود تھیں۔ بہر حال وقتی ادیبوں اور شاعروں نے اس کتاب پر طرح طرح سے تنقید کی۔ مگر حالی نے اس کتاب کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس کی خوبیوں کا بھی خصوصی ذِکر کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردؤ اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے ہم وطنوں پر بھی ظاہر کریں۔ اس تذکرہ کو میں نے اوّل سے آخر تک دیکھا۔ حق یہ ہے کہ یہ اُردؤ زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کئے گئے ہیں۔''(۴۸)

حالؔی اور شبلؔی

حالؔی اور شبلؔی کا سالِ رحلت ایک ہی ہے یعنی ۱۹۱۴ء حالانکہ حالؔی کا جنم شبلؔی سے [۲۰] سال پہلے ہوا تھا۔ یہ دونوں سرسید کے مصاحبین میں شامل تھے اور دونوں کی مُلاقات بھی علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ حالؔی پانی پتی اور شبلؔی اعظم گڑھی تھے۔ دونوں اُردو فارسی اور عربی کے شاعر تھے۔ دونوں کا تعلق سرسید کی تحریک سے تھا، اگر چہ بعد میں شبلؔی نے کچھ دُوری اختیار کر لی تھی اور وہ الندوہ مشن کے روح رواں بن گئے تھے۔ ان دنوں کو شمس العلماؔ کا خطاب حاصل تھا۔ دونوں کی تصانیف کی شہرت تھی اور دونوں انگریز حکومت کے طرفداروں میں شامل تھے۔ ایک مقام پر شبلؔی لکھتے ہیں:

> ''میں دریا ہوں اور حالؔی کنواں ہیں۔ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالؔی کے پاس معلومات اگر چہ کم ہیں لیکن وہ گہرے ہیں۔ جب تک کافی موادِ تحریر موجود نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا۔ مگر حالؔی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے۔ جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔'' (۴۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے حالؔی اور شبلؔی میں مماثلت اور دونوں کی عادات و اطوار کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے جس سے قاری کو ان شخصیتوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

حاؔلی کی دِلّی

حاؔلی پانی پت کے رہنے والے تھے مگر دِلّی بھی وہاں سے محض [۵۰] میل دُور تھی۔ گویا تہذیبی لحاظ سے کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر دِلّی سے حاؔلی کو خاص انس بھی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے دِلّی میں نہ صرف یہ کہ تعلیم پائی تھی بلکہ شاعری کے لئے ادبی ماحول بھی وہیں میسّر آیا تھا۔ دِلی میں ان کے کرم فرماؤں میں غالبؔ اور شیفتہؔ کے نام سرِ فہرست ہیں جن کے ساتھ حاؔلی کی زندگی کے بہترین دِن گزرے تھے۔ ان کی عمر کا چوتھائی حصّہ دِلی میں گذرا تھا۔

حاؔلی بس اب یقیں ہے کہ دِلی کے ہو رہے
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا (۵۰)

ڈاکٹر تقی عابدی نے مضمون ہذا میں اس تعلق سے حاؔلی کی ایک غزل کے چند اشعار درج کئے ہیں۔ جو یوں ہیں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دِلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

کوچ سب کر چکے دِلی سے تیرے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گوانا ہر گز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حآلی
یاں مناسب نہیں رورو کے رلانا ہر گز (۵۱)

حآلی کی نظمیں۔تحقیقی گفتگو

تحقیق وتنقید کا ایک اہم عمل حق دار کو اس کا حق دینا بھی ہے۔مگر اُردو کے ادیبوں مورخوں شاعروں اور ناقدوں کا یہ بھی عجیب طریقہ ہے کہ بغیر صحیح تحقیق و چھان بین کے ہر مثبت یا منفی مسئلہ کو کسی مدوح یا مطعون کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔ جہاں تک حآلی کی نظموں کا تعلق ہے اُن پر کوئی فیصلہ دینے سے پہلے ان کا پس منظر معلوم کرنا مناسب رہے گا۔
بقول ڈاکٹرتقی عابدی:

'' حآلی معترف ہیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم قدامت پرست اساتذہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ جب آزآد لاہور میں اُردؤ شاعری میں انقلاب لانے کے لئے انجمن پنجاب کی تحریک کوفروغ دے رہے تھے تو حآلی عیسائی

مبلّغ پادری عماد الدین کے ساتھ مناظروں میں اُلجھے ہوئے تھے اور ''ہدایت المسلمین'' کے جواب میں '' تریاقِ مسموم'' لکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے ان کے خیالات کو منقلب کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں بے جا مبالغہ آرائی سے نفرت ہوگئی تھی۔ تاہم جدید تصورات سے ان کا اولین سابقہ لاہور میں ہوا۔'' (۵۲)

ہو چکے حاؔلی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفؔی و میؔر ہو چکی

برکھا رُت، عمدہ منظر نگاری کا شاہکار

حاؔلی نے ۱۸۷۴ء میں [۱۴۴] اشعار کی مثنوی ''برکھا رُت'' اس جدید مشاعرے میں پڑھی جو محمد حسین آزاد نے لاہور میں شروع کیا تھا۔ یہ نظم بہت پسند کی گئی اور اس کو سرسید کے علاوہ اخبارِ پنجاب نے بھی بہت سراہا۔ شاعر نے اس نظم میں پہلے گرمی اور لُو سے پیدا شدہ صورتحال کا منظر پیش کیا اور پھر برکھا رُت کی تصویر یوں بیان کی:

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کھار
دُلہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سُو

تقی عابدی اس نظم کو بہار کا مرقع بتاتے ہیں۔اس میں پرندوں کی نغمہ سرائی، پھولوں کی جلوہ نمائی، دریاؤں کی تیز روانی، سڑکوں کی ناہمواری اور بیماریوں کی زیادتی وغیرہ کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے، تاکہ برسات کے سکّے کے دونوں رُخ دکھائی دیں۔

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے
واں سینکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
گھنگھور گھٹائیں آ رہی ہیں
جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں(۵۳)

دولت اور وقت کا مناظرہ

یہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں؟
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
سبز ہے گلشنِ دُنیا مجھ سے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو نما
نام اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے
جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو (۵۴)

تنقید نگار نے اس مثنوی کے سبھی پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا ہے اور نتیجہ بھی اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حالؔی نے یہاں دولت اور وقت دونوں کی قدر و قیمت کر کے مناظرے میں جان

ڈال دی ہے۔ ساتھ ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جن لوگوں نے وقت کا لحاظ رکھا وہی دنیا اور آخرت میں سرخرو اور کامیاب ٹھہرے۔ وقت دریا کے پانی کی طرح واپس نہیں لوٹتا۔ وقت کی قدر و قیمت جاننے والے لوگ دُنیا کے عظیم افراد ہیں۔ دولت مٹھی میں رہتی ہے مگر وقت آزاد ہے۔

نشاطِ اُمید، نا امیدی زندگی کی موت ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مثنوی کا بغور جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس مثنوی کا اصلی محور، جوہر اور مبدا اُمید ہے جو ایک صحت مند، کارآمد اور کامیاب ذہن کی نشو نما کے لئے وہی کام کرتی ہے جو خون میں آکسیجن۔ حالؔی کی یہ نسبتاً طویل مثنوی عنوان کے گرد ہی گردش کرتی نظر آتی ہے۔ مثنوی کیا ہے ایک گلدستہ ہے۔ جس میں خیالات، جذبات، واقعات، تلمیحات، استعارات، تشبیہات، محاورات کو سلیقے اور رنگینی سے نرم خوش رنگ الفاظ کی ڈور سے باندھا گیا ہے۔''(۵۵)

حالؔی نے یہ مثنوی ۱۸۷۴ء میں لاہور کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس میں [۷۹] اشعار ہیں۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے کیوں کہ نا اُمید انسان عمل کی لذت سے کبھی آشنا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اے میری امید میری جاں نواز
اے میری دل سوز میری کار ساز
عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
خاطر رنجور کا درماں ہے تو
عاشق مہجور کا ایماں ہے تو (۵۶)

حب وطن - حالؔی کی وطن دوستی کا مستند حوالہ

حالؔی نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران انجمن پنجاب کے مشاعرے میں شرکت کر کے ایک طویل مثنوی ''حب وطن'' ۱۸۷۴ء میں پڑھی جس کی دھوم شعر و ادب میں آج بھی باقی ہے۔ ملٹن نے جو تین شرطیں اچھے شعر کے لئے بیان کی تھیں یعنی سادگی، جذبات اور اصلیت، وہ تینوں یہاں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں کل [۲۱۵] اشعار ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پوری مثنوی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس مثنوی کا حسن یہ بھی ہے کہ اسے بلاتفریق مذہب و ملت صرف اہل وطن ہونے کی نسبت سے پیش کیا گیا ہے۔ تمہید میں وطن کی تاریخ جغرافیہ کے علاوہ اس کی تہذیب اور تمدن کا ذکر بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی زمین، اس کے پربت، اس کی ہوائیں، اس کے موسم، اس

کے دشت و باغات، اس کے چرند و پرند سب اہلِ وطن کے لئے دلشاد اور نور چشم معلوم ہوتے ہیں۔" (۵۷)

مثنوی کے چند اشعار:

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہر گز اگر بہشت ملے
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

زمزمۂ قیصری ترجے اور تشریح کی عمدہ مثال

مسدس مد و جزر اسلام کی تصنیف سے ایک سال قبل حالی نے ۱۸۷۸ء میں زمزمۂ قیصری کے زیرعنوان پینتیس بند کا ترکیب بند لکھا۔ جس کے ہر بند میں سات شعر ہیں۔ اس [۲۴۵] اشعار کی طولانی نظم کو حالؔی نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ حالی خود لکھتے ہیں:

"یہ نظم ایک انگریز پوئم کے تین حصوں میں سے اول حصے کا منظوم ترجمہ ہے۔ شاید مسٹر ایسٹوک اس کے مصنف ہیں جنہوں نے اس تمام نظم کو دِلّی کے چند لائق آدمیوں سے فارسی میں نظم کرا کر ولایت میں بڑے اہتمام سے

چھپوایا ہے؟ فارسی نظم لکھے جانے سے پہلے صاحب کمشنر نے یہ پوئم اُردو میں ترجمہ کرا کر نظم کرنے کے لئے میرے پاس بھیجی تھی۔ .... اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اسلام اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذِکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں تمام رئیسوں کا جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے، بالخصوص حضور نظام کا ذِکر ہے۔ مصنف نے پہلے حصّے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں نے ان خیالات کو ایک ایسی زبان میں نظم کر دیا ہے جس کو میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔" (۵۸)

تقی عابدی نے "حآلی فہمی" میں اس نظم کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور قارئین کو اس کی تمام باریکیوں سے واقف کرایا ہے۔ نظم کے چند اشعار:

اے حصار آفیت اے کشور ہندوستان
زیب دیتا ے اگر کہئے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے تیرے دیوار کوہ
موجزن ہے ایک جانب تیرے بحر بیکراں

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں

حقوق اولاد، حالؔی کا تربیتی منظوم سبق

یہ مثنوی حالؔی مرحوم نے ۱۸۸۸ء میں لکھی تھی۔ اس میں [۳۵۱] اشعار ہیں اور یہ ایک قصے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی میں ایک باپ اور بیٹے میں باہم گفتگو پیش کی گئی ہے۔ مثنوی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے کو ہر طرح کا آرام و آسائش دیا جس کی وجہ سے بیٹا کھیل کود کی طرف چل پڑا اور محنت سے جی چرانے لگا۔ بیٹا جوان ہوا تو باپ نے اس کی شادی بھی کرادی۔ شادی کی دھوم دھام پر باپ کی ساری کمائی خرچ ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ لڑکا اب بھی بدستور بُری عادتوں میں مبتلاء رہا اور باپ ضعیف ہو چکا تھا۔ آخر میں باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب بھی اگر محنت اور لگن سے کام کرو گے تو تمہارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ چند اشعار مضمون کے آخر میں دئے گئے ہیں جو یوں ہیں:

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم
ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب
کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب

پہلے اپنا سوچ لو انجام تم
دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر
اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور (۵۹)

چُپ کی داد کا سرسری مطالعہ

یہ نظم حالؔی نے ۱۹۰۵ء میں لکھی اور اس میں کل [۷۴] اشعار ہیں۔ اسے رسالہ خاتون میں دسمبر ۱۹۰۵ء میں اور مخزن میں ۱۹۰۶ء میں شائع کیا گیا۔ حالؔی نے حیدر آباد دکن کے جلسہ عام میں اسے جون ۱۹۰۶ء میں پڑھا تھا۔ اس نظم میں حالؔی نے عورتوں کی عظمت اور سماج اور مذہب میں ان کا مقام دکھایا ہے۔ پھر ان کے ساتھ کی جانے والی نا انصافیوں کا ذِکر کیا ہے اور آخر میں ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کی مدد اور سرپرستی سے کئی مقامات پر عورتوں کے حق میں مثبت کاموں کی نشاندہی کی ہے۔تقی عابدی نے اس نظم کے حوالہ جات کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کو بھی اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ ابتدائی حوالہ یوں ہے:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دُنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تم ہی قوموں کی عزّت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے مہر و رضا انساں عبارت تم سے ہے (۶۰)

کہنے کوتو تقی عابدی نے اس مضمون کوسرسری مطالعہ کہا ہےمگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس نظم کے ہر پہلو کواچھی طرح اُبھارا ہے۔

قوم کا متوسط طبقہ

حالؔی نے یہ ترکیب بند ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس نظم کا مطلع ہے:

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

حالؔی پھر یہ بتاتے ہیں کہ مسلسل کوشش اور محنت سے انسان کامیابی حاصل کر کتا ہے۔وہ متوسط طبقہ میں مزدور اور علم و ہنر والے اشخاص کا ذِکر یوں کرتے ہیں:

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جاں آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوع انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے
دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام(۶۱)

تقی عابدی کے مطابق سرسید نے اس نظم پر جائزہ لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ایسی نظم فارسی اُردؤ عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی۔........... ''جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا، اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے، مولانا حآلی ہی کا کام ہے۔

حآلی کی بچّوں کی نظموں کا تجزیہ

حآلی نے اُردؤ ادب کے لئے جو''ادب برائے ہدف'' کا اصول بنایا تو اس پر عمل بھی پوری طرح کیا۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما تھا۔ یہاں تک کہ ان کی نظریں قوم کے بچوں پر زیادہ تھیں جو ظاہر ہے کہ کل کے رہنما ہیں۔ اب بچوں کے ادب کے لئے زبان سیدھی، سلیس اور شگفتہ ہونی چاہئے جو حآلی سے بڑھ کر اور بھلا کس کی ہوسکتی ہے:

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو
سر پر بڑوں کا سایہ سایہ خدا کا جانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں
اُس بات سے بچو تم جس بات سے وہ ٹوکیں

تم کو خبر نہیں کچھ اپنے بُرے بھلے کی
جتنی عمر ہے چھوٹی اتنی عقل ہے چھوٹی
سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے
پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے (۶۲)

تقی عابدی اس سلسلے میں کہتے ہیں:

'' حالی نے بچّوں کے لئے چھوٹی بڑی [۱۴] نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں حالؔی کی زندگی کے آخری دور کی نشانیاں ہیں۔ حالؔی نے ان نظموں کے لئے مربع، مخمس، مسدس اور مثنوی کی ہیئت استعمال کی۔ حالؔی کی ان نظموں کا زمانۂ تصنیف ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء بتایا گیا ہے۔''(۶۳)

مضمون زیر بحث میں بچوں کے لئے حالؔی مرحوم کی جن خاص نظموں کو شامل کیا گیا ہے ان میں، خدا کی شان، بڑوں کا حُکم، مُرغی اوراس کے بچّے، بلی اور چوہا، شیر کا شکار، موچی، سپاہی، اور چِٹھی رساں، سمیت [۱۴] نظمیں شامل کی گئی ہیں اور یہ سب تقی عابدی کی محنت کا نتیجہ ہے۔

حالؔی کے کلیات فارسی کا مطالعہ

آج جب کہ فارسی زبان کو ہندوستان چھوڑے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو چکا ہے یہ بات سب کے ذہنوں میں آتی ہے کہ اگر کوئی بات فارسی کے تعلق سے کی بھی جائے تو سمجھے گا

کون اور دلچسپی کس کو ہوگی ؟ مگر سید تقی عابدی کو یہ بات ذہن میں آنے کے بجائے یہ خیال رہا ہوگا کہ اگر حالؔی کے'' کلیات فارسی'' کو چھوڑ دیا جائے تو یقیناً حالؔی کے ادبی سرمائے کا ایک اہم حصّہ چھوٹ جائے گا، ساتھ ہی ان کی تحقیق بھی ادھوری کہلائے گی ۔ تحقیق کار کو اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے یہ الگ بات ہے کہ اس کا قاری کیا پسند کرے گا اور کیا نہیں ۔لہٰذا انہوں نے کلیاتِ فارسی پر مدلل بحث کی ہے جو دیگر ادباء کے لئے ایک مثال ہے ۔مضمون زیرِ بحث میں تقی عابدی نے ہر ایک گوشے کو چھان مارا ہے اور یہ کافی دلچسپ بھی ہے۔ انہوں نے فارسی کلام کا کہیں کہیں ترجمہ بھی کیا ہے مگر ضرورت تھی کہ ہر ایک شعر کا ترجمہ دیا جاتا، تا کہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث ہوتا ۔ بہر حال مجموعی طور یہ ایک احسن عمل ہے۔

دِل کہ بود از چشم موری تنگ تر
چوں نظر کردم جہانی دیگر است

[دِل جو چیونٹی کی آنکھ سے بھی چھوٹا ہے جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کی وسعت ایک عالم کی طرح نظر آئی۔

حالؔی کی نثر نگاری

حالؔی کی نثر نگاری کو سنوارنے میں جن چند لوگوں نے اہم کردار ادا کیا اُن میں غالبؔ شیفتہؔ ہالرائڈ اور سر سید سرِ فہرست ہیں ۔مذکورہ شخصیتوں میں دوسروں سے تو ہر کوئی واقف

ہے مگر ہالرائڈ کی نسبت یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ اُردؤ کے بہت شائق تھے۔ انھوں نے حاؔلی کوانگریزی کی ترغیب دلائی تھی۔ حالی کی نثر نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے تقی عابدی کہتے ہیں:

"حالی کی نثر اور نظم کے مطالعے سے ان کے خیالات اور طرزِ بیاں کی ارتقائی منزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ جوانی میں وہ ایک مولوی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس دور میں بھی انہوں نے عربی، فارسی، اُردؤ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام، مسلمان قوم کی فلاکت اور برصغیر میں اسلام کی زبوں حالی کے اسباب کا مطالعہ کیا۔ پادری عمادالدین کی کتاب "ہدایت المسلمین" کے جواب میں "تریاق مسموم" (لکھنا) اس کا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں حاؔلی کا لہجہ تیز اور تند ہے اور بقول پروفیسر احمد خاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاؔلی اپنے وقت کی مسلم کش تحریکات کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالی کا لہجہ مخلصانہ، متین اور استادانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس میں حق گفتاری کی آواز میں کمی نہیں آتی۔" (۶۴)

بہر حال حاؔلی نے اُردو ادب کے لئے جن اصولوں کی نشاندہی کی وہ ان کی مشہور ومقبول نثری دستاویز "مقدمہ شعر و شاعری" کے علاوہ کئی دوسری کتب میں بھی عیاں ہیں کیوں کہ حاؔلی نے ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دکھایا ہے۔ ان میں سے چند ایک ادبی اصول یہ ہیں:

ا۔ شاعری صرف تفریح نہیں بلکہ تعمیری قدروں کے لئے بھی کارآمد ہے۔

۲۔فرضی خیالات کی جگہ اصلیت اور جوش کو جگہ دی جائے۔

۳۔ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے ہدف یعنی اس میں مقصدیت ہو۔

۴۔شاعری سے اخلاق سازی اور انسان سازی کا کام لیا جاسکتا ہے۔

۵۔اُردو شاعری میں تصنع اور غیر ضروری باتوں سے گریز کی جانی چاہئے۔وغیرہ۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تم (۶۵)

حالؔی کے اخلاقی،تعمیری اور سماجی منتخب اشعار

حالؔی نے سعدؔی کی ''گلستاں'' اور ''بوستاں'' سے متاثر ہو کر اپنی نظم اور نثر کو پُر تاثیر کیا۔ وہ سعدی کے بہت سے نکات اُردو میں پیش کرتے ہیں اسی لئے انھیں سعدیٔ ہندوستان کہا جاتا ہے۔ حالؔی کے کلام میں حکایت، روایت، قصّے، کہانیاں، پند و وعظ سب کچھ موجود ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مضمون زیر بحث میں حالی کے کلام سے کئی چنندہ اشعار اقتباس کئے ہیں جن کی ایک جھلک میں یہاں درج کر رہی ہوں تاکہ مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہو سکے:

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا
نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادہ کہ ہو جائے نفرت زیادہ

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ (٦٦)
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت و حرفت کی راہیں
مگر ایک تم ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادہ کہ غفلت میں ہو کھوئی منزل
نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک (٦٧)

الغرض حالؔی نے اپنے معاشرے کو اتفاق سے جینے، بھائی چارہ رکھنے اور حرکت پذیر رہنے کی زبردست تلقین کی ہے۔ تقی عابدی نے اس خوبصورت کلام کو منظر عام پر لانے کی اچھی کوشش ہے حالانکہ چند ایک اشعار کئی جگہ دُہرائے بھی گئے ہیں۔ جنہیں دہرانے سے اگر کرتے تو اچھا رہتا۔

حالؔی کی صد سالہ سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال

تقی عابدی کی تحقیق کی داد دینا چاہیئے کہ انہوں نے ایک ماہنامہ ''زمانہ'' کو کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور ١٩٣٥ء میں اس کے اندر شائع ہوئی اُس روداد کو اپنی کتاب میں شامل کرلیا جو پانی پت میں مولانا حالؔی مرحوم کی صدی تقریبات کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔ الطاف حسین

حاؔلی پانی پت میں پیدا ہوئے تھے اور یکم جنوری ۱۹۱۵ء کی پہلی رات کو وفات پانے کے بعد اسی روز پانی پت میں حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ میں دفن ہوئے تھے۔ ماہنامہ ''زمانہ'' دیا نگم کی مدیریت میں شائع ہوتا تھا، جس نے اس صد سالہ سالگرہ کے جشن کی مکمل رپورٹ نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کی۔تقی عابدی نے یہ رپوٹ مختصر کر کے ''حالی فہمی'' میں درج کی ہے جس کی ایک جھلک اس موقعے پر دینا مناسب رہے گا:

''اس جشن کی صدارت کے لئے ہز ہائینس نواب آف بھوپال حمید اللہ خاں کو منتخب کیا گیا تھا۔ بیرونی مہمانوں کی آمد [۲۴] اکتوبر سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال، ڈاکٹر سر راس مسعود، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، امین زبیری اور ڈاکٹر علیم وغیرہ مہمانان میں شامل تھے۔ نواب آف بھوپال حمید اللہ خاں [۲۶] اکتوبر [۹] بجے صبح پانی پت کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ جہاں ان کے استقبال کے لئے ایک شامیانہ نصب کیا گیا تھا۔ اور ان کے استقبال کے لئے سر راس مسعود، علامہ محمد اقبال، نواب اسمٰعیل خاں اور صلاح الدین سلجوقی کونسل جنرل افغانستان موجود تھے۔'' (۶۸)

غرض کہ یہ آنکھوں دیکھا حال واقعی تمام منظر بیان کرتا ہے۔ اور اس سے تقریب کی پوری کاروائی ذہن نشین ہوتی ہے۔ بلا شبہ تقی عابدی نے اُردو ادب کے لئے یہ بڑا اہم کام کیا ہے۔

حیاتِ جاوید- حالؔی کا جاودانہ شاہکار

حالی کے نثری کارناموں میں مقدمہ شعروشاعری، یادگارِ غالبؔ، حیاتِ سعدیؔ اور حیاتِ جاوید کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ''حیاتِ جاوید'' حالؔی کے نہایت قریبی دوست اور قوم کے دردمند سرسید احمد خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب تقریباً نوسوصفحات پر مشتمل ہے۔ حالؔی نے یہ کتاب سرسید کی زندگی میں لکھنا شروع کی تھی لیکن اس کی تکمیل سرسید کی وفات کے لگ بھگ تین سال بعد ہوئی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب سارے ملک میں مقبول ہوئی اگر چہ چند ایک لوگوں نے اس میں بعض خامیاں بھی گنوائیں۔ ان میں شبلی نعمانی، صدر یار جنگ، اور وحید الدین سلیم بھی شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حالؔی نے اس میں سرسید کی مدح سرائی کی ہے اور خامیوں سے چشم پوشی کی ہے۔ بقول تقی عابدی:

> ''سرسید کی ''بائیوگرافی'' لکھنا آسان کام نہ تھا۔ سرسید ایک ہمہ جہت بلکہ مختلف الجنس حیثیوں کے مالک تھے۔ ان کے دوست اور دشمنوں کی کمی نہ تھی۔ وہ کہیں صدیق اور کہیں زندیق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے حالات غدر کے بعد تو آسانی سے دستیاب تھے۔ مگر اس سے پہلے کے حالات کا جمع کرنا مشکل تھا۔ سرسید کی زندگی میں انقلابات کی کمی نہ تھی۔ غدر کے بعد بہت سی معلومات انگریزی فائلوں میں تھیں جن کا ترجمہ بھی ضروری

تھا۔ حالؔی نے یہ تمام امور دقیق دیدہ ریزی اور محنت سے کئے۔" (۶۹)

اس مضمون کے آخر میں تقی عابدی نے اُن قیمتی نکات کا ذِکر بھی کیا ہے جو حالؔی نے سرسید کی زندگی کو مثال مناتے ہوئے درج کئے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھو اور اس کے ساتھ موافقت کرو۔

۲۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے کی کوشش کرو۔

۳۔ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانو۔

۴۔ اگر دُنیا میں برا بننا چاہو تو لالچ، خودغرضی، جھوٹ، آرام طلبی سے دست بردار ہو جاؤ۔

۵۔ تعصب سے بچنا اور دوسری قوموں سے حسنِ معاشرت ضروری ہے۔ وغیرہ۔ (۷۰)

ایسا لگتا ہے کہ یہ سرسیّد کا منشور تھا اور حالؔی نے "حیاتِ جاوید" میں ان کی حیات، شخصیت، کارناموں اور فتوحات کے ذیل میں یہ بتا دیا کہ سرسید نے خود ان اہم نکات پر عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت بھی دی۔

(۲)مسدسِ حالؔی - تشریح وتجزیہ

اس سے پہلے ’’حالؔی فہمی‘‘ اور ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کے حوالے سے ایک تعارف نامہ میں پیش کر چکی ہوں جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرا مقالہ’’ ڈاکٹر تقی عابدی اور تنقیدِ حالؔی‘‘ تین کتابوں پر مشتمل ہے یعنی ا۔ حالی فہمی ،۲۔مسدس حالؔی اور ۳۔کلیاتِ حالؔی ۔اور یہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔اس سلسلے کے تحت ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مسدس حالؔی کے حوالے سے کیا تحقیق وتنقید کی ہے اور کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سب سے پہلے ہم سیّد تقی عابدی کی کتاب ’’مُسدسِ حالیؔ‘‘ -[مع سوانح شخصیت،آرائے اکابرین تشریح وتجزیہ] پر ایک عمومی نظر دوڑاتے ہیں۔’’مُسدسِ حالیؔ‘‘ [۲۷۰]صفحات پر مشتمل ہے اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں چھاپی گئی ہے۔ یہ بُک کارنر،جہلم ، پاکستان کی پیش کش ہے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ تقی عابدی بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور ان کی کتابوں کی اشاعت پبلشر لوگوں کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے لہٰذا ان کی کتابیں اپنی چھپوائی کا بھی معیار رکھتی ہیں۔

’’مُسدسِ حالؔی‘‘ کا انتساب کرنل انور احمد کے نام کیا گیا ہے جنہوں نے ۱۹۷۹ء میں ٹورانٹو (کنیڈا) میں مسدس حالی کی تصنیف کی پہلی صدی برگزار کی۔ کتاب کے صفحہ نمبر[۴] پر حالؔی سے متعلق تقی عابدی کی کتابوں کی فہرست موجود ہے۔صفحہ [۵ تا ۶] پر تنقید نگار کا

تعارف دیا گیا ہے جسے ہم ''حالی فہمی'' کے تعارف میں درج کر چکے ہیں۔صفحہ نمبر [۷] پر فہرست عنوانات درج ہے۔صفحہ [۸] تا [۱۵] پر حالؔی و دیگراں کی تصاویر کے عکس نیز حالی اور سرسید کے مابین دو اہم مراسلات کے عکس بھی دئے گئے ہیں۔شجرہ مولانا حالؔی صفحہ نمبر [۱۶] دیا گیا ہے جبکہ کتاب کا پیش لفظ صفحہ [۱۷] سے شروع ہوتا ہے جس کا جائزہ ذرا تفصیل سے لیا جا رہا ہے۔

''مُسدسِ حالی'' میں تقی عابدی نے حالؔی کو ترقی پسند شاعری اور تنقید کا بنیاد گذار اور جدید نظم کا پیشوا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حالؔی نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمہ شعرو شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یادگار غالب، اور حیات سعدی کے علاوہ اُردؤ فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار لکھے ہیں جو ان کے معاصرین کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں۔لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ حالؔی کا بہت سا کلام وقتی حادثات کی نذر ہو گیا تھا جسے حاصل کرنے میں تحقیق کاروں کو بڑی مشکلات پیش آئیں اور پھر جو کچھ منظر عام پر آ چکا تھا اس میں سے غلط اور درست کی پہچان بھی ایک مسئلہ تھا۔اس سلسلے میں تفصیل پیش کرنے کے بعد تقی عابدی رقم طراز ہیں:

> '' حالؔی کے مطبوعہ کلام کے کئی نمونے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم نے کلام میں جہاں اختلاف پایا وہاں حالؔی کی زندگی میں شائع شدہ کلام کو

بنیادی حیثیت دی ۔ دیوان حالی ، مسدس حالی ، مجموعہ نظم حالی ، ضمیمہ کلیات حالی ، اور مختلف معروف نظمیں جو شائع ہو چکی تھیں ان سے استفادہ کیا گیا۔ جواہرات حالی اور دیگر نسخوں کو دوسری کتابوں کے حوالوں سے دیکھا گیا ہے۔ حالی کے قدیم کلیات میں جو مسائل تھے جہاں کئی الفاظ ملا کر لکھے جاتے تھے اور بعض نسخوں میں یاں ، واں ، ترے ، مرے ، کو یہاں ، وہاں ، تیرے ، میرے لکھا گیا جس سے شعر وزن سے ساقط ہو گیا تھا اس کلیات میں ان نقائص سے اجتناب کرنے کے لئے کلیات نظم حالی کی دونوں جلدوں سے بھر پور استفادہ کیا گیا جن کو ڈاکٹر صدیقی نے مرتب کیا اور ضروری حاشیے درج کئے۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی کا کلیات موجودہ نسخوں میں سب سے عمدہ اور نقائص سے پاک ہے۔'' (۷۱)

مجموعی طور پر تقی عابدی نے اس پیش لفظ میں '' مُسدسِ حالی'' کے حوالے سے کم مگر مجموعی کلام کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی ہے جس کا مقصد شائد یہ تھا کہ قاری کو حالی کی مکمل ادبی زندگی سے روشناس کرایا جائے۔

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اپنی کتاب '' مُسدسِ حالی'' کے آغاز میں خود مولانا حالی مرحوم کی زبانی ان کے حالات نقل کئے ہیں تا کہ قارئین کے سامنے حالی کی شخصیت خود بخود اُبھر کر

سامنے آ جائے اور پھر اُنھیں حالی کواُن سے روشناس کرانے میں بھی آسانی رہے۔ تقی عابدی کے بقول مولانا الطاف حسین حالی نے نواب عمادالملک بہادر مولوی حسین بلگرامی کی فرمائش پر اپنی سوانح عمری لکھی تھی جسے انھوں نے موجودہ عنوان کے تحت من وعن پیش کیا ہے۔ بہر حال ہم یہاں اس مضمون کا خلاصہ ہی بیان کر رہے ہیں:

مولانا الطاف حسین حالی کی ولادت ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت میں ہوئی جو شاہ جہاں آباد (یعنی دہلی) سے ۵۳ میل دُور جانب شمال میں واقع ہے۔ اس قصبہ میں قریب سات سو سال سے قوم انصار کی ایک شاخ آباد چلی آ رہی ہے جس سے ان کا تعلق تھا۔ ساتویں صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ غیاث الدین بلبن دہلی کے تخت پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے چل کر ہندوستان آئے۔ ان کا سلسلہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جاملتا ہے۔ (نوٹ): مذید حالات ہم قبل ازیں ''حالی فہمی'' پر تبصرہ کے دوران درج کر چکے ہیں لہٰذا ان کا دہرانا مناسب نہیں ہوگا۔

مسدس مدوجزر اسلام

حالی کی مسدس ''مدوجزر اسلام'' کا دیباچہ یہاں نقل کر کے ڈاکٹر تقی عابدی نے ''مسدس حالی'' کو مزید دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ قاری کو پہلے خود مولانا حالی مرحوم کی تحریروں سے روشناس کرایا جائے اور پھر خود ان کے متعلق اپنی رائے رکھی جائے۔ ہم یہاں

اس دیباچے کا بھی مختصر جائزہ لیں گے:

بچپن کا زمانہ ایک طرح سے بادشاہی کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اس دور میں انسان غم اور فکر کی باتوں سے نا آشنا ہوتا ہے۔ مولانا حالؔی کا بچپن بھی ایسا ہی تھا۔ پھر جب نوجوانی آئی تو صورتِ حال مختلف تھی۔ خود لکھتے ہیں کہ:

"باغ جوانی کی بہار اگر چہ قابلِ دید تھی، مگر دُنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ خود آرائی کا خیال آیا نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اُٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" (۷۲)

بچپن سے ہی حالی کا رُجحان شاعری کی طرف تھا، لہٰذا کچھ نہ کچھ لکھنے میں لگے رہتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے غزل، نظم اور قصیدہ میں خوب طبع آزمائی کی۔ مگر خود بقول حالؔی: "آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے محض اپنا اعمال نامہ خراب کیا ہے۔" کیوں کہ شاعری کے جذبے سے متاثر ہو کر دِل کی بھڑاس تو نکالی مگر تعلّی سے کام لیتے ہوئے بڑے کو بہت بڑا اور چھوٹے کو بہت چھوٹا کہہ دیا۔ اور کہیں تو جھوٹ اور سچ کی تمیز تک نہ رہی۔......" غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی:

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود
تمسکات گناہاں خلق پارہ کنند" (۷۳)

حالؔی کے مطابق بیس برس کی عمر سے انہوں نے لکھنا شروع کیا اور چالیس سال تک پہنچتے پہنچتے عربی، فارسی نیز اُردو زبانوں میں بہت کچھ لکھا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اسی دورا ان کی مُلاقات سرسید احمد خاں صاحب سے ہوئی جنہوں نے حالؔی سے فرمائش کی کہ وہ مسلمانوں کی بد حالی کے بارے میں ایک کتاب لکھیں۔ سرسیّد کی باتوں میں وہ اثر تھا کہ حالؔی ان کی فرمائش ٹال نہ سکے۔ چنانچہ حالی خود فرماتے ہیں:

"ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دِل سے ہی نکلی تھی دِل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑہی میں ایک اُبال آیا۔ افسردہ دِل، بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنہی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدّس کی بنیاد ڈالی۔" (۷۴)

دیباچے کے آخری پیراگراف میں حالی نے مسدس کا تعارف بھی خوبصورت طریقے سے کرایا ہے جو اُنہی کے لفظوں میں بیان کرنا مناسب رہے گا:

"اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی

اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جوظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام
اسلام میں جاہلیت رکھا گیا ہے۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمی
ﷺ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہوجانا ، اور اس ابر
رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا
دینی و دُنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔اس کے
بعد ان کے تنزّل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے
ایک آئنہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خد و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم
کون تھے اور کیا ہو گئے۔''(۷۵)

المختصر مولانا حالؔی نے اس خوبصورت دیباچے میں نہ صرف اپنی مسدّس ''مدوجذر اسلام'' کا دلچسپ تعارف کرایا ہے بلکہ قاری کو آمادہ بھی کر دیا ہے کہ وہ اسے ضرور پڑھے۔ یہ دیباچہ حالؔی کی نثر نویسی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے تو ساتھ ہی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ادب شناسی کا مظہر بھی ہے۔

متعلق بہ ضمیمہ مسدّس مدو جزر اسلام

حالؔی نے ''مسدس مدوجذر اسلام'' ۱۸۷۹ء میں شائع کی تھی جسے عوام و خواص میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں کی مانگ کے سبب اس کے سات ایڈیشن شائع کئے گئے۔ قریباً سات سال بعد ۱۸۸۶ء میں جب اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن جاری کیا گیا تو اس میں حالؔی نے مذید ایک دیباچہ جوڑ دیا جسے تقی عابدی نے اپنی کتاب ''حالی فہمی'' میں نقل کیا

ہے۔اس مضمون میں حالی مرحوم نے کتاب کی مقبولیت کے لئے قارئین کی تعریف کی ہے اور اُمید بھی ظاہر کی ہے کہ قوم میں بیداری پیدا کرنے کا مصنف کا مقصد ضرور پورا ہوگا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

''گوقوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہئے۔''(۷۶)

حالؔی کی حیات اور شخصیت

اس مضمون میں ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے حالؔی مرحوم کا تفصیلی تعارف لکھا ہے جس کا خلاصہ یہاں ہم درج کر رہے ہیں:

حالؔی کا پورا نام خواجہ الطاف حسین ہے۔ وہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی جائے پیدائش پانی پت ضلع کرنال ہے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش اس وقت کی انگریزی سرکار کے پرمٹ محکمہ میں ملازم تھے۔ ان کی وفات محض چالیس سال کی عمر میں ہوئی جب حالی صرف [۹] برس کے تھے۔ حالؔی کی والدہ ان کی ولادت کے فوراً بعد ہی دماغی توازن کھوبیٹھی تھیں۔ تب ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔ حالؔی کے دادا خواجہ بوعلی بخش اور پردادا خواجہ محمد بخش تھے جن کا شجرہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے جدِ امجد خواجہ ملک

علی ہرات کے رہنے والے تھے اور غیاث الدین بلبن بادشاہ کے دور میں
ہندوستان آئے تھے۔بلبن نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر ملازمت دی
اور پانی پت میں جاگیر بھی عطا کی۔لہٰذا یہ خاندان ۱۲۷۶ھ سے پانی پت
میں مقیم ہوگیا۔

حالؔی کی والدہ سیّد خاندان سے تھیں جونزدیک ہی پانی پت میں آباد تھا۔ حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجیہہ النساء تھیں ۔ حالؔی سب سے چھوٹے تھے ۔ ان کی پیدائش کے فوراً بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا لہٰذا ان کی پرورش والد اور بھائی بہنوں نے کی۔ پھر جب [۹] سال کی عمر میں والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تو بھائی اور بہنوں نے ان کی دیکھ بھال کی۔

گھر کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے حالؔی کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا، البتہ انھیں گھر پر ہی قرآن پاک کی تعلیم دی گئی ۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں انھیں مقامی عالم حافظ ممتاز حسین کے پاس دینی تعلیم کے لئے بھیجا گیا جہاں اُنھوں نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔ بعد ازاں انھوں نے سید جعفر علی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور حاجی ابراہیم انصاری سے عربی صرف ونحو بھی پڑھی ۔ بعد میں دِلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور صرف ،نحو، منطق اور حدیث کا درس لیا۔ مگر ڈیڑھ سال کے بعد ہی واپس پانی پت جانا پڑا۔ وہاں گھر پر ہی جو کچھ پڑھنے کو مِلا پڑھ لیا، یا کسی سے تھوڑا بہت

تلمذ کرلیا۔

بھائی بہنوں کے اصرار پر حالی نے [۱۷] برس کی عمر میں شادی کر لی۔اب بظاہر انھیں کوئی روزگار تلاش کرنا تھا تا کہ گھر کا خرچہ چل سکے۔ ۱۸۵۶ء میں انھیں ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں معمولی سی ملازمت مِل گئی۔مگر ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت سے پیدا شدا حالات کے پیشِ نظر حالی کو واپس گھر آنا پڑا۔اب وہ یہاں چار برس تک بیروزگار رہے البتہ اپنے شوق سے کچھ نہ کچھ تعلیم ضرور حاصل کی۔ پھر ۱۸۶۱ء میں جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے نواب مصطفیٰ خاں کے پاس ملازمت مِل گئی جو آٹھ سال تک چلی اور بعدازاں گورنمنٹ پریس لاہور میں ملازم ہوئے۔

حالی کی بیوی اسلام النساء مزاج کی سخت مگر ذِمے دار خاتون تھیں۔وہ گھر کی ذمیداریوں میں مشغول رہتی تھیں مگر حالی کی مصروفیات میں ہرگز دخل نہیں دیتی تھیں۔حالی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے حوالے کر دیتے تھے اور خود گھر کی ذمے داریوں سے الگ ہو کر علم و ادب کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ بی بی اسلام النساء ۱۹۰۰ء میں وفات پا گئیں۔مولانا حالی کو اس کا سخت صدمہ ہوا جس کا اظہار ان کی مختلف تحاریر سے ہوتا ہے۔

حالی کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے،مگر دو لڑکے اور ایک لڑکی ہی زندہ رہے یعنی:۔

۱-خواجہ اخلاق حسین،۲-عنایت فاطمہ،اور خواجہ سجاد حسین۔خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اُردو شعر و ادب کی شمع جلائی رکھی۔اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور

معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین انہی کے خاندان سے ہیں۔

اس مضمون کے اوّل حصّے میں تقی عابدی کا تعارف پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کو آسانی رہے۔ ساتھ ہی عام قارئین کی معلومات میں بھی اس سے بہت اضافہ ہوتا ہے۔ مضمون کے اگلے حصے میں حالؔی کی خاندانی و سماجی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالی کا اپنے پوتوں اور نواسوں کی تربیت اور تعلیم پر پورا پورا دھیان دینا انھیں عام ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے جو عموماً اپنے ہی شغل میں مصروف رہتے ہیں۔ بچوں سے پیار اور شفقت گویا حالؔی کی فطرت میں شامل تھا۔ خود اپنے ہی نہیں دوسروں کے بچوں سے بھی وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اس سلسلے میں تقی عابدی ایک واقع لکھتے ہیں کہ:

> ''پانی پت میں ایک دفعہ حالؔی تانگے میں بیٹھے گذر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا گندی نالی میں گرا پڑا اچلا رہا ہے۔ آس پاس جمع لوگ اسے دیکھ رام رام کر رہے ہیں مگر کوئی اسے نالی سے باہر نہیں نکال رہا۔ مولانا نے دیکھتے ہی تانگہ رکوایا، جا کر بچّے کو نکالا، اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے نکالے اور پتہ پوچھ کر ماں باپ کے پاس چھوڑ آئے۔'' (٧٦)

حالی کے اخلاق و کردار کا ذِکر کرتے ہوئے تقی عابدی نے انیسؔ کا یہ شعر لکھا ہے:

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

اس کے بعد تقی عابدی اپنی رائے میں کو بچوں کا دوست، دردمندوں کا ہمدرد اور حاجت مندوں کا سہارا قرار دینے کے ساتھ ہی ذاتی مشکلات میں قناعت پسند بھی کہتے ہیں۔ پھر خواجہ کی خوبیوں سے متعلق دوسرے اکابرین کی آراء بھی پیش کرتے ہیں جن میں مولانا ابو الکلام آزاد، خواجہ غلام الحسنین، مولوی عبدالحق، نواب عمادالملک وغیرہ شامل ہیں۔

......" بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالؔی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذِکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے دردِ دِل۔ یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔"(۷۷)

آگے چل کر تقی عابدی نے حالؔی کی انسان دوستی کا ذکر کرنے کے بعد ان کے مذہب سے متعلق بھی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ حالی عقیدے کے لحاظ سے حنفی سنی مسلمان تھے مگر ان کی بیگم شیعہ عقیدہ کی تھیں۔ اس کے باوجود دونوں میں کبھی اختلاف پیش نہیں آیا۔ حالی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ذات سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار اُنہوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے اور رسولِ پاک سے انکی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تو حالؔی مرحوم کی نعتیں ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے حالی کی قناعت پسندی، مسافرت، شمس العلماء کا خطاب اور خوراک و پوشاک سے متعلق بھی کافی تفصیل لکھی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کا عکس اُبھرتا ہے۔

حالؔی کی شاعری کے آغاز سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں کہ ''ہمیں تحقیق وتلاش کے باوجود یہ صحیح طور معلوم نہ ہو سکا کہ حالؔی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے۔''

وہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۱ء میں جب حالی دوسری بار یعنی ملازمت کی خاطر دِلّی آئے تو شعر وسخن کی محفلوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ گویا وہ بچپن سے شاعری کرنے لگے تھے تو اب ان کی شہرت ہونے لگی تھی۔ ورنہ نو آموز شعرا کوتو اتنی بڑی محافل میں کوئی کم ہی بُلا تا ہے۔ حالؔی نے خود مرزا غالبؔ سے مُلا قاتوں اور کلام دکھانے کا ذِکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۲۳،۲۴ سال کی عمر میں شاعری کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر تقی کے مطابق حالی کا شعر پڑھنے کا انداز فطری تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

مضمون کے آخر میں مصنف نے حالؔی کی بیماری کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالؔی کو پان اور تمباکو کی عادت تھی جو ان کی بیماری کا باعث بنے۔ تقریباً جواں عمری میں ہی انھیں بواسیر کی تکلیف ہوگئی تھی۔ نزلہ، کھانسی اور دمہ کی تکلیف بھی اکثر رہتی تھی۔ نظر کی کمزوری بھی ان کے کام میں رکاوٹ بنتی رہی مگر انہوں نے علاج معالجہ اور عینک کا استعمال کرکے اپنا کام جاری رکھا۔ مگر سب سے زیادہ جس بیماری نے پریشان کیا وہ ضعفِ دماغ (dementia) تھی۔

آخر یکم جنوری ۱۹۱۵ء کی پہلی رات قریب ایک بجے حالؔی نے اس دُنیا کو خیر باد کہا اور اسی روز ظہر کے وقت ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اِناللہ و اِنا اِلیہ راجعون۔ ان کی قبر بوعلی قلندر کی

درگاہ میں بنائی گئی۔

اس مضمون پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کس قدر محنت کی ہوگی اس کا اندازہ ہمیں اُن اقتباسات سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے جا بجا تحریر کئے ہیں۔ جہاں کہیں ضرورت پڑی ہے انہوں نے راوی سے اختلاف بھی ظاہر کیا ہے اور اپنی رائے بھی رقم کی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حالؔی شناسی کے میدان میں تقی عابدی کی یہ کوشش اب تک کی سب سے بڑی کوشش ہے۔

مسدس حالی کا اجمالی تجزیہ

''مسدس حالی'' کی تصنیف ۱۸۷۹ء میں عمل میں آئی۔ جیسا کہ مسدس میں ہوتا ہے، یہاں بھی مختلف موضوعات کو مختلف شعری بندوں میں پیش کر کے زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست کیا گیا ہے۔ بقول تقی عابدی:

> ''مسدس ایک ایسا فورم ہے جو مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے لئے نہایت موزوں ہے۔ مسدس کی زبان سلیس، صاف، شگفتہ اور سادہ ہے۔ اس میں عامی سے عالم تک کے لئے سہولتیں موجود ہیں۔ تشبیہات، استعارات، اور محاسن زبان کا ہجوم یہاں نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا گورکھ دھندہ بھی یہاں نہیں۔ یہاں رمزیت اور تخیل کی خاکہ نگاری کی جگہ اصلیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔'' (۷۸)

آگے چل کر مسدس حالیؔ کا ذِکر کرتے ہوئے تقی عابدی نے لکھا ہے کہ حالیؔ کے مسدس کی جان ان کا فطری انداز بیان ہے جو سیدھا سادھا ہے مگر اس میں زور جوش اور روانی ہے یہ سادہ سلیس اور نرم الفاظ دل و دماغ میں اُتر جاتے ہیں کیوں کہ ان میں صداقت اور حقیقت ہے ۔ ساتھ ہی یہ بھی ذِکر کیا گیا ہے کہ جہاں مسدس حالیؔ کی عوام و خواص میں زبردست پذیرائی ہوئی وہیں مخالفوں کا بھی ایک سیلاب امنڈ آیا یہاں تک کہ کسی نے اس کے جواب میں بھی ایک مسدس لکھ ڈالی ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگوں میں مقبول نہ ہوسکی ۔ بلکہ تقی عابدی تو یہاں تک کہہ گئے کہ:

> ''سچ تو یہ ہے کہ پانی پت کے تاریخی میدان کے سپوت حالیؔ نے جو ادبی جنگ جیتی اُسے پانی پت کی چوتھی جنگ کہنا چاہئے جس نے ادبی دُنیا میں انقلاب برپا کردیا۔''(۷۹)

عرب میں زمانۂ جاہلیت کی منظرکشی دیکھنے لائق ہے۔اس ضمن میں چند اشعار بلا ترتیب ملاحظہ ہوں:

عرب جس کا چرچہ ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں

نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آب باراں پہ تھی زندگانی
قبیلے قبیلے کا اک بُت جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ (۸۰)

پھراسی سرزمیں پر اللہ کے رسول ﷺ کی آمد کا ذِکر یوں کرتے ہیں:

ہوئی پہلوِ آمنہ سے ہویدہ
دُعائے خلیل اور نوید مسیحا
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا سے
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا(۸۱)

آگے اپنی قوم کی جہالت کا ذِکر بھی کیا ہے:

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دُعائیں (۸۲)

اُدھر فرمانِ نبی ﷺ کا ذِکر بھی کتنی آسان زبان میں کیا ہے:

وہ جو حق سے اپنے لئے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لئے چاہتے ہیں
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر (۸۳)

ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں:

''حالی نے مدوجزر اسلام مسدس میں تقریباً چونسٹھ بند یعنی دوسو اشعار میں مسلمانوں کی ترقی، ان کی عظمت، شان وشوکت، علم وحکمت، اخلاق و کردار، اسلامی اقدار اور دوسرے ادیان سے صلح آشتی کے خوبصورت اشعار سے جو صحیفہ تشکیل دیا ہے وہ اس نظم کا قصیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مبالغے اور مدح سرائی نہیں بلکہ سچائی کی قدر دانی اور اعتراف شامل ہے۔ مسدس کے اس حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ صدرِ اسلام اور اگلے زمانے کے مسلمان

خواہ عوام ہوں یا حکمران اخلاقِ انسانی اور قانونِ اسلامی کے پابند
تھے۔"(۸۴)

امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت
فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسے
زمانے میں ماجائی بہنیں ہوں جیسے(۸۵)

آگے چل کر شاعر نے مسلمانانِ برصغیر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن کی پانچ سو سالہ حکومت کے چند سالوں بعد کسمپرسی کا یہ حال ہے:

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر
کہ کل فخر تھا جن سے اہلِ جہاں کو
لگا ان سے عیب آج ہندوستاں کو
رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی (۸۶)

مسلمانوں کی ایک لاعلاج بیماری جس کا ذِکر حاؔلی مرحوم نے ایک صدی پہلے کیا تھا آج بھی موجود ہے اور بدقسمتی سے اس کی علامات دن بدن نمایاں ہوتی چلی آ رہی ہیں اور وہ ہے نفاق :

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی
جگر جس سے شق ہو وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارثِ انبیاً اب (۸۷)

حاؔلی کو اُمت کی پسماندگی کے پیچھے شاعر لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان پر زبردست نکتہ چینی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر لوگ حاؔلی کے مخالف ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ حاؔلی نے پہلے تو اچھے اور بُرے کلام میں بھی امتیاز نہیں کیا:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں "علمِ ادب" ہے ہمارا (۸۸)

بہر حال آگے چل کر انھوں نے فحش شاعری کی نشاندہی بھی کی ہے۔انھوں نے خود کو اشراف کہنے والے خاندانوں کی عیش پرستی اور گمراہی نیز ان کے بچوں کی تعلیم سے دوری اور بدتہذیبی کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔پھر مشورہ دیتے ہیں کہ انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کو ترقی کے مواقع میسّر کرائے ہیں جن کا فائدہ لے کر مسلمانوں کو اپنی حالت کو خود درست کرنا چاہیئے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
مگر ایک تم ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادہ کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل (۸۹)

حالؔی نے مسدس کے چھے سال بعد ضمیمہ اور عرضِ حال بحضور سرورِ کائنات ﷺ تصنیف کیا۔اس کا مقصد ملت اسلامیہ کی بیماری کی پرکھ کے بعد اس کا علاج پیش کرنا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں:

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی
دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر
فقیری کو ذِلت کی شہرت سے بہتر
سر ان کا نہیں دربدر جھکنے والا
وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا (۹۰)

آخر میں حالؔی نے اُس محنت کش طبقے کا ذِکر کیا ہے جس کی بدولت عام انسان کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ان کی تمام اُمیدیں اور حسرتیں ان سے ہیں جن کے بارے میں کہتے ہیں:

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے
شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
یہ چلتی ہے گاڑی انھیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے گر شرف ہے آدمی کو

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی (۹۱)

مسدس پر اکابرین کے تاثرات

اس مضمون میں ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اُس زمانے کے چند علمائے کرام کے تاثرات درج کئے ہیں جن میں سر سید احمد خان، شیخ محمد اکرام، علامہ اقبال، اور سید سلیمان ندوی شامل ہیں۔ سر سید اپنے سفر نامہ پنجاب مورخہ ۱۸۸٦ء میں لکھتے ہیں:

''امرتسر کے مسلمانوں نے ایک تھیٹر کا منظر پیش کیا جس کا پردہ اٹھنے پر ایک کشتی جس کے لوگ سو رہے تھے، طوفان میں جکڑ چکے تھے اور وہ ڈوب رہے تھے۔ وہاں حالی کے مسدس کے بند کوئی پڑھ رہا تھا اور لوگ رو رہے تھے۔'' (۹۲)

اقبال کی زباں میں حالی میرِ کارواں ہے کیوں کہ اس کی ذات میں وہ تینوں اوصاف موجود ہیں جو موصوف نے اپنے اس شعر میں لازم قرار دئے ہیں ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے (۹۳)

سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے:

''ہماری زبان کی نظم ونثر میں جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں قبولِ عام اور حیات دوام اگر کسی کو نصیب ہوئی، تو وہ مولانا حالؔی کا مسدس ہے۔'' (۹۴)

مزید کچھ ایک ناقدین کے تاثرات بھی ملاحظہ کیجئے:

عبدالماجد دریابادی:

''اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا، اس شان کا، اس جمال کا اور اس کمال کا اُردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟ جب اپنے 'آج' کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھئے کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے:

کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے
کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
جو میلوں میں جائیں تو لچ پن دکھائیں
جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں......'' (۹۵)

عبدالرحمٰن خاں شیروانی:

''ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ جدید جن اسباب انقلاب کا منت پذیر ہے ان میں مسدس حالؔی بھی ہے۔ مجھ کو وہ وقت خوب یاد ہے جب یہ مسدس پہلی بار شائع ہوا تھا، مداح وذم کا ایک طوفان اُٹھا۔'' (۹۶)

مولوی عبدالحق:

''اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں ۔ مسدس اس کسوٹی پر پورا اُترا۔ ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ بار بار چھپا اور تنی بار چھپا کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو۔''(۹۷)

سید سر راس مسعود:

''میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر مولانا حالیؔ مرحوم وہ بیش بہا ادبی خدمت اُردو کی نہ کرتے جو اُنہوں نے کی، تو جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے وہ ختم ہو جاتی اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوتی جس کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہم یورپ کی شاعری کا مقابلہ کر سکتے۔''(۹۸)

خواجہ غلام السیدین:

''آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گامزن ہیں ، حالیؔ کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر ان کی راہ نمائی کرتی ہے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے:

نگہ بلند ، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے '' (۹۹)

اسی طرح عابد حسین ، رام بابو سکسینہ، رشید احمد صدیقی ، صالحہ عابد حسین، سیّدہ سیدین حمید ، مالک رام ، آل احمد سرور، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ،جلیل قدوائی ، ڈاکٹر گراہم بیلی جیسی نامور ادبی شخصیتوں کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مسدس حالیؔ

کے بارے میں قارئین کوقطعی جانکاری ہی بہم نہیں پہنچائی بلکہ مسدس کے لئے ان کی دلچسپی میں مذید اضافہ بھی کر دیا ہے۔

اقتباسِ مسدس

''مُسدسِ حالی'' ایک طویل نظم ہے جو [۱۳۷۴] اشعار پر مشتمل ہے۔ مگر یہاں تقی عابدی نے قائین کی دلچسپی کے لئے کئی مخصوص بند درج کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دراصل مسدس میں کِن کِن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہاں ہم ان میں سے چند ایک بند بطور نمونہ قلمبند کر رہے ہیں:

مسدس کے آغاز میں مسلمان قوم کی پسماندگی کا ذِکر ہے اور اسے ''ہذیان'' کی بیماری کا نام دیا گیا ہے۔ [ہذیان بخار کی حالت میں بے معنی گفتگو کو کہتے ہیں]۔ پھر دورِ جاہلیت اور ولادت رسول پاکؐ اور مذید سیرت نبیؐ سے متعلق کئی بند تحریر ہیں۔ نمونے کے لئے ایک بند یہاں درج ہے:

''خطا کار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا (۱۰۰)

آگے پیغامِ اسلام، تعلیم وتربیت کلمہ گویان، قرونِ اولا کے مسلمان، صدرِ اسلام اور احوال دنیا، مسلمانوں کی ترقی، علم وحکمت کا گہوارا، نیز علم فلکیات اور رسدگاہیں جیسے موضوعات سے متعلق بند تحریر کئے گئے ہیں۔ ہر ایک بند میں خوبصورت منظرکشی کی گئی ہے۔ مثلاً ہمارے شعرا میں سے بُرا شعر کہنے والوں کی تو خوب خبر لی گئی ہے:

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے

عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے

تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے

مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے (۱۰۱)

اسی طرح قوم کے علمائے کرام کے بارے میں لکھتے ہیں:

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے وہ لے جاکے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

رہا کوئی اُمت کا ملجا نہ ماوا

نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ مُلا

انہیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت
انہیں کے ہے قبضہ میں بندوں کی قسمت (۱۰۲)

حالی کہیں اہلِ اسلام کے زوال پر رنجیدہ ہوتے ہیں، کہیں مسلمانانِ ہند کے نکمّہ پن کی شکایت کرتے ہیں اور ان کی اخلاقی کمزوریوں کا بیان کرتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں میں نشے کی لت سے انھیں پریشانی ہوتی ہے پھر بھی نئی نسل سے انقلاب کی توقع رکھتے ہیں۔ پھر نصیحت کرتے ہیں کہ بھائی ترقی کا عزم کرو، حرکت میں برکت ہوتی ہے، جوانوں کو محنت کرنی چاہئے اور علم حاصل کرنا ان کی زندگی کا مقصد ہونا چاہئے۔ آخر میں حضورِ خداوندی میں مناجات پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

الٰہی بحقِ رسولِ تہامی
ہر اک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
طفیل اس کا اور اس کی عزت کا یا رب
پکڑ ہاتھ جلد اس کی اُمت کا یا رب
انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے (۱۰۳)

مسدس

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے مسدس حالی کا تفصیلی تعارف کرانے کے بعد خود اسی مسدس کو قارئین کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا ہے گویا ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا'' قارئین اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لیں کہ جس مسدس کے بارے میں خود انھوں نے بہت ستائش کی اور دوسروں کے تاثرات بھی رکھے وہ چیز کیا ہے۔ اس کے آغاز میں ایک رُباعی لکھی ہے:

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اصل مسدس '' مُسدسِ حالی'' کے صفحہ [۱۵۷] سے شروع ہو کر صفحہ [۲۶۰] تک موجود ہے۔ اس سے آگے حضورِ رسالت مآب میں ''عرضِ حال'' درج ہے جس کے الفاظ نہایت خوبصورت ہیں:

اے خاصہ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھئی جدا ہے(۱۰۴)

''عرض حال'' کے آخر میں حالی یوں عرض گذار ہیں:

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ اور زیادہ
اخبار میں '' الطّالحُ لِی '' ہم نے سنا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے (۱۰۵)

ج۔ کلیات حالؔی

مولانا الطاف حسین حالؔی اردو ادب میں کئی جہتوں سے متعارف اور مشہور ہیں۔ان کی ادبی خدمات پر ہر دور اور ہر زمانے میں لکھا گیا ہے،آج بھی ان پر کام ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ان کے فکر وفن پر اہل قلم خامہ فرسائی کرتے رہیں گے۔کسی بھی شخصیت کے نئے پہلو پر گفتگو کرنے یا لکھنے میں صاحب قلم کی دلچسپی ،اس کے ذہن کی رسائی ،اور کمال فکر کے ساتھ ساتھ طریقہ کار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ موصوف کے کن گوشوں کو اپنی تحریر میں سمونا چاہتا ہے؟اور اس میں وہ کتنا کامیاب رہا؟نیز کونسا پہلو تشنہ رہ گیا ؟اور اسے مزید بہتر بنانے کی کیا صورت ہوسکتی تھی ؟موجودہ عہد میں حالی کی شعری خدمات کو یکجا کرنے والوں میں عصر حاضر کا ایک بڑا نام سید تقی علی عابدی کا ہے۔جنہوں نے خواجہ الطاف حسین کی کلیات کو جدید انداز میں سجایا،انوکھے طریقے سے سنوارا اور اسے دستاویزی شکل دینے کی مبارک سعی کی ہے ۔اس اہم تحقیقی تصنیف کا نام ’’کلیات حالی‘‘ ہے۔حالی کی عکسی تحریریں،تصویر اور حالی کا مسودہ اس کتاب کا اہم حصہ ہیں اور اس کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہیں۔یہ کتاب یقیناً حالی فہمی اور شخصیت شناسی میں بے حد معاون اور سودمند ہے۔تقی عابدی کی اس تحقیق میں کائنات حالی کی مختلف جہتیں اور شکلیں ہیں جو ارباب حل وعقد کے لیے نایاب تحفہ ،قندشیریں اور ایک لاجواب عطیہ ہیں۔حالؔی ترقی پسند شاعر،اردو تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے روح رواں بھی ہیں۔شعری تنقید میں حالی کی تصنیف مقدمہ شعروشاعری کو اولیت حاصل ہے۔نثری

نمونے حیات جاوید، یادگار غالب اور حیات سعدی اردو ادب میں تاریخی اور سوانحی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ حالؔی کی شعری کائنات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار یادگار چھوڑے ہیں۔ اسی وجہ سے حالؔی آج اردو شعر وادب میں جدت پسند، پرمقصد شاعر اور زندگی کی قدروں کو شعری جامہ پہنانے والے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالؔی کے تمام ادبی کارنامے کو اگر مرثیۂ غالب سے یادگار غالب تک شعری، علمی، تہذیبی اور تنقیدی قدروں کے پس منظر میں دیکھیں تو یہ احساس ہوگا کہ حیات جاوید، مسدس، حقوق نسواں اور اولاد کی تربیت کے ساتھ ساتھ علی گڑھ تحریک کی نظموں سے انہوں نے برصغیر کی مردہ اور بے بس قوم اور ملت اسلامیہ کے لاغر جسم میں نئی جان پھونکنے کی کوشش کی اور قوم مسلم کے تعلیمی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور ملی شعور کو بیدار کیا۔ انہیں کے طے کردہ خطوط پر چل کر ملت اسلامیہ کے عظیم سپہ سالار تیار ہوئے جن میں اقبالؔ، ابوالکلام آزادؔ، سر راس مسعود، ظفر الحسن، عبدالحق اور غلام السیدین سرفہرست ہیں جنہوں نے ایک پسماندہ اور بے حس ملت کو دوسری ترقی یافتہ اقوام کی صفوں میں لا کھڑا کیا جسے ادبی اور فکری سطح پر یقیناً اہل فکر ونظر بہت اہم کامیابی مانتے ہیں کیوں کہ بعد میں اسی فکر وسوچ نے قوم کی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حالؔی کا کلام قومی، ادبی اور ملی سرمایہ ہے۔ لہٰذا جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔

حآلی کا وہ شعری سرمایہ جو دہلی اور لاہور میں مختلف اوقات میں سامنے آیا ان میں غزلیں،نظمیں،قطعات،رباعیات اوربعض شخصی مرثیوں سے اردوادب کے قارئین بہت حد تک واقف ہیں جنہیں حآلی مشاعروں ،ادبی محفلوں اورجلسوں میں پیش کرتے تھے۔گا ہے بگاہے حآلی کے کلام کے نمونے اس دور کے ادبی رسائل،تذکروں اوراخبارات میں بھی شائع ہوتے رہےاوربعض نظمیں مختلف مقامات سے شائع ہوتی رہیں جن میں مناجات بیوہ،مثنوی حقوق اولاد،شکوۂ ہند،تحفۃ الاخوان،فلسفۂ ترقی اور چپ کی داد شامل ہیں۔اس سب کے باوجود حآلی کی زندگی میں مسدس حالی اور تین مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔اس طرف تقی عابدی توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مسدس حالی:1879ء ضمیمہ مسدس حالی:1886ء مجموعہ نظم حالی:1890ء میں اور دیوان حالی معہ مقدمہ شعروشاعری1893ء میں۔حالی نے اپنی زندگی کے آخری سال یعنی1914 ء میں اپنی فارسی اورعربی نظم ونثر کا مجموعہ''ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی''مرتب کر کے شائع کیا لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی چناں چہ ضمیمہ تو چھپ گیا مگر کلیات کی ترتیب اور طباعت نہ ہوسکی۔حالی کے انتقال کے بعد اگرچہ حالی کے نواسے نے حالی پبلشنگ ہاؤس سے حالی کی مختلف اہم تصانیف کوعمدہ طریقے پر شائع کیا لیکن کلیات نظم حالی کی طباعت میں مشکلات اس لیے رہیں کہ حالی کی بعض نظموں کے حقوق اشاعت بعض قومی اداروں اورتاجروں کو حآلی نے دے رکھے تھے اور وہ ان نظموں کی کلیات میں شمولیت پر

راضی نہ تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے مختلف مقامات اور مختلف چھاپہ خانوں سے حآلی کی تصانیف جن میں علاحدہ علاحدہ رباعیات حالی، قطعات حالی اور حالی کی دیگر نظمیں شائع ہوتی رہیں''۔(۱۰۶)

مذکورہ بالا سطور حالی کی شعری تصنیفات سے واقفیت کے لیے کافی ہیں۔ حالی کے بعد کن لوگوں نے اس طرف توجہ دی؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ اس حوالے سے تخلیقات حالی کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ 1922 میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حآلی کا غیر مدون کلام یعنی باقیات حالی کا مجموعہ ''جواہرات حالی'' کے نام سے شائع کیا۔ جواہرات حالی کی قدردانی سے متاثر ہوکر اسماعیل پانی پتی نے ''کلیات نظم حالی'' کو چار جلدوں میں شائع کرنے کے لیے ہمت یکجا کی گو یہ کام بہت مشکل تھا پھر بھی انہوں نے پہلی اور دوسری جلد میں ''دیوان حالی'' مطبوعہ 1893 اور جواہرات حالی 1922 میں شائع شدہ کلام کو اصناف کی ترتیب سے کلیات 1924 میں پیش کیا۔ مگر سوم اور چہارم کی طباعت سے اردو دنیا محروم رہی۔ ان کے بعد تقریباً چالیس سال بعد افتخار احمد صدیقی نے دو جلدوں میں کلیات نظم حالی کے عنوان سے حالی کے شعری سرمائے کو مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا جو (بقول تقی عابدی) حالی کے کلام کے موجودہ نسخوں میں معتبر کلیات ہے۔

تقی عابدی حالی پر اپنی تصنیفات کی وجہ تسمیہ بیان کرتے رقم طراز ہیں۔

''حالی کے کلام کی کمیابی اور پرانی کتابت کی غلطیوں سے بھرے ہوئے نسخوں کی طباعت

حالی شناسی میں خلل انداز ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چالیس سال میں حالی پر کوئی کارآمد تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوسکا۔ کچھ عمدہ مقالے، تبصرے اور تجزیے مقدمہ شعر و شاعری پر ہر دور میں ہوتے رہے اور یہ صدائیں بھی دو تین دہائیوں سے خاموش ہوگئیں۔ راقم نے حالی شناسی کے فروغ کے لیے حالؔی کے کلام کو صرف نصاب میں شامل ضروری نہ جانا بلکہ عوام میں بھی اس کے چرچے کو لازم جان کر اس کی فراہمی کا منصوبہ بنایا جس میں اکیسویں صدی کے اردو ماحول میں حالی کا کلام جدید علمی، تحقیقی اور تنقیدی زاویوں پر استوار کر کے تجزیے اور تشریح کے ساتھ ایسی ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے کہ عالم اور عامی اس سے مستفید ہوسکیں۔ چناں چہ حالی کے کلام کے ہر حصے پر دقیق دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی آبیاری سے گلشن تجزیے اور تشریح کو سنوارا۔ کلیات حالی دو جلدوں میں، حالی فہمی، مسدس حالی، حالی کی نظمیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کی غزلیں، حالی کی نظمیں، حالی کے شخصی مرثیے، قصائد حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، بچوں کے حالی اور دیوان حالی فارسی اسی گلشن کے پھول ہیں جن کو جدا جدا گل دانوں میں سجایا گیا ہے۔ حالی کے منظوم کلام کی تشریح اور تدوین کے لیے مطبوعہ نسخوں سے استفادہ کیا گیا کیوں کہ حالی کا قلمی غیر مطبوعہ کلام سب کچھ فسادات میں ضائع ہوگیا''۔ (۱۰۷)

مذکورہ اقتباس میں تقی عابدی نے کائنات حالی میں درپیش دشواریوں کے ساتھ اپنی کامیابیوں کا بھی برملا اظہار کیا ہے اور کیوں نہ کریں، اس اظہار کا انہیں حق حاصل ہے۔ قلمی

نسخوں کی عدم دستیابی ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے لیکن موصوف نے ان سب دشواریوں کے باجود حالؔی کی تمام شعری تخلیقات پر کھل کر بحث کرتے ہوئے اردو ادب کے اسکالرس کے لیے ایک نیا گوشہ اجاگر کیا ہے تا کہ آنے والے دنوں میں حالؔی مختلف حوالوں سے دانشوروں کے بحث کا موضوع بنے۔ حالی کے متروکہ قلمی ذخائر کچھ تو ناقدری کی وجہ سے اور کچھ زمانے کی ستم ظریفی کی وجہ سے بھی دسترس سے باہر رہے۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ حالی کی پوتی مشتاق فاطمہ کی صاحبزادی صالحہ عابد حسین اپنے مکتوب بنام ڈاکٹر رفیق حسین مرتب مقدمہ شعر وشاعری میں لکھتی ہیں:

> ''فسادات کے بعد حالی مسلم ہائی اسکول جو حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ان کی یادگار کے طور پر قائم کیا تھا ختم کرکے اسے جین ہائر سکنڈری اسکول بنادیا گیا تھا جواب ڈگری کالج ہوگیا ہے۔ان کا مکان کسٹوڈین کے قبضے میں گیا۔کتب خانہ ان کا تو پہلے ہی اسکول کودے دیا گیا تھا۔میرے والد اور چچا کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں نادر اور بیش بہا کتابیں تھیں وہ بھی فسادات کی نذر رہوا''۔(۱۰۸)

کلیات حالی کی تدوین وترتیب میں تقی عابدی نے اصول متن کا کہاں تک خیال رکھاہے؟اس حوالے سے یہ واضح ہوجائے کہ حالؔی کے مطبوعہ کلام کے کئی نمونے آج بھی موجود ہیں۔تقی عابدی نے دستیاب نسخوں میں اختلاف کی صورت میں حالؔی کی زندگی میں

شائع شدہ کلام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ دیوان حالی، مسدس حالی، مجموعہ نظم حالی، ضمیمۂ کلیات حالی اور مختلف معروف نظمیں جو شائع ہو چکی تھیں ان سب سے تقی عابدی نے استفادہ کیا ہے۔ ''جو ہرات حالی'' اور دیگر نسخوں کو دوسری کتابوں کے حوالے سے تقی عابدی نے دیکھا ہے۔ حالؔی کے قدیم کلیات میں جو مسائل تھے، جہاں کئی الفاظ ایک ساتھ ضم کر کے لکھے جاتے تھے اور بعض نسخوں میں یاں، واں، ترے کو، مرے کو، یہاں، وہاں، تیرے، میرے درج تھا جس سے شعر وزن سے گر گیا تھا۔ مگر تقی عابدی نے ان نقائص سے اپنی کلیات کو دور کرنے کے لیے کلیات نظم حالی کی دونوں جلدوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ تقی عابدی نے ڈاکٹر افتخار صدیقی کے شائع کردہ کلیات جو کہ موجودہ وقت میں تمام نسخوں سے عمدہ اور نقائص سے پاک ہے، سے استفادہ کے ساتھ ساتھ ان کے بعض حاشیوں کو بھی شامل کتاب کیا ہے اور اس پر (اص) کی علامت کا نشان رکھا ہے۔ تقی عابدی نے حالی کے تمام حاشیوں کو درج کیا ہے جنہیں بعض ناشرین نے اضافی سمجھ کر نکال دیا تھا۔ چناں چہ موصوف اپنی تحقیقی دستاویز میں احتیاطی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حالی وہ ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے روایتی اور جدید شاعری کی ہے۔ جہاں تک حالی کی غزلیات کا تعلق ہے انہوں نے قدیم غزلوں کے نمونۂ کلام کو اپنے دیوان میں رکھا تا کہ قدیم اور جدید کا فرق ظاہر ہو۔ چناں چہ قدیم روایتی غزلوں پر ''ق'' کا نشان دیوان میں لگا دیا جس کو کوئی ترتیب

اور تدوین کرنے والوں نے چنداں اہمیت نہ دی۔اس کلیات میں ڈاکٹر افتخار صدیقی کے نسخے کی روش اختیار کی گئی ہے۔تاکہ آیندہ قدیم اور جدید غزلیات میں خلط ملط نہ ہو چناں چہ قدیم اور جدید غزلیات علاحدہ علاحدہ ترتیب دی گئی ہیں۔ناظرین حالی کی قدیم عشقیہ شاعری اور جدید مقصدی شاعری کو ان علامات کی روشنی میں دیکھ سکتے،، (۱۰۹)

دورقدیم (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۴ء) کی غزلوں کی تعداد تیس (۳۰) ہے جن میں کل (۳۰۸) اشعار ہیں۔ظاہر ان سب کو یہاں پیش کرنا ممکن نہیں اس لیے متفرق غزلوں کے چند اشعار دیکھیں۔

(۱) خلوت میں تری صوفی گرنورصفا ہوتا
توسب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا
کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

(۲) پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزبان کوئی مہماں نہ تھا
ہم کو بہار میں بھی سرگلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

(۳) رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا

(۴) اغماض چلتے وقت مروت سے دورتھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا
تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخل ایمن وہر سنگ طور تھا

(۵) دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

(۶) مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گیے کہ حوصلہ ضبط راز تھا
چہرے سے اپنے شورش پنہاں عیاں ہے اب

دورجدید(۱۸۴۷ء تا ۱۸۹۳ء) کی غزلوں کی کل تعداد(۸۶)ہیں جن میں (۸۶۳)اشعار ملتے ہیں۔ان غزلوں کے چنداشعارنمونے کےطور پرپیش ہیں۔

(۱) قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندہ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

(۲) اے عشق تونے اکثر قوموں کوکھاکے چھوڑا
جس گھر سے سراٹھایا اس کو بٹھاکے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گراکے چھوڑا

(۳) جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوابھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے زندگی کا بس اس کا چرچانہ کیجیے گا

(۴) معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ توبتائیں حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
اے بانگ طبل شاہی دن ہوگیا جب آخر
خواب گراں سے تونے ناحق ہمیں جگایا

(۵) نفس دعوئ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثرابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

اخیر دور کی غزلیں (۱۸۹۳ء تا ۱۹۱۴ء) اخیر دور کے غزلوں کی تعداد سات ہے۔ جن میں کل (۹۰) اشعار شامل ہیں۔

(۱) کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں
وہ دریائے معنی کی طغیانیاں
کہاں وہ طبیعت کی رنگینیاں
وہ بزم سخن میں گل افشانیاں

(۲) نفس کی فرماں روائی ہوچکی
خود پسندی خود نمائی ہوچکی
اب ہیں پیری کی عبودیت کے دن
بس جوانی کی خدائی ہوچکی

(۳) تیر پیہم لگائے جاتا ہے
نظروں نظروں میں کھائے جاتاہ ے
دیکھیے اور کیا دکھائے فلک
ابھی آنکھیں دکھائے جاتا ہے

مذکورہ اشعار میں حالؔی کی نظمیں قومی وملی اہمیت کی حامل ہیں باوجود اس کے کہ حالی کی قدیم غزلیں ان کے شعری شعور اور فن کی نقیب تھیں۔ جن میں تخیل کی روایتی چاشنی نے دوآتشہ کر دیا تھا۔ حالؔی شیخ سعدی، میر، غالبؔ، انیسؔ اور شیفتہ سے متاثر تھے جس کی جھلک ان کی غزلوں میں عیاں اور آشکارہ ہے۔

حالؔی سخن میں شیفتؔہ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حالی کی قدیم غزلوں کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ روایتی موضوعات یعنی معاملہ بندی، خمریات، تصوف اور فلسفہ وغیرہ سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے کیوں کہ ایسے اشعار ان کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے۔ بقول تقی عابدی

> ''یہ اور بات ہے کہ اگر حالی نے انہیں نکال دیا ہو کیونکہ اس طرح کے مضامین تمام تر اساتذہ شعروں میں باندھتے تھے جن سے حالی مستفید تھے۔ حالی یقیناً میر کی طرح حساس تھے لیکن میر کی طرح اسیر غم نہ تھے بلکہ وہ سحر کے منتظر تھے''۔(۱۱۰)

دل پر دردسے کچھ کام لوں گا
اگرفرصت ملی مجھ کو جہاں میں

تقی عابدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تینوں ادوار کی غزلیں مع حل لغات ومعانی پیش

کیا ہے۔اس میں حالی فہمی کے اسکالرس کے لیے کافی کچھ ہے ساتھ ہی جدید نسل کے لیے بھی انمول تحفہ ہے۔کیوں کہ کلاسیکل اردو اشعار کی قرأت بھی سخت مسائل سے دوچار ہے۔اس لیے موجودہ وقت کے محققین اس طرف سنجیدگی سے غور وفکر کریں تا کہ اردو کے کلاسیکل سرمایے تک جدید نسل کی رسائی آسان ہو سکے۔اس پس منظر میں تقی عابدی کی تحقیق نسل نو کے لیے امید کی کرن ہے۔کیوں کہ قرأت کے بعد ہی افہام وتفہیم کا مرحلہ آتا ہے۔حالی کی غزلوں کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔یہ ایک نمایاں پہلو ہے۔اس سے صنف شعر کی مقصدیت کے ساتھ زمانے کے تقاضے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ شعروشاعری صرف تفنن طبع ہی نہیں بلکہ مقصدیت سے پر ہے۔حالی اپنی شعری تخلیقات میں پوری زندگی اسی طرف دھیان دیتے رہے جو بعد کے شعرا کے لیے مشعل راہ بھی بنے۔حالؔی خود لکھتے ہیں۔

''غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی،اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔۔مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔۔جس شاعری پہ ناز تھا اس سے شرم آنے لگی''۔(۱۱۱)

درحقیقت حالی کی غزل گوئی کا یہ سفر غم جاناں سے غم دوراں بنتا گیا۔حالی نے انسانی حقوق اور قدروں کو تہس نہس ہوتا دیکھا۔ان کے ذہن ودماغ میں شعور اور احساس کی جدید فضا پیدا ہوئی یہی وجہ ہے کہ حالی نے اپنی خداداد فنی قدرت کو برصغیر کے سماجی،اخلاقی،سیاسی

اوراقتصادی حالات پرمرکوزکرکے جہانِ شاعری کے دفتر کو رفارمر کا صحیفہ بنایا''اس طرح عشقیہ روداد کو درد گداز کے ہمراہ عزم واستقلال کی کیفیت میں پیش کرکے جدید غزل کا ڈول ڈالا''۔

اپنی رودادتھی جوعشق کا کرتے تھے بیاں
جوغزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اردو شعری صنف سخن میں سب سے مقبول اورمعروف صنف غزل ہے۔حالی بھی اسی سمت میں طبع آزمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن انہیں سماج اورقوم کی ذہنی اورفکری تبدیلی کا خیال آیا تو اس طرف انہوں نے کافی سنجیدگی سے غورکیا اورانہیں خیال آیا کہ لکیر کے فقیر قومی سطح پر کسی بھی طرح مناسب نہیں اس لیے اس صنف میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔واضح ہو کہ وہ دورہندوستانی سیاست اور زندگی کے مختلف شعبوں میں تبدیلی کا دور تھا۔ہر شعبے میں تبدیلی ہورہی تھی۔ہندوستانی سیاست عجیب وغریب کیفیات سے گزر رہی تھی اس لیے اردوادب میں بھی اس حوالے سے غوروفکر کی ضرورت تھی۔چناں چہ حالی اور دیگر دانشوروں کی مشترکہ کوششوں سے اردو کی شعری اصناف میں بھی تبدیلی آنے لگی۔محمد حسین آزاد کی جہد مسلسل سے انجمن پنجاب کا قیام لاہور میں ہو چکا تھا۔اس انجمن کے تحت مصرع طرح کے بجائے کسی منتخبہ موضوع پر شعری تخلیقات پیش کرنے کا تجربہ پہلی دفعہ اردوادب میں سامنے آیا۔پہلی بار غزل سے نظم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی

کوشش کی جارہی تھی گویا اردوشعری ادب ایک تجرباتی دور سے گزر رہا تھااور بہت حد تک وہ کامیاب بھی رہے۔دوسری طرف سرسید تحریک ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں ناکام قوم مسلم کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔سرسید تحریک دیگر تعلیمی اورسیاسی تبدیلیوں کے ساتھ اردوادب میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔اتفاق ایسا کہ ان کے ہم عصر اردوادیب بھی ان کی تحریک کوعملی جامہ پہناتے ہوئے نثری اورشعری اصناف تخلیق کررہے تھے جس کی وجہ سے اردوادب میں حقیقی زندگی کا تصورسامنے آیا۔نذیراحمد،شرر،سرشار اوررسواوغیرہ نے جہاں نثر میں حقیقی زندگی کانمونہ پیش کیا وہیں آزاد، حالی اوراکبرالہ آبادی وغیرہ نے شعری سرمائے میں تنوع پیدا کرتے ہوئے شاعری کوزندگی سے قریب کرنے میں نمایاں کردار کیا جو بعد کے ادیبوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔حالی اسی دوران مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کررہے تھے۔مسدس حالی دیکھ کرسرسید نے کہا تھا۔

> ''عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی ،جب تک ختم نہ ہوئی ،ہاتھ سے نہ چھوٹی اورجب ختم ہوئی تو افسوس ہواکہ کیوں ختم ہوگئی اگراس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قراردی جاوے تو بالکل بجا ہے۔کس صفائی اورخوبی اورروانی سے یہ نظم تحریرہوئی ہے،بیان سے باہرہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایساواقعی مضمون جومبالغہ،جھوٹ،تشبیہات دورازکارسے،جومایہ نازشعروشاعری ہے،بالکل

مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے پرادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھی ہے۔ (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اسے ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں''۔ (۱۱۲)

سرسید اس دور کے ادبی منظر نامے میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اس تبدیلی میں حالی ہمیشہ معاون رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسدس دیکھتے ہی بخشش کی امید کر بیٹھے کہ یہ مسدس ہمارے لیے توشۂ آخرت ہے۔ سرسید نے مسدس حالی سے صرف ذاتی طور پر استفادہ نہیں کیا بلکہ قوم سے درخواست کی کہ اس سے استفادہ کریں۔ مزید لکھتے ہیں

''خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ

بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں''۔(۱۱۳)

مذکورہ اقتباس سے اردو کے شعری صنف سخن میں مقصدیت اور تبدیلی کی ایک ایسی چھاپ ہے جس سے بعد کی نسلوں نے کافی استفادہ کیا۔اب شعری طبع آزمائی صرف خیالی نہیں بلکہ مقصد حیات ثابت ہوئی۔تقی عابدی نے مسدس حالی کی تفہیم آسان کرتے ہوئے ایک ضخیم مقدمہ لکھا ہے ۔جس میں مسدس حالی کی ادبی اور اصلاحی اہمیت افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں۔

''یہاں ہم مسدس حالی کی ادبی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اصلاحی نظم کی ہیئت مسدس اس لیے رکھی گئی ہے کہ یہاں مختلف موضوعات کو مختلف شعری بندوں میں پیش کرکے زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست کیا جاسکے۔مسدس مکالمہ نگاری،واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے لیے شعری ہیئتوں میں سب سے عمدہ ہیت یا فورم ہے۔مسدس کی زبان سلیس،صاف ،شگفتہ اور سادہ ہے۔اس میں عامی سے عالم تک کے لیے سہولتیں موجود ہیں۔تشبیہات،استعارات اور محاسن زبان کا ہجوم یہاں نہیں ہے۔صنائع اور بدائع کا گورکھ دھندہ بھی یہاں نہیں۔ یہاں رمزیت اور تخلیل کی خاکہ نگاری کی جگی اصلیت اور حقیقت

کا اظہار ہے۔اس نظم میں مغربی لٹریچر کی قدروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور عربی فارسی کی ادق تراکیب اور رنگین تقلید سے بھی اجتناب کیا گیا ہے۔نظم کے لہجے میں مبالغہ،جھوٹ،تصنع،بناوٹ،خوشامد اور چوما چاٹی کے مضامین کی آواز سنائی نہیں دیتی۔یہاں ادب برائے ہدف،شعر زندگی کی تفسیر اور شاعری کا مقصد حیات کی بالیدگی اور اخلاق کی بلندی کا ضامن ہے۔بعض افراد جن کی زبانوں پر شاعری کے عشقیہ مضامین کا چٹخارہ ہے وہ اسے بے مزہ پھیکی نظم یا قومی مرثیہ سمجھتے ہیں لیکن دردمندوں،اصلاح طلب شاعروں اور ترقی پسند ادیبوں نے اسے وقت کی راگنی سمجھا چناں چہ اپنے انداز میں اقبال لاہوری،اکبر آلہ آبادی،چکبست لکھنوی،جوش ملیح آبادی،نجم آفندی،سردار جعفری،فیض احمد فیض اور درجنوں دوسرے شاعروں نے اسے بہتی گنگا سمجھ کر اپنی اپنی زمینوں کو سیراب کیا''۔(۱۱۴)

مذکورہ اقتباس میں مسدس حالی کی ادبی واصلاحی پہلوؤں پر عالمانہ تجزیہ ہے۔مسدس حالی کی ادبی اہمیت جوں کی توں برقرار ہے۔مسدس حالی کی جان حالی کا انداز بیان ہے جو سیدھا اور سادہ ہے ۔پیچیدگی سے خالی ہے۔مگر اس میں زور جوش اور روانی ہے۔یہ سادہ،سلیس اور نرم الفاظ دل و دماغ میں اتر جاتے ہیں۔حالی ان مقامات پر جہاں وہ تاریخی واقعات کو ایک مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں وہاں ان کی شاعری سپاٹ اور بے رنگ

وخشک ہوجاتی ہے لیکن اس کے باوجود اثر پذیری رہتی ہے۔ ''بعض زبان دانوں نے مسدس میں موجود ادق غیر مانوس عربی فارسی اور ہندی الفاظ کو مسدس کی فصاحت کے خلاف بتا کر اسے پھیکے پکوان میں کنکر بتایا ہے''۔تقی عابدی زمانے کی تنگ نظری کا بھی گلہ کرتے ہیں ساتھ ہی اردو ادب میں ناقدری کی روایت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مسدس کے شائع ہونے پر ملک بھر میں موافقت اور مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حالؔی کے خلاف طرح طرح کے مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں۔مسدس کی نقالی کی گئی اور مسدس حالی کے جواب میں ''مسدس خالی'' شائع ہوا۔حالؔی کے خلاف اودھ پنچ لکھنو میں جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کے عنوانات پر یہ شعر لکھا جاتا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائے مال ہے

سچ تو یہ ہے کہ پانی پت کے تاریخی میدان کے سپوت حالؔی نے جو ادبی جنگ جیتی اسے پانی پت کی چوتھی جنگ کہنا چاہیے جس نے ادبی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔مسدس کے آغاز میں حالؔی نے خودفریبی کو انسان کی سب سے بڑی لاعلاج بیماری بتا کر کہا کہ اس کا علاج تو بقراط جیسے حکیم کے پاس بھی نہ تھا اگرچہ دنیا میں کوئی درد ایسا نہیں ''کہ جس کی دوا حق نے نہ کی ہو پیدا''

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

دوا اور پرہیز سے جی چرائیں
یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں" (۱۱۵)

اردوادب کا المیہ یہ رہا ہے کہ ہر دور میں محسن اردو کو نشانہ بنایا گیا ہے۔آج بھی یہی صورت حال ہے۔حالؔی، غالبؔ اور متعدد اد باوشعراز مانے کی تنگ نظری کا شکار ہوئے۔لیکن مخالفین کی بد قسمتی کہ آج بھی وہ زندہ ہیں ان کی تخلیقات زندہ ہیں۔اسی لیے تو حالؔی نے مسلمان قوم سے جوڑ کر ان کی غفلت سے پیدا شدہ صورت حال کا یوں جائزہ لیا ہے۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اورقوموں کی عزت پہ ہے کچھ

غفلت اور پس ماندگی اس حد تک ان کی فکر اور تہذیب کا حصہ بن چکی ہے کہ وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنا، ذلت وخواری کو اپنی تقدیر سمجھنا اوراسی پر مطمئن رہ کر ظاہری طور پر اسے دین داری سمجھتے ہیں۔

لیا عقل ودیں سے کچھ نہ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے

تقی عابدی کا مقدمہ اہل فکر ونظر کو دعوت مطالعہ پیش کرتا ہے جس میں مسدس حالی کی فکری وفنی، اصلاحی، تعلیمی، تنقیدی خوبی اور اس کا ادبی درس موجود ہے۔ حالؔی نے تقریباً ہر اخلاقی، سماجی، مذہبی، ثقافتی اور ملی کمزوری پر شعر لکھے ہیں جن میں خود پسندی، غرور وتکبر، حسد اور فتنہ گری، تعصب اور غیبت وغیرہ جن کا تفصیل سے ذکر ممکن نہیں اس لیے چند چیدہ چیدہ اشعار یا مصرع پیش ہے۔

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر
تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر
منہ اپنا ہوگو دین ودنیا میں کالا
نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا
مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے
نہ ملاؔ نہ صوفی کو اس سے حذر ہے
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی
نہیں دستیاب ایسے دو مسلماں
کہ ہو ایک دیکھ کر ایک شاداں
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے

وہ لے جاکے سب اہل مغرب نے جوڑے
نہیں راس یاں چار پیسے کسی کو
مبارک نہیں جیسے پرچیونٹی کو

حالی نے مسدس میں فلسفہ اور حکمت کا دباؤ اور ظاہری دکھاؤ کے ساتھ طبابت اور حکیموں کی نااہلی اور شاعروں کی جھوٹی اور چوماچاٹی کی شاعری پر کھل کر اعتراضات کیے ہیں۔ حالی کے مسدس کا یہی وہ حصہ ہے جو برصغیر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا اور حالی کو اعتراضات اور سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ شعرا، ادبا اور صحافیوں نے حالی کے پیغام کو جام ہلاہل اور سم قاتل سمجھ کر اس کو پاش پاش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ اس تعلق سے تقی عابدی لکھتے ہیں۔

''کہیں پر مسدس خالی، کہیں پر نقالی، ڈفالی، نقلی اور جعلی وغیرہ عناوین کے تحت اعتراضات ہوتے رہے لیکن حالی کا مسدس عوام اور خواص میں مشہور اور معروف ہوتا رہا۔ حالی نے یونان کے فلسفہ کو ایک بے کار مشق بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ اسلامی فلسفہ اور یونانی فلسفہ میں مشترک قدریں موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالی فلاسفر نہیں تھے شاید انہیں فلسفہ کا ابتدائی قاعدہ بھی سمجھنے میں نہ آیا ہو۔ اسلامی فلسفیوں نے یونانی، ہندی اور دوسرے قدیم فلسفوں سے استفادہ کیا ہے''۔(۱۱۶)

تقی عابدی حالی کے فن پر تنگ نظر حامل افراد کی بخیہ کنی کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کسی پر بے جا تنقید فن کار کے لیے مناسب نہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حالؔی کی تنقیدی نظریے کی مخالفت کی ہے کہ حالؔی کا فلسفۂ یونان کو نشانہ بنانا مناسب نہیں حالاں کہ آگے تقی عابدی نے لکھا ہے کہ ''اس مختصر تحریر میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم یہاں بحث کا دفتر کھول دیں۔حالؔی کے مسدس کا یہ حصہ ہمیشہ بحث ومباحثہ کا محور ہوگا''۔تقی عابدی بحث ومباحثہ کے لیے دانشوران کو مدعو کررہے ہیں تا کہ حالی کے متنازع پہلوؤں کومزید بہتر معانی ومفاہیم میں سمجھا جا سکے۔

مسدس حالی ،جہان حالی کا ایک انمول اور نمایاں پہلو ہے۔حالی کا رنگ ہر ایک سے جداگانہ ہے۔حالی ،مسدس اور بعض نظموں میں پس ماندہ بےحرکت مسلمان قوم کے اکابرین کے کارناموں کو بیان کر کے دعوت فکر دے رہے ہیں کہ قوم کے رہنما کی بےحسی قوم کی ہلاکت کا سبب ہے اس لیے بیدار ہونے کی ضرورت ہے تا کہ قوم ہلاکت سے بچ سکے۔سرسید حالؔی کی ان نظموں پر جو مثنویوں کی ہیئت میں پیش ہوئی تھیں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔

> ''مولانا الطاف حسین حالی کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی ''مناظرہ رحم وانصاف'' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے درحقیقت ہمارے علم وادب کا ایک کارنامہ ہے۔

ان کی سادگی الفاظ،صفائی بیان،عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔بیان میں ،زبان میں،آمد میں،الفاظ کی ترکیب میں،سادگی وصفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں''۔(۱۱۷)

عورتوں کے حقوق اوران کی ذات کی اہمیت،تعلیم وتربیت اورظلم وزیادتی پر حاؔلی نے جو نظم لکھی تھی۔چنداشعارآپ ہیں دیکھیں۔

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہوتم ہی قوموں کی عزت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طبیعت میں ہے مہر ووفا
گھٹی میں ہے صبرورضا انساں عبارت تم سے ہے
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذات خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم،جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا

بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا

ان نظموں میں حالؔی صنف نازک اور دنیا کے بارونق ذات کا ذکر کر کے یہ پیغام دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ عورتوں سے اس دنیا میں بہار ہے ورنہ اس کی حقیقت ایک اندھے کنویں کی ہے اس لیے عورتوں سے تعلق سے سوچ وفکر بدلنے کی ضرورت ہے۔ حالی کی نظمیں ہمارے لیے درس عبرت ہیں۔تقی عابدی نے اس کلیات میں کس طرح کی نظمیں شامل کی ہیں؟ اس تعلق سے موصوف حالؔی کی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''حالؔی نے اپنے نظموں کے پہلے مجموعے میں چودہ نظمیں شائع کیں جس میں مدوجزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد اور شکوہ ہند کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے اور مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ حالی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں 1874ء تک کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ 1874ء میں جب محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ کی تائید سے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جس میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوع دیا گیا تا کہ اردو شاعری کو فرسودہ عشقیہ اور مبالغہ آمیز مضامین سے نجات دلوائی جائے تو انہوں نے بھی جو نظمیں پڑھیں یعنی برکھارت، نشاط امید، حب الوطنی اور مناظرہ رحم وانصاف کو اس مجموعہ کا حصہ بنایا''۔(۱۱۸)

حالی اس بات سے متفق تھے کہ انہیں اگر چہ مغربی شاعری کے اصولوں سے واقفیت نہیں لیکن انہیں مبالغہ اوراغراق سے نفرت ہے جس کا ثبوت خود ان کا کلام ہے۔حالی نے یہ بھی کہا تھا کہ سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار اور 1872 کے جاری شدہ تہذیب الاخلاق کے علاوہ مغربی لٹریچر کی ترجمہ شدہ کتابوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں لٹریچر کا انقلاب برپا کردیا تھا جس کی وجہ سے مغربی طرز کی نظموں کی پذیرائی ہونے لگی۔حالی کہتے ہیں:

''میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے،معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہوسکا اور ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں،اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے،جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ درخاک معنی تخم سعی افشاندہام
بوکہ بعد از ماشود ایں تخم نخل باردار''(۱۱۹)

(ترجمہ۔یعنی میں نے دنیائے معانی کی خاک میں کوشش کے بیج بوئے ہیں تاکہ

ہمارے بعد اس کے پھل دینے والے درخت سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔)

تقی عابدی رباعیات حالی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حالی نے اردو اور فارسی میں رباعیات کہی ہیں۔اردو اور فارسی کی عمدہ رباعیات کے سامنے حالی کی رباعیات معمولی اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔حالی کی رباعیات کے مجموعے کئی شائع ہوئے لیکن سب سے اچھا مجموعہ جس میں حالی کی سب سے زیادہ رباعیات ہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ترتیب شدہ ہے جو انہوں نے حالی کی سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر شائع کیا تھا۔اس کلیات اور مجموعہ رباعیات میں ہم نے اسی نسخے سے استفادہ کیا جسے افتخار صدیقی نے نظم کلیات حالی میں شامل کیا ہے۔حالی کی اردو رباعیات کی تعداد(۱۲۰)اور فارسی رباعیات کی تعداد(۲۰) ہے۔شیخ اسماعیل کے مرتبہ رباعیات کے مجموعے میں کتابت کی غلطیاں اور بعض الفاظ کا املا غلط درج ہونے کے باعث مصرعے وزن سے خارج ہو گئے تھے وہ تصحیح کر کے شامل کر لیے گیے اور مزید ایک قطعہ جو غلطی سے رباعیوں میں شامل تھا خارج کر دیا گیا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔ ع ۔موتی ہزار قصر سمندر میں ہوں نہاں''(۱۲۰)

چند رباعیاں ملاحظہ کریں۔حمدیہ رباعی:

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور
ادراک سے اوجھل تونظر سے مستور
یہ حسرت دیدول میں قائم رکھیو
بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ بھی کسی طرح سے معبود کے قائل ہیں۔اس حوالے سے ایک رباعی:

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

نعتیہ رباعی:

بطحائے عرب کو محترم تونے کیا
اور امیوں کو خیر امم تونے کیا
اسلام نے ایک کر دیار و تتار
بچھڑے ہوئے گلے کو بہم تونے کیا

حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں مرثیے کوادب کی اخلاقی درس گاہ بتایا ہے۔اس حوالے

سے بھی ایک رباعی دیکھیں:

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پر اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعت یزید گمراہ
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

حالؔی شاعری کو مقصد حیات اور سماجی، اخلاقی قدروں کو مستحکم کرنے لیے استعمال کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پاس دار تھے اور انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرتوں سے واقف تھے۔ اس ضمن میں ایک رباعی دیکھیں:

ہندو سے لڑیں گے نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو یہ کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حالی کا مسدس مسلمانوں کے عروج وزوال کا مرقع ہے۔ اس کا آغاز ہی اس رباعی سے ہوتا ہے جو مضمون کی تمہید باندھتا ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

درج ذیل رباعیات میں حالیؔ کہیں ناصح، کہیں رہبر، کہیں قوم کا غم خوار نظر آرہے ہیں۔ حالاں کہ حالی منکسر المزاج تھے۔ انہیں واعظ اور ناصح بننے میں حیا آتی تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

''بعض رباعیوں اور قطعوں میں اخلاقی مضامین پیش کیے گئے چناں چہ شاعر کو پند و نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر یہاں شاعر ناصح سے اس لیے مختلف ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کررہا ہے جب کہ پاک ناصح جگ بیتی کا ذکر کررہا ہے''۔(۱۲۱)

رباعیات حالی اخلاقیات سے پر ہیں۔ سیاسی، سماجی، ملی و ملکی مسائل پر غور وخوض کے علاوہ ایک ناصح کی نصیحت بھی ان میں موجود ہے جو قوم و ملت کی پستی دیکھ کر آہ و فغاں کررہے ہیں۔ حالی زندگی کی ہر سطح پر تبدیلی کے قائل تھے ایک ہمدرد انسان ہونے کی وجہ سے ناصحانہ کلمات ادب کے مختلف اصناف میں در آئی ہیں۔ یہی حالی کی اصل شناخت ہے۔

تقی عابدی اپنی تحقیق میں تخلیقات حالی سے منسوب نعتیہ خمسہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم نے حالی سے منسوب ''نعتیہ خمسہ'' کو جسے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جواہرات یعنی مجموعۂ باقیات حالی میں شامل کیا تھا اور ''خستہ'' حالی کا

تخلص بتایا تھا اس کلیات میں الحاقی کلام بتا کر شامل نہیں کیا۔ یہ نعتیہ خمسہ
فارسی میں ہے اور اس کا سن طباعت 1856ء ہے جب حالی کی عمر مشکل
سے اٹھارہ برس ہے۔ افتخار صدیقی مرتب ''کلیات نظم حالی'' بھی اس کو حالی کا
کلام نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسے شامل کیا ہے۔ ہم نے
پورا تحقیقی مضمون اس ضمن میں ''حالی فہمی'' میں ناظرین کی سہولت کے لیے
شائع کیا ہے''۔ (۱۲۲)

اس کلیات کی ترتیب وتدوین اور ممکنہ صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

''جہاں تک کلیات حالی کی ترتیب اور تدوین کا تعلق ہے جو کم از کم تین
طرح سے مرتب کیا جا سکتا ہے یعنی اصنافی ترتیب، موضوعاتی ترتیب یا زمانی
ترتیب۔ حالی کے پہلے کلیات کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اردو کے قدیم
اور مروجہ اسلوب یعنی اصناف سخن کے اعتبار سے جمع کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد
صدیقی نے کلیات نظم حالی کو موضوعاتی اعتبار سے تقسیم کر کے ہر صنف میں
زمانی دور کو بھی ملحوظ رکھا۔ راقم نے بھی کلیات حالی میں اصنافی ترتیب دے
کر جہاں منظومات کے سنین کا تعین ہو سکا انہیں تاریخوں کے اعتبار سے
مرتب کیا ہے''۔ (۱۲۳)

ماحصل یہ ہے کہ مولانا الطاف حسین حالؔی اردو شاعری کی تنقید میں سب سے اہم اور معتبر

نام ہے۔اردوادب کے دانشوروں کااس پر اجماع ہے کہ حالی نے سب سے پہلے اردو شاعری کوزندگی سے قریب کرتے ہوئے ایک گائڈلائن کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ان کا نظریہ تھا کہ شاعری صرف تفنن طبع ہی نہیں بلکہ ایک مقصد حیات ہے۔شاعری میں اصلاح کی خاطر ایک اہم صنف تنقید کے بنیادگزار بھی ٹھہرے۔نثری اورشعری اصناف کی طرف بیک وقت توجہ مبذول کرائی جس سے بعد میں لکھنے والوں کوایک راستہ ملا۔جس سے ماضی قریب میں اردو کی مختلف اصناف وجود میں آئیں اور پھر ادباوشعراکے لیے حالی کی تحریریں مشعل راہ بنی۔حالی کی ادبی خدمات کوچند جملوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا،اس لیے جہاں حالی،کائنات حالی اورحالی کے فکروفن پر مکمل دسترس کے لیے اکیسویں صدی کے مستند ومعتبر نقادڈاکٹر سیدتقی عابدی کی تمام تصنیفات کا مطالعہ اہل ذوق وشوق کی توجہ کا طالب ہے۔بیک وقت موصوف نے کائنات حالی (12) بارہ تحقیقی وتنقیدی تصنیفات پیش کی ہیں جن میں کلیات حالی،حالی فہمی اور مسدس حالی کواولیت حاصل ہے۔کلیات حالی ،حالی کی صدسالہ برسی کے موقع پرخصوصی پیش کش ہے۔کلیات حالی میں تقی عابدی نے اٹھارہ (18) ابواب متعین کئے ہے۔جن میں حالی کی شخصیت،فن،رباعیات(وہ رباعیات جن میں قدیم، جدید اوراخیرادوار کے رباعیات شامل ہیں۔ان تمام رباعیات کوتشریحی،لغوی اورتفصیلی طور پرپیش کیا ہے)غزلیات(غزلوں کوالف تا ی ردیف کے ساتھ مرحلہ واراس ترتیب سے پیش کیا ہے کہ اس قدر مصروف شخص کیسے یہ کام کرسکتا ہے،عقل دنگ ہے اوراہل علم اس

کاوش کو دیکھ کر مچل رہے ہیں۔اس باب میں بھی تینوں ادوار کی غزلیں شامل ہیں) قطعات (اس باب میں تنقیدی،سیاسی،معاشرتی واصلاحی،طنزیہ ومزاحیہ،حکایات ومطائبات اس خوب صورتی کے ساتھ کئے گئے ہیں کہ قارئین حالی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیے بیٹھے ہیں اور حالی مختلف عناوین پر بحث کرر ہے ہیں) قصائداردو (مختلف قصائد پر تقی عابدی کا مختصر ریویو) نظمیں۔منظومات مدحیہ،سیاسیہ اورداعیہ،مراثی،اخلاقی،درسی اورمناظراتی نظمیں، حقوق زناں اور ہمدردی نسواں کی نظمیں،قومی اور ملی نظمیں، تعلیمی اوراصلاحی نظمیں،بچوں کی نظمیں،تراجم،قطعات تاریخ اورتاریخی جملے مقتبس از قرآن،متفرقات حالی،باقیات حالی اوراخیر میں تفصیلی طور پر کلیات حالی فارسی (یہ کلیات حالی کا ایک اہم حصہ ہے) حالی کے فارسی کلام الف تا ی تک ردیف کے ساتھ ترتیب وار پیش کیا ہے۔کلیات حالی کا ہر ایک باب اپنے آپ میں جامع اور مانع ہے۔ ہرایک فردافردا تفصیل کا متقاضی ہے۔اس لیے اس مختصر تحریر میں اس کی گنجائش ہی نہیں ورنہ اس اہم انسائیکلوپیڈیا کی بے حرمتی ہوگی۔واضح ہو کہ کلیات حالی میں شامل تمام ابواب میں تقی عابدی کا تحقیقی وتنقیدی مضامین رمقدمہ رپیش لفظ رتقریظ جلیل شامل ہیں۔جو متعلقہ ابواب کی نوک و پلک،فکری وفنی ضرورت اورادبی منظرنامے پر حالی کی اہمیت سے واقف کراتے ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جاکرنظر کہاں

حواشی:

(۱) حالی فہمی از تقی عابدی، صفحہ نمبر، ۳۱

(۲) ایضاً، صفحہ نمبر ۳۴

(۳) ایضاً، صفحہ نمبر ۳۸

(۴) ایضاً، صفحہ نمبر ۴۴

(۵) ایضاً، صفحہ نمبر ۴۷

(۶) ایضاً، صفحہ نمبر ۴۹

(۷) ایضاً، صفحہ نمبر ۶۱

(۸) ایضاً، صفحہ نمبر ۶۲

(۹) ایضاً، صفحہ نمبر ۶۵

(۱۰) ایضاً، صفحہ نمبر ۶۵

(۱۱) ایضاً، صفحہ نمبر ۶۹

(۱۲) ایضاً، صفحہ نمبر، ۸۹

(۱۳) ایضاً، صفحہ نمبر ۹۰

(۱۴)ایضاً،صفحہ نمبر ۹۴

(۱۵)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۱۹

(۱۶)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۲۵

(۱۷)ایضاً،صفحہ نمبر ۲۷-۱۲۶

(۱۸)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۳۶

(۱۹)ایضاً صفحہ نمبر ۱۴۲

(۲۰)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۴۳

(۲۱)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۴۴

(۲۲)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۰

(۲۳)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۲

(۲۴)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۴

(۲۵)ایضاً،صفحہ نمبر ۵۶-۱۵۵

(۲۶)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۷

(۲۷)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۸

(۲۸)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۶۵

(۲۹)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۶۶

(۳۰)ایضاً، صفحہ نمبر ۱۷۱

(۳۱)ایضاً، صفحہ نمبر ۱۷۲

(۳۲)ایضاً صفحہ نمبر ۱۷۶

(۳۳)ایضاً صفحہ نمبر ۱۹۸

(۳۴)ایضاً صفحہ نمبر ۲۰۲

(۳۵)ایضاً صفحہ نمبر ۷-۲۰۶

(۳۶)ایضاً صفحہ نمبر ۱۱-۲۰۸

(۳۶)ایضاً صفحہ نمبر ۱۱-۲۰۸

(۳۷)ایضاً صفحہ نمبر ۲۲۱

(۳۸)ایضاً صفحہ نمبر ۲۲۶

(۳۹)ایضاً صفحہ نمبر ۲۲۷

(۴۰)ایضاً صفحہ نمبر ۲۲۷

(۴۱)ایضاً صفحہ نمبر ۲۳۱

(۴۲)ایضاً صفحہ نمبر ۲۳۳

(۴۳)ایضاً، صفحہ نمبر ۲۳۷

(۴۴)ایضاً صفحہ نمبر یضاً ۲۴۲

(۴۵)ایضاً صفحہ نمبر ۲۴۴

(۴۶)ایضاً صفحہ نمبر ۲۴۶

(۴۷)ایضاً صفحہ نمبر ۲۵۰

(۴۸)ایضاً صفحہ نمبر ۲۵

(۴۹)ایضاً صفحہ نمبر ۲۵۹

(۵۰)ایضاً صفحہ نمبر ۲۶۷

(۵۱)ایضاً صفحہ نمبر ۲۶۷

(۵۲)ایضاً صفحہ نمبر ۳۶۲

(۵۳)ایضاً صفحہ نمبر ۳۶۸

(۵۴)ایضاً صفحہ نمبر ۳۷۱

(۵۵)ایضاً صفحہ نمبر ۳۷۳

(۵۶)ایضاً صفحہ نمبر ۳۷۴

(۵۷)ایضاً صفحہ نمبر ۳۷۶

(۵۸)ایضاً ۸۱-۳۸۰

(۵۹)ایضاً صفحہ نمبر ۳۹۰

(۶۰)ایضاً صفحہ نمبر ۳۹۱

(۶۱)ایضاً صفحہ نمبر ۳۹۵

(۶۲)ایضاً صفحہ نمبر ۴۶۹

(۶۳)ایضاً صفحہ نمبر ۴۶۹

(۶۴)ایضاً صفحہ نمبر ۵۵۵

(۶۵)ایضاً صفحہ نمبر ۵۵۹

(۶۶)ایضاً صفحہ نمبر ۵۷۲

(۶۷)ایضاً صفحہ نمبر ۵۷۶

(۶۸)ایضاً صفحہ نمبر ۵۹۴

(۶۹)ایضاً صفحہ نمبر ۶۰۰

(۷۰)ایضاً صفحہ نمبر ۶۰۲

(۷۱) مُسدسِ حالی ۔از تقی عابدی صفحہ نمبر ۲۰

(۷۲)ایضاً صفحہ نمبر ۳۱

(۷۳)ایضاً صفحہ نمبر ۳۲

(۷۴)ایضاً صفحہ نمبر ۳۵

(۷۵)ایضاً صفحہ نمبر ۳۵

(۷۶)ایضاً صفحہ نمبر ۳۸

(۷۷)ایضاً،صفحہ نمبر ۵۵

(۷۸)ایضاً صفحہ نمبر ۷۴

(۷۹)ایضاً،صفحہ نمبر ۷۵

(۸۰)ایضاً،صفحہ نمبر ۷۷

(۸۱)ایضاً،صفحہ نمبر ۷۸

(۸۲)ایضاً،صفحہ نمبر ۸۱

(۸۳)ایضاً،صفحہ نمبر ۸۲

(۸۴)ایضاً صفحہ نمبر ۸۶

(۸۵)ایضاً،صفحہ نمبر ۸۲

(۸۶)ایضاً،صفحہ نمبر ۹۳

(۸۷)ایضاً،صفحہ نمبر ۹۵

(۸۸)ایضاً،صفحہ نمبر ۹۸

(۸۹)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۰۱

(۹۰)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۰۷

(۹۱)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۱۳

(۹۲)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۱۴

(۹۳)ایضاً، صفحہ نمبر ۱۱۵

(۹۴)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۱۵

(۹۵)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۲۰

(۹۶)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۲۱

(۹۷)،ایضاً،صفحہ نمبر ۱۲۳

(۹۸)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۲۵

(۹۹)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۳۰

(۱۰۰)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۴۷

(۱۰۱)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۱

(۱۰۲)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۲

(۱۰۳)ایضاً،صفحہ نمبر ۱۵۶

(۱۰۴)ایضاً،صفحہ نمبر ۲۶۱

(۱۰۵)ایضاً،صفحہ نمبر ۲۶۶]

۱۰۶۔کلیات حالی۔ازتقی عابدی۔صفحہ نمبر ۴۴۔۴۵

۱۰۷۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۵

۱۰۸ایضاً۔صفحہ نمبر ۴۶

۱۰۹۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۷

۱۱۰ ایضاً۔صفحہ نمبر۱۹۲

۱۱۱۔ایضاصفحہ نمبر ۴۷۔۴۸

۱۱۲۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۰

۱۱۳۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۰

۱۱۴۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۷

۱۱۵۔ایضاً صفحہ نمبر ۶۷

۱۱۶ایضاً صفحہ نمبر ۹۶

۱۱۷۔ایضاً صفحہ نمبر ۵۴۸

۱۱۸۔ایضاً صفحہ نمبر ۵۰

۱۱۹۔ایضاً صفحہ نمبر ۵۱۔۵۲

۱۲۰۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۸

۱۲۱۔ایضاً صفحہ نمبر ۴۸

۱۲۲ایضاً صفحہ نمبر ۴۸

۱۲۳۔ایضاً صفحہ نمبر ۳۴

حاصل مطالعہ

صحت کے طبیب اور ادب کے مریض ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار آزادی کے بعد کے ان نا قدین و محققین میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی کڑی محنت سے اردو ادب اور خاص طور پر تحقیق کے میدان میں اہم نام کمایا ہے۔تقی عابدی تحقیق کے میدان کے وہ شہسوار ہیں جنھوں نے اپنے پیشے سے ہٹ کر اردو ادب اور خاص کر اردو تحقیق وتنقید کی خدمت کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کینڈا کے شہری ضرور ہیں مگر چونکہ ان کی پیدائش ہندوستان کی سر زمین حیدرا آباد میں ہوئی ہے۔اس لئے اپنے اصلی وطن سے دوری کے باوجود یہاں کی سر زمین ،زبان اور تہذیب سے نہ صرف جڑے ہوتے ہیں بل کہ اس ملک کی تہذیب ،تمدن اور زبان سے انہیں والہانہ عشق ہے،موصوف موجودہ وقت میں فیزیشن کے ساتھ ساتھ ماہر اعضائے انسانی اور ماہر قلب ہیں۔The Scarborought Hospital Canda میں طباعت کے پیشے سے جڑے ہوئے ہیں اور مذید کینڈین رائٹرز یونین کے ممبر بھی ہیں۔ دنیا کے مختلف مما لک میں ۴۰ سال سے زیادہ کام کرنے کا تجزبہ حاصل ہے جس میں تحقیق و تنقید ہی نہیں بلکہ بطور فیزیش کام کرنے کا تجربہ بھی شامل ہے۔

اپنے مسقط الراس سے بظاہر بڑی دوری کے باوجود اردو زبان وادب کے حوالے سے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔صرف تحقیق وتنقید ہی نہیں بلکہ اردو کی ہمہ گیری کو استحکام بخشنے کے لئے عالمی پیمانے پر سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انقعاد بھی کرتے رہتے ہیں۔

ایک مصروف طبیب ہونے کے باوجود ہر ہفتہ 35 سے 40 گھنٹے ادب پر صرف کرتے ہیں۔
اکثر کہتے ہیں'' زندگی میں وقت کی کمی نہیں ہوتی وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ہم بہت سارے
کاموں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔''

اردو تحقیق وتنقید، تدوین وترتیب، تشریح ترجمہ وتفسیر کی صورت میں اب تک تقی عابدی
کی 50 سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔اور ادبی حلقوں میں کافی مقبول ومعروف
بھی ہو چکی ہیں میں یہاں ان کتابوں کی فہرست پیش کر رہی ہوں تا کہ قارئین اُن کی ادبی
خدمات سے واقف ہوسکیں۔اور اندازہ لگا سکیں کے تقی عابدی نے اردو ادب کے تیئں کتنی
خدمات انجام دی ہیں۔اور ادب کے ساتھ انہیں کتنا لگاو ہے۔فہرست یوں ہے۔

۱) شہید (شہادت پر مبنی فارسی کتاب کا ترجمہ)

۲) جوش مودت (شعری مجموعہ)

۳) گلشن رویا (شعری مجموعہ)

۴) اقبالؔ کے عرفانی زاویئے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

۵) انشاللہ خان انشاؔ (انشاؔ کی شخصیت اور شاعری کا خصوصی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)

۶) رموز شاعری (آسان زبان اور عام فہم انداز میں فن عروج پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے)

۷) اظہار حق

۸) مجتہد نظم مرزا دبیرؔ

۹) طالع مہر

۱۰) سلک سلام دبیؔر

۱۱) تجزیہ یادگار انیسؔ (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے)

۱۲) ابواب المصائب

۱۳) ذکر درباران (مقالات کا مجموعہ)

۱۴) عروس سخن (مقالات کا مجوعہ)

۱۵) مصحف فارسی دبیؔر

۱۶) مثنویات دبیؔر

۱۷) کائنات نجم

۱۸) روپ کنور کماری

۱۹) دربار رسالت

۲۰) فکر مطمئنہ

۲۱) خوشہ انجم در دریائے نجف

۲۲) تاثیر ماتم

۲۳) روش انقلاب

۲۴) مصحف تغزل

۲۵) ہوالنجم

۲۶) نجمی مایا

۲۷) نقش لکھنوی

۲۸) ادبی معجزہ (حیات۔ شخصیت۔ فن اور کلام)

۲۹) غالب۔ دیوان۔ نعت ومنقبت

۳۰) چوں مرگ آید (علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص)

۳۱) رباعیات انیسؔ

۳۲) سبد سخن (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)

۳۳) کلیات غالبؔ فارسی (دو جلدوں میں)

۳۴) فیضؔ فہمی (۱۸۲ تحقیقی وتنقیدی مضامین)

۳۵) فیضؔ شناسی

۳۶) رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری)

۳۷) دیوان رباعیات انیسؔ

۳۸) دو شاہکار نظمیں

۳۹) کلیات حالیؔ

۴۰) مسدس حالیؔ

۴۱) حالی فہمی

۴۲) قطعات حالی

۴۳) رباعیات حالی

۴۴) قصائد حالی

۴۵) بچوں کے حالی

۴۶) قصائد حالی

۴۷) حالی کی نظمیں

۴۸) حالی کی نعتیہ شاعری

۴۹) حالی کے شخصی مرثیے

۵۰) دیوان حالی وغیرہ

مذکورہ تمام کتب اردو ادب کے تئیں ان کے ذوق وشوق اور محبت کا ثبوت ہیں۔آپ نے تنقید کے حوالے سے مدلل اور مستند کام انجام دیا ہے۔آپ کی شعری تنقید کا دائرہ کافی وسیع ہے۔آپ نے امیر خسرو۔مرزا غالب- میر انیس۔مرزا دبیر۔اقبال۔جوش۔انشا۔شیفتہ۔نجم آفندی۔روپ کنور کماری۔تعشق لکھنوی۔رشید لکھنوی۔فیض احمد فیض اور مولانا الطاف حسین حالی وغیرہ کے حوالے سے بہترین کارنامے انجام دیئے ہیں۔

تقی عابدی بیک وقت شاعر نقاد اور محقق ہیں۔شاعری کے حوالے سے اب تک ان کے

دو مجموعے ''گلشن رویا اور جوش مودت'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور اب تک دو درجن سے زیادہ نیشنل اور انٹرنیشنل ایوارڈ سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔ تقی عابدی کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست چونکہ طویل ہے اور ان تمام کو ایک مقالے میں سمیٹنا کافی مشکل ہے اسلئے میں نے اپنے مقالے کو ان کی تنقیدی بصیرت تک محدود رکھا ہے اور ان کی درجہ بندی کرتے ہوئے انیسؔ، فیضؔ اور حالیؔ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے اسی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اور ان تین شعرا کے حوالے سے کئے گئے کام کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ ان تینوں شاعروں نے اردو شاعری کو الگ الگ جہتوں میں ترقی کے منازل سے ہمکنار کیا ہے۔

صنف مراثی میں انیسؔ کا نام ہی کافی ہے۔ اردو مراثی کی تاریخ انیسؔ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ انیسؔ کی اسی عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تقی عابدی نے اُن کے کلام کو زیر مطالعہ لا کر صحیم کتب کی تحقیق، ترتیب و تدوین کر کے انھیں منظر عال پر لایا ہے۔ انیسؔ کی رباعیات سلام نوحے اور منقبت وغیرہ کو جدید الفاظ کے مطالب میں ڈھال کر'' دیون رباعیات انیسؔ'' کی شکل میں پیش کیا ہے جو کہ ان کا تحقیقی، تدوینی اور تشریحی کارنامہ ہے۔ مذکورہ دیوان میں تقی عابدی نے ''فن شخصیت اور میر انیسؔ'' کے ضمن میں میر انیسؔ کا زندگی نامہ انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں پیش کیا ہے جس سے میر انیسؔ کی ادبی خانگی اور معاشرتی صورت حال کا پتہ چلتا ہے کسی شخصیت کو متعارف کرانے میں زندگی نامہ نہایت ہی اہم رول ادا کرتا

ہے۔اور پھر اسے انسائیکلو پیڈیا کی صورت میں پیش کرنا کافی مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ اور تقی عابدی نے اس مشکل مرحلے سے گذر کر ان کی زندگی کے متعلق تمام پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ہے۔مثلاً فنون سپاہ گری، حلیہ انیسؔ وضع اور لباس، پابندی اوقات، اخلاق و کردار اس کے علاوہ انتخاب بحر مرثیوں کا مطلع، نظام الاوقات، شعرا کی قدر دانی تقلید، طرز مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں۔ ذاتی امام باڑاہ منبر پر نشست اور خطبہ پڑھنے کا انداز پہلی مجلس ۔ مجلس چہلم، اہلیہ میر ضمیرؔ، مجالس عظیم آبا،د میر انیسؔ حیدر آباد میں، آخری مجلس اور بیماری کے ذیل میں میر انیسؔ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مدلل و مفصل تنقیدی و تحقیقی بحث کی ہے غرض انیسؔ کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہوگا جو ان کی نظر سے دور رہا ہو۔ادب کے طالب علم کیلئے انیسؔ کی زندگی کے متعلق اتنی معلوم افزا کتاب شاید ہی کہیں ملے گی۔

تقی عابدی کی کتاب ''دیوان رباعیاتِ انیس'' میں انہوں نے صنف رباعی کے متعلق ایک تحریر درج کی ہے جس سے رباعیات کی مکمل تاریخ کا علم ہوتا ہے۔اور پھر رباعی کے ایرانی الااصل ہونے کے بھی مکمل دلائل پیش کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ رباعی ایران کی پیداوار ہے۔

تقی عابدی نے انیسؔ کی رباعیات کے حوالے سے ترتیب دی گئی تمام کتب کو ان کے مصنف سن طباعت، مطبع، نام کتاب اور معہ تعداد رباعی ایک مکمل فہرست درج کی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رباعیات انیسؔ کے حوالے سے اب تک ۱۳ کتابیں منظر عام پر آچکی

ہیں۔مگر تقی عابدی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تلاش سے رباعیات انیسؔ میں اضافہ کیا ہے اور تعداد کے لحاظ سے ان کا یہ سب سے پہلا مجموعہ ہے جس میں سب سے زیادہ رباعیات شامل ہیں جن کی تعداد ۵۷۹ ہے۔

تقی عابدی نے انیسؔ کی رباعیات کا فنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی رباعیات میں استعمال ہونے والے صنعتوں اور بحروں کا مکمل تدارک کیا ہے۔ساتھ ہی انیسؔ کے کلام کی قدر دانی پر ایک طویل تبصرہ پیش کیا ہے جس سے انیسؔ کی رباعیات کی معنوی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

انیسؔ شناسی کے باب میں تقی عابدی کا دوسرا اہم کارنامہ تجزیہ یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' ہے جو یقیناً انیسؔ شناسی کے باب میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ جو تقی عابدی کی ضرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ وتنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔اس یادگار مرثیے کے تین باب (۱۱-۱۲-۱۳) غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں ۔گیارہویں باب میں علم بیان کے تحت صرف اسی ایک مرثیے کے شعری محاسن کی تفصیلات درج ہیں جس میں علم بیان اور علم بدیع کی نہ صرف تعریف کی گئی ہے بلکہ محاسن کلام کو سمجھانے کی غرض سے مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ بارہواں باب پورے مرثیے کا شماریاتی تجزیہ ہے۔جس سے اس پورے مرثیے میں استعمال کئے گئے ۔عربی فارسی اور اردو الفاظ کی تعداد بتائی گئی ۔ساتھ ہی کل اضافات کل جدید ترکیبات مکمل تشبیہات کل

کنایات کل مجاز مرسل اور صنائع کی تعداد کتنی ہے۔اس کا بھی علم ہوتا ہے۔ جسے تقی عابدی نے ''فہرست کامل'' کا نام دیا ہے۔تیرہواں باب ''تجزیہ کامل'' حاصل کتاب ہے۔اس میں مرثیے کے ۱۹۷ بندوں کا تجزیہ کیا گیا ہے غرض ہر مصرعہ او ر ہر بند کو فصاحت بلاغت ، تشبیہات، مجاز مرسل ، کنایات صنائع لفظی تمثیلات محاورات صوتی آہنگ اسلوب حسن بیان ،ترتیب وتسلسل حسن بندش الفاظ کی روانی صفائی عمدگی شگفتگی وغیرہ کی تفصیلی تقسیم کی ہے۔تقی عابدی نے انیسؔ کے مرثیے کا فکری وفنی تجزیہ کرنے کے بعد اردو، فارسی ، ہندی اور سنسکرت کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے الفاظ جنہیں انیسؔ نے استعمال کیا ہے کی دریافت کی ہے جو انیسؔ فہمی کے باب میں نادر ونایاب کام ہے۔

فیضؔ احمد فیضؔ کی ادبی خدمات سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔فیضؔ کی شاعری میں ایک عمدہ عہد کی نمائندگی ہے۔ان کی شاعری میں بیسویں اوراکیسویں صدی کی ظالم حکومت کے خلاف احتجاج ہے۔تقی عابدی نے فیضؔ کی خاندانی زندگی، خانگی زندگی، ادبی زندگی، سیاسی زندگی اور سماجی زندگی کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں '' فیض فہمی اور فیض شناسی'' کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے جو ایک ادبی دستاویز سے کم نہیں ہے۔

فیضؔ پر شائع ہونے والی اب تک کی تمام کتابوں میں ''فیضؔ فہمی'' سب سے ضخیم کتاب ہے جو ڈاکٹر عابدی نے فیضؔ کے فن پر مختلف ادیبوں کے مضامین یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں قارئین کے سامنے لائی ہے۔اس کتاب میں کل ۱۶۲ مضامین شامل ہیں جن

کے تحت فیضؔ کی شعری ونثری تخلیقات حیات وکائنات اور مختلف جہات کے تمام تر پہلوؤں پر بہت ہی واضح اور مفصل روشنی ڈالی گئی ہے ۔فیضؔ فہمی میں تقی عابدی کے ۱۴ مضامین شامل ہین۔فیضؔ فہمی اور فیضؔ شناسی میں فرق صرف اتنا ہے کہ فیض فہمی میں مختلف مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے جبکہ فیضؔ شناسی میں صرف تقی عابدی کے ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ان تمام مضامین کا تفصیلی جائزہ میں اس مقالے کے گزشتہ ابواب میں لے چکی ہوں اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تقی عابدی نے تنقید فیضؔ کے حوالے سے کئی نئے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جنھیں ہم ''کلام فیض کی تعبیر نو'' سے منسوب کر سکتے ہیں۔اکثر ناقدین ومحققین نے فیضؔ کے کلام پر مغربی شعرا کے اثرات مرتب کئے ہیں جن میں کیٹس ،شیلے،فراسٹ اور ہارڈی وغیرہ کے نام اکثر لئے جاتے ہیں۔مگر تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ فیض کی شاعری پر ''براوئننگ'' کے اثرات بھی ہیں۔اور براوئنگ کے خیالات سے لبریز ایک نظم کا حوالہ دے کر اپنی بات کو ثابت بھی کیا ہے۔فیضؔ کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح کی ہے کہ خواہ اُن کی حمد ہو کہ نعت دُعا ہو کہ مرثیہ واسوخت ہو کے ترانہ گیت ہو کہ قوالی دلکشی دلربائی اور عنانیت ان کے ہر موضوع کلام کی جان ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام زبان زدِ عام ہو گیا ہے اور اُردو کے باقی شعرا کے مقابلے میں سب سے زیادہ گایا بھی گیا ہے۔

فیضؔ کے ڈکشن پر بات کرتے ہوئے واضح الفاظ میں تقی عابدی نے کہا ہے کہ فیضؔ کا ڈکشن غالبؔ اور اقبالؔ کے ڈکشن کی توسیع ہے۔ان کی لفظیات روایتی کلاسیک لفظیات

ہے، انہوں نے اظہار کے لئے نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ نئے اظہاری پیرائے واضح کئے ہیں۔فیضؔ کی شاعری میں تغزل رچا بسا ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُن کی نظمیں زیادہ عمدہ ہیں یا غزلیں۔

تقی عابدی نے فیضؔ کے کلام کا شماریات پر مبنی تجزیہ بھی کیا ہے جس میں نظموں کے مقابلے غزلوں کی تعداد کم بتائی ہے یعنی ۸۲ غزلیں اور ۱۸۰ نظمیں اور قطعات ہیں۔ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ کونسے مجموعے میں کتنی غزلیں اور کتنی نظمیں شامل ہیں۔تقی عابدی نے غالبؔ اور فیضؔ کے کلام میں مماثلت کی دلیل دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں شاعروں کے کلام میں سرشاری ہے اور دونوں غم جانان اور غم دوراں کے شاعر ہیں اور اپنی بات کی دلیل میں دونوں کے کلام سے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں جس سے دونوں میں مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مماثلث کا ذکر بھی گزشتہ ابواب میں مثالوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

فیضؔ چونکہ ترقی پسند شاعر ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے دوسرے شعرا کی طرح باغیانہ لہجہ نہیں اپنایا نہ ہی نعرے بازے کی بلکہ ایک دھیما اور باثر لہجہ اپنایا جو ان کی مقبولیت کا باعث بنی اور انفرادیت کا کارن بھی بن گئی تقی عابدی نے فیضؔ کے کلام میں پائے جانے والے عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب کی وضاحت بھی کی ہے۔اور واضح الفاظ میں رقم کیا ہے کہ ان کے کلام میں عربی فارسی اور اُردو الفاظ و تراکیب کی بہتات ہے ۔جس کی مثال انہوں نے فیضؔ کی چند غزلوں اور نظموں کے حوالے سے دی ہے۔تقی عابدی کا شیوہ ہے کہ

وہ سہل پسندی سے انحراف کرتے ہیں اور جو بھی کام ہاتھ میں لے لیتے ہیں پھر اس کی تہہ تک جا کر کچھ نہ کچھ نیا ضرور نکال لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فیضؔ کے واقعات کا طرح طرح سے بار بار ذکر نہیں کرتے بلکہ جن واقعات پر خاص توجہ نہیں دی گئی تھی انھیں پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

تقی عابدی نے فیضؔ کے کلام میں موجود غلطیوں اور اسقام کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ادیب یا شاعر کا کلام کسی غلطی سے پاک نہیں ہوسکتا ہے۔ اکثر شعرا کے کلام میں زبان و بیان کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح فیضؔ کے کلام میں بھی زبان و بیان کے حوالے سے غلطیاں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر یہاں یہ بات اہم ہے کہ ڈاکٹر عابدی نے اس پہلو سے بھی ان کے کلام پر غور وفکر کیا ہے۔ اور دوسرے محققین و ناقدین کی طرف سے اس سلسلے میں کئے گئے اعتراضات پر غور کرتے ہوئے ان سے اتفاق بھی کیا ہے اور انحراف بھی کیا ہے اور اس سلسلے میں واضح طور پر دلائل بھی پیش کئے ہیں۔

ڈاکٹر عابدی نے علامہ اقبالؔ کے ''پیام مشرق'' کے انتخاب کا حوالہ دیتے ہوئے فیضؔ کی شخصیت بطور منظوم ترجمہ نگار بھی قاری کے سامنے لائی ہے چونکہ فیضؔ نے پیام مشرق کا انتخاب کر کے ایک منظوم اردو ترجمہ کیا تھا۔ جواب کمیاب ہے اس کے علاوہ انہوں نے کچھ دوسرے شعرا کے کلام کا حوالہ بھی دیا ہے جس کا منظوم ترجمہ فیضؔ نے کیا تھا لہٰذا تقی عابدی اپنی تحقیق سے فیضؔ کو بطور منظوم ترجمہ نگار ماننے اور سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں ساتھ ہی

بطور نعت گو بھی فیض کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے کیونکہ فیض نے فارسی میں ایک نعت بھی لکھی ہے جو ان کے مجموعہ کلام ''غبار ایام'' میں شامل ہے۔

تقی عابدی نے فیض کو بطور مرثیہ نگار بھی پیش کیا ہے جس میں انہوں نے فیض کے ''مرثیہ امام'' کے حوالے سے اس کے موضوع اور اجزء پر بات کی ہے جو ۱۲ بندوں اور ۷۲ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے اس مرثیہ کا حوالہ دے کر اُردو کے طالب علموں کو بتایا ہے کہ وہ فیض کو صرف غزل اور نظم کے شاعر تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ ان کی شاعری کی تمام جہات کا مطالعہ کریں۔ ساتھ ہی فیض کی تحاریر خطوط اور انٹرویوز کی مدد سے فیض کے ان کاموں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو وہ کرنا چاہتے تھے اور کسی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔

تقی عابدی نے فیض اور اختر شیرانی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے یہ رقم کیا ہے کہ فیض کے کلام پر اختر شیرانی کا اثر ہے۔ اور فیض ان کے کلام سے متاثر تھے۔ تقی عابدی نے فیض کے ان تمام انٹرویوز کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے جس مین ۲۸ اشخاص نے فیض سے ۴۵۰ سوالات کئے ہیں۔ اس سلسلے میں آج تک کوئی کتاب ترتیب نہیں دی گئی تھی جس میں ان کے تمام انٹرویوز کو شامل کیا گیا ہو۔ اس حوالے سے تقی عابدی کا یہ کام قابل ستائش ہے۔ اس کے علاوہ فیض کے خطوط کے حوالے سے تقی عابدی نے قابل قدر کام کیا ہے۔ اور اُن کے مطبوعہ خطوط کی تعداد ۳۳۰ سے زیادہ بتائی ہے۔ جو دستیاب ہیں۔ جن میں انہوں نے ۵۵ سے زیادہ ان خطوط کی تشخیص کی ہے جو بیگم سرفراز اقبال کو لکھے گئے ہیں جس سے فیض

اور بیگم سرفراز اقبال کے معاشقہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جسے فیض نے اکثر چھپائے رکھا تھا تقی عابدی نے فیض کے کلام میں استعمال کی گئی قرآنی آیات کی بھی نشاندہی کی ہے اور مثالوں کے ذریعے چند نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی علمیت شعراء ادب سے واقفیت اور تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرنے کیلئے فیض کے ''۲۷ ادبی نشتر'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کے کے یہ بتایا ہے کہ فیض نے شعر وادب کے متعلق اپنی گراں قدر آرا کے علاوہ کئی مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔ جو اُن کے تنقیدی مضامین کی کتاب ''میزان'' سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ لہٰذا ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی انہوں نے (تقی عابدی) فیض کو پڑھنے کی تحریک دی ہے۔ اس پہلو پر بھی گذشتہ ابواب میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

فیض فہمی کے باب میں تقی عابدی کا سب سے اہم کارنامہ ''فیض کا غیر مدون کلام'' ہے۔ تقی عابدی نے ایسی تقریبا ۴۰ غزلوں، گیتوں اور قطعوں کے حوالے دیئے ہیں جو فیض کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن غیر مطبوعہ شکل میں مختلف رسائل و کتب میں شامل ہیں۔ انہوں نے نہایت ہی محنت و لگن سے سولہ سترہ نظمیں قطعے اور گیت حاصل کر کے فیض فہمی میں درج کر دیے ہیں جس میں پنجابی اور انگریزی کلام کے علاوہ تراجم بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی فیض پر مرتبہ کتب و رسائل اور مضامین کے ذخیرے کی ایک طویل فہرست بھی درج

کی ہے۔جس سے آئندہ ریسرچرز کے لئے اس موضوع پر کام کرنے کی آسانی ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر عابدی کی زیرِ مطالعہ کتاب فیضؔ فہمی میں فیضؔ کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔جس کے لئے انہوں نے نہ صرف خود کے مضامین بلکہ دیگر بلند پایہ ناقدین و محققین کے مضامین کو بھی شامل کیا ہے جنہوں نے فیضؔ کے حوالے سے مضامین تحریر کئے ہیں اور ایک ہی بات کو بار بار دہرانے سے گریز کرتے ہوئے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔جن پر ناقدین نے نسبتاً کم توجہ دی ہے

حالؔی کی شخصیت اردو ادب میں کئی اعتبار سے بہت اہم ہے حالؔی پہلے نقاد ہیں جو شعری ادب میں اصلاحی تحریک کے بنیاد گذاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ساتھ ہی اردو میں تنقید کے بنیاد گذار بھی مانے جاتے ہیں۔مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کی پہلی با ضابطہ کتاب ہے۔جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اُردو تنقید کا پہلا نمونہ قرار دیا ہے۔اور آل احمد سرور نے اُردو شاعری کے پہلے منشور کا نام دیا ہے۔چنانچہ بطور تنقید نگاران کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں اس کی معنویت پر بھی سرسری روشنی ڈالی گئی ہے۔اور ان کے عہد میں رائج اردو شاعری پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ حالؔی کے عہد میں ہو رہی شاعری چاہئے وہ مرثیہ نظم غزل یا مثنوی کے حوالے سے ہے تمام کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔مقدمہ شعر و شاعری میں حالؔی نے تفنن طبع کی شاعری کے بجائے بامعنی اور کارآمد شاعری پر زور دیا ہے تاکہ معاشرہ اس کے فوائد سے مستفید ہو سکے۔چنانچہ تقی عابدی نے کائنات حالؔی کو گیارہ

ادبی تحفوں میں مختلف شعری اصناف کی شکل میں پیش کیا ہے جو حالی کی شعری جہات میں اب تک سب سے جامع اور مفصل ہے ۔ جن میں حالؔی کا زندگی نامہ ، ادبی خدمات، شعری تخلیقات مثلاً مسدس حالؔی ۔ قطعات حالؔی رباعیات حالؔی، قصائد حالؔی غزلیات حالؔی اور نظمیں اور نعتیں کے علاوہ حالؔی نے بچوں کی تعلیم وتر تیب ،نشو نما، تفریح او اصلاح کے لئے جو اشعار کہے ہیں انھیں بھی ڈاکٹر عابدی نے بنام بچوں کے حالؔی شائع کیا ہے۔ جو غیر معمولی دلچسپی کے حامل ہیں۔ چونکہ ایک باب میں مذکورہ تمام کتب کو سمیٹنا مشکل تھا اس لئے راقمہ نے حالؔی کے حوالے سے تقی عابدی کی تین کتابوں حالؔی فہمی ،مسدس حالؔی اور کلیات حالؔی کا مقالے کے پانچویں باب میں تفصیل سے جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔

'' حالؔی فہمی'' ۲۰۱۶ میں منظر عام پر آئی ۔ اس کتاب میں کل ۶۵ مضامین شامل ہیں جن میں ۵۹ مضامین تقی عابدی کے ہیں جب کہ ۶ مضامین خود مولانا حالی کے نقل کئے گئے ہیں تا کہ قارئین کے سامنے حالؔی کی شخصیت خود بخود ابھر کر سامنے آجائے ۔ ساتھ ہی حالؔی کے معاصرین کی تصاویر کو بھی شامل کتاب رکھا ہے جو قاری کی دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ تقی عابدی نے اپنے ۵۹ مضامین میں حالؔی کی تمام جہات کا احاطہ کیا ہے۔ اور مختلف زاویوں سے حالی کی شخصیت سوانح اور فن کا تحقیقی وتنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا ہے ۔ جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جو پردۂ خفا میں رہا ہوگا۔

مسدس حالؔی میں تقی عابدی نے حالؔی کو ترقی پسند شاعری اور تنقید کا بنیاد گذار اور جدید نظم کا

پیشوا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حآلی نے تنقید اردو و شعر و ادب میں مقدمہ شعر و شاعری نثری کارناموں میں حیات جاوید یادگار غالبؔ حیات سعدی کے علاوہ اردو فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار لکھے ہیں جو ان کے معاصرین کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ تقی عابدی نے حآلی کے کلام میں جہاں اختلاف پایا وہاں حآلی کی زندگی میں شائع شدہ کلام کو بنیادی حیثیت دی ہے دیوان حآلی، مسدس حآلی، مجموعہ نظم حآلی، ضمیمہ کلیات حآلی اور مختلف معروف نظمیں جو شائع ہو چکی تھیں ان اس سے استفادہ کیا ہے۔

حآلی نے مسدس مدو جزر اسلام ۱۸۷۹ میں شائع کی تھی جسے عوام و خواص میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں کی مانگ کے سبب اس کے سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ سات سال بعد جب ۱۸۸۶ میں اس کا آٹھواں ایڈیش جاری کیا گیا تو حآلی نے مذید ایک دیباچہ جوڑ دیا، جس میں حالی نے اپنی کتاب کی مقبولیت کے لئے قارئین کی تعریف کی ہے۔ حآلی کی مسدس کے متعلق تقی عابدی نے لکھا ہے کہ حآلی کا فطری انداز ہی مسدس کی جان ہے جو سیدھا سادہ ہے، مگر اس میں جوش اور روانی ہے یہ سادہ سلیس اور نرم الفاظ دل و دماغ میں اتر جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں صداقت اور حقیقت ہے۔ یہ بھی واضح حقیقت ہے کہ مسدس حآلی کی جہاں عوام و خواص میں زبردست پذیرائی ہوئی وہیں مخالفتوں کا بھی ایک

سیلاب امڈ آیا۔ اور بعض نے تو اس کے جواب میں مسدس لکھ ڈالی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگوں میں مقبول نہ ہوسکی۔ حالی نے مسدس میں عرب میں زمانہ جاہلیت کی بہترین منظر کشی کی ہے ساتھ ہی اس سرزمین پر رسول ﷺ کی آمد کا ذکر بھی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ قوم کی جہالت کا بھی ذکر کیا ہے اس کے علاوہ متعدد موضوعات کو زیر بحث لا کر ان پر تنقید بھی کی ہے۔

تقی عابدی نے ''مسدس'' کا اجمالی تجزیہ پیش کرتے ہوئے ''مسدس'' پر اکابرین کے تاثرات کے عنوان کے تحت سر سید احمد خان، شیخ محمد اکرم، علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی وغیرہ کے تاثرات کو پیش کر کے قارئین کو قطعی جانکاری ہی بہم نہیں پہنچائی ہے، بلکہ مسدس کے لئے اُن کی دلچسپی میں مذید اضافہ بھی کر دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ تقی عابدی نے مع سوانح شخصیت اور آرائے اکابرین مسدس حالی کی تحقیق تدوین اور تشریح کی ہے۔

'' کلیات حالی، حالی کے صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی پیش کش ہے۔ کلیات حالی میں تقی عابدی نے ۱۸ ابواب متعین کئے ہیں، جن میں حالی کی شخصیت فن رباعیات (وہ رباعیات جن میں قدیم جدید اور اخیر ادوار کی رباعیات شامل ہیں ان تمام کو تشریحی، لغوی اور تفصیلی طور پر پیش کیا ہے) غزلیات (غزلوں کو الف تا ی ردیف کے ساتھ مرحلہ وار ترتیب سے پیش کیا ہے اس باب میں بھی تینوں ادوار کی غزلیں ہیں) قطعات (اس باب میں سیاسی، تنقیدی، معاشرتی واصلاحی، طنزیہ ومزاحیہ، حکایات ومطائبات اس خوبصورتی کے

ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ قارئین حالی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں) قصائد (مختلف قصائد پر پرتقی عابدی کا مختصر ریویو) نظمیں (منظومات مدحیہ، سپاہیہ اور دعائیہ) مراثی ، اخلاقی ، درسی اور مناظراتی نظمیں، بچوں کی نظمیں، تراجم ،قطعات، تاریخ متفرقات حالی باقیات حالی اور آخر میں تفصیلی طور پر کلیات حالی فارسی ۔ حالی کے فارسی کلام الف تا ی تک ردیف کے ساتھ ترتیب وار پیش کیا ہے ۔کلیات حالی کا ہر ایک باب اپنے آپ میں جامع اور مانع ہے۔ الغرض یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ تقی عابدی نے ان تینوں شخصیات کے حوالے سے ان موضوعات کو قلمبند کیا ہے جن پر کام اصلاً کم یا سرے سے ہوا ہی نہیں ہے اور یہی وہ خصوصیت جو انھیں دوسرے ناقدین و محققین سے علیحدہ کرتی ہے۔

غرض انیس ،فیض اور حالی کے حوالے سے تقی عابدی نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جو ان شعرا کے کلام کے حوالے سے تمام جہات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے حوالے سے شائد ہی کوئی گوشہ مخفی رہا ہوگا۔ لہذا اس حوالے سے تقی عابدی کا کارنامہ لائق تحسین اور قابلِ مبارک باد ہے۔

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	کتاب	مطبع	سن اشاعت
۱۔	آل احمد سرور	تنقید کیا ہے	مکتبہ جامع لمٹیڈ ،نئی دلی	۲۰۰۴
۲۔	آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	شعبہ اردو علی گڑھ	۱۹۶۴
۳۔	آل احمد سرور	مسرت سے بصیرت تک	مکتبہ جامع لیمیٹد ،نئی دلی	۱۹۹۴
۴۔	امتیاز احمد	آل احمد سرور شخصیت اور فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ	۱۹۹۷
۵۔ا	الطاف حسین حالی	مقدمہ شعروشاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ	۱۹۹۵
۶۔	اسد اللہ خان غالب	دیوان غالب	مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی	۲۰۰۳
۷۔	ام ہانی اشرف	اردو مرثیہ نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ	۲۰۱۲
۸۔	ابوالکلام قاسمی	مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی	۲۰۰۲
۹۔	اسلم فرخی	محمد حسین آزاد ،حیات اور تصانیف ،جلد دوم	انجمن ترقی اردو ،پاکستان	۱۹۶۵
۱۰۔	تقی عابدی ،ڈاکٹر	تجزیہ یادگار انیسؔ (جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے)	پرنس آرٹ پرنٹر ،دریا گنج نئی دہلی	۲۰۰۲
۱۱۔	تقی عابدی ،ڈاکٹر	دیوان رباعیات انیسؔ	شاہد پبلی کیشن ،ریشمی اسٹریٹ ،کوچہ چالان دریا گنج ،نئی دہلی	۲۰۱۱
۱۱۔	تقی عابدی ،	ڈاکٹر۔ رباعیات دبیرؔ	شاہد پبلی کیشن ،ریشمی اسٹریٹ ،کوچہ چالان دریا گنج ،نئی دہلی	۲۰۰۸
۱۲۔	تقی عابدی ،ڈاکٹر	چوں مرگ آید۔	اقبال اکادمی ،پاکستان	۲۰۰۷
۱۳۔	تقی عابدی ،ڈاکٹر۔	تعشق لکھنوی (حیات ،شخصیت ،فن اور کلام)	شاہد پبلی کیشن ،ریشمی اسٹریٹ ،کوچہ چالان دریا گنج ،نئی دہلی	۲۰۰۷
۱۴۔	تقی عابدی ،ڈاکٹر۔	کلیات تجمل آفندی جلد اول ،دوم۔	شاہد پبلی کیشنز دریا گنج ،نئی دہلی۔	۲۰۰۶

۱۵۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	کلیات غالب فارسی جلد اول، دوم	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	۲۰۰۸
۱۶۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری (سوانح عمری، تشریح و تجزیہ)	شاہد پبلی کیشن، ریشمی اسٹریٹ گنج، نئی دہلی۔	۲۰۱۴
۱۷۔	تقی عابدی، ڈاکٹر۔	عروس سخن (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	القمر انٹر پرائزز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۱
۱۸۔	تقی عابدی، ڈاکٹر۔	ذکر در باران (تحقیق اور تنقید کی روشنی میں)	القمر انٹر پرائزز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۶
۱۹۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	سبد سخن (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	پرنس آرٹ پرنٹر، دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۰۷
۲۰۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	اقبال کے عرفانی زاویے (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	القمر انٹر پرائزز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۱
۲۱۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	رموز شاعری (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	القمر انٹر پرائزز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۳
۲۲۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	فیض فہمی (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، پاکستان	۲۰۱۱
۲۳۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	مجتہد نظم مرزا دبیر (حیات، شخصیت اور فن)	چغتائی پبلشرز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۴
۲۴۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	طالع مہر کلام عاطلۂ عطارد (دبیر کا غیر منقوط کلام)۔ چغتائی	پبلشرز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۵
۲۵۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	سلک سلام دبیر (دبیر کے سلاموں کا مجموعہ)	چغتائی پبلشرز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۴
۲۶۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	فیض شناسی (تنقیدی و تحقیقی مضامین)	ادارہ سیاست حیدر آباد، انڈیا	۲۰۱۲
۲۷۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	دیوان غالب نعت و منقبت	شاہد پبلی کیشن، ریشمی اسٹریٹ، کوچہ چالان دریا گنج، نئی	۲۰۰۷

۲۸۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	انشاء اللہ خاں انشا	القمر انٹر پرائزز، اردو بازار لاہور، پاکستان	۲۰۰۱
۲۹۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	دو تاریخی شاہکار نظمیں	عروف انٹر پرائزز، نئی دہلی	۲۰۱۳
۳۰۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	ابواب المصائب	اردو ورلڈ نیٹ، ٹورنٹو، کینیڈا	۲۰۰۴
۳۱۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	انتخاب مراثی دبیر	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۲۰۱۳
۳۲۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	گلشن رویا (شعری تخلیق)	کراچی، پاکستان	
۳۳۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	جوش مودت (شعری تخلیق)	حیدرآباد، انڈیا	
۳۴۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	حالی فہمی	جہلم بک کارنر	۲۰۱۶
۳۵۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	مسدس حالی	جہلم بک کارنر	۲۰۱۵
۳۶۔	تقی عابدی، ڈاکٹر	کلیات حالی	ایجوکیشنل بک ہاؤس نئی دہلی	۲۰۱۶
۳۷۔	ثریا حسین، پروفیسر	گارسین دتاسی (اردو خدمات، علمی کارنامے)	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو	۲۰۱۰
۳۸۔	جمیل جالبی، ڈاکٹر	ارسطو سے ایلیٹ تک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۲
۳۹۔	جمیل جالبی، ڈاکٹر	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۲
۴۰۔	حنیف نقوی	شعرائے اردو کے تذکرے	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۲
۴۱۔	حیرت کاس گنجوی، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ادب	اردو اکادمی کراچی، پاکستان	۱۹۸۸
۴۱۔	خواجہ اکرام الدین، پروفیسر	اردو کی شعری اصناف	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی	۲۰۱۳
۴۲۔	خواجہ اکرام الدین، پروفیسر	تعارف و تنقید	ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین۔ کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۶
۴۳۔	خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر	اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۴

۴۵۔	خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر	اکیسویں صدی میں اردو :فروغ اور امکان	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۴
۴۶۔	رشید حسن خان	ادبی تحقیق ،مسائل اور تجزیہ	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۰
۴۷۔	رشید موسوی، ڈاکٹر	دکن میں مرثیہ خوانی اور اعزاداری	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۹
۴۸۔	رشید موسوی، ڈاکٹر	ماہ و ناو، نیا دور، لکھنؤ	جولائی ۱۹۵۹	
۴۹۔	رضوی، سفارش حسین	اردو مرثیہ	مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دلی	۲۰۱۲
۵۰۔	رئیس امروہوی	مضمون ،اعزاداری کی ابتدا اور تدریجی ترقی	سید الاخبار، ہفتہ وار	۱۸ دسمبر ۱۹۵۰
۵۱۔	زبیر صدیقی	ڈاکٹر سید تقی عابدی، شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵
۵۲۔	عبدالحق ۔تذکرہ ریختہ گویاں	(سید فتح علی حسینی گردیزی۔انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد، دکن		
۵۳۔	سجاد باقر رضوی	مغربی تنقید کے اصول	نصرت پبلشرز ،امین آباد، لکھنؤ	۱۹۸۵
۵۴۔	سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۵
۵۵۔	سعید انجم	مغرب کے اردو افسانے	ودیا کتاباں، سویڈن	۹۱۹۷
۵۶۔	سلامت اللہ خان	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۷۸
۵۷۔	سید عاشور کاظمی	بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں برطانیہ	۲۰۰۳	
۵۸۔	سید احتشام حسین	تنقیدی نظریات ،جلد اول، دوم	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۹
۵۹۔	سید احتشام حسین	ذوق ادب اور شعور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۵۵
۶۰۔	شبلی نعمانی	موازنۂ انیس و دبیر	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۳

۶۱۔	شمس الرحمٰن فاروقی	عروض آہنگ اور بیان	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴
۶۲۔	شارب رودلوی، ڈاکٹر	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	اردو اکادمی، دہلی	1999
۶۳ ۔۔	شارب رودلوی، ڈاکٹر	تنقیدی مباحث	ناشر، مصنف	1995
۶۴۔	شارب رودلوی ،ڈاکٹر	تنقیدی مطالعہ	نصرت پبلی شرز، لکھنؤ	۱۹۸۴
۶۵۔	شارب رودلوی، ڈاکٹر	جدید اردو تنقید، اصولو نظریات	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۴
۶۷۔	شارب رودلوی، ڈاکٹر	اردو مرثیہ	اردو اکادمی دہلی	1991
۶۸۔	شمس الرحمٰن فاروقی	تنقیدی افکار	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۴
۶۹۔	صدیق الرحمٰن قدوائی	تاثر نہ کہ تنقید	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	1991
۷۰۔	طفیل احمد مدنی	امریکہ میں عربی شعر و ادب کا ارتقا	نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد، یوپی	۱۹۸۳
۷۱۔	ظل ہما	انداز بیان اور	شاہد پبلی کیشن، ریشمی اسٹریٹ، کوچہ چالان دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۰۹
۷۲۔	عبدالحق، پروفیسر	تنقیدی تصورات	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۹۴
۷۳۔	عبدالمنان طرزی	ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیفات پر ایک نظر	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۲۰۰۵
۷۴۔	عبدالحق، پروفیسر	شبلی اور معاصرین۔	اصیلا پریس، دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۱۴
۷۵۔	عبدالحق، پروفیسر	تحقیقی تصورات	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	1995

۷۶۔	پروفیسر عبدالحق،پروفیسر	تنقیدی تصورات	شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،دہلی	۱۹۹۴
۷۷۔	عتیق اللہ،پروفیسر	تنقید کی جمالیات: جلد اول تنقید کی اصطلاح،بنیادیں،متعلقات	کتابی دنیا،دہلی	۲۰۱۳
۷۸۔	عبدالحق،(بابائے اردو)	بحیثیت تنقید نگار	موڈرن پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۱۹۹۳
۷۹۔	فرمان فتح پوری	اردوشعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	مجلس ترقی ادب اردو،لاہور	۱۹۷۲
۸۰۔	کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک	نظر بک امپوریم سبزی باغ،پٹنہ	۱۹۸۳
۸۱۔	کلیم الدین احمد اردو	شاعری پر ایک نظر	بک امپوریم سبزی باغ،پٹنہ	۱۹۸۵
۸۲۔	گوپی چند نارنگ،پروفیسر	ادبی تنقید اور اسلوبیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی	۱۹۸۹
۸۳۔	گیان چند	تحقیق کا فن	اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنو	۲۰۰۹
۸۴۔	گوپی چند نارنگ،پروفیسر	اردو کی نئی بستیاں	ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی	۲۰۰۵
۸۵۔	محمد نواب کریم	اردو تنقید حالی سے کلیم تک	تخلیق کار پبلشرز،دہلی	۱۹۹۳
۸۶۔	محمد حسن،پروفیسر	جدید اردو ادب	اردو اکادمی،پاکستان	۱۹۷۴
۸۷۔	محمد حسن،پروفیسر	ادبی سماجیات	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،نئی دہلی	۱۹۸۳
۸۸۔	محمد حسین آزاد	آب حیات	اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنؤ	۱۹۹۸
۸۹۔	مسیح الزماں،ڈاکٹر	مراثی انیس	اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنو	۱۹۸۳
۹۰۔	محمد یاسین	انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	۱۹۹۲
۹۲۔	محمد حسن،پروفیسر	مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ	ترقی اردو بیورو،نئی دہلی	۱۹۹۰
۹۳۔	مسود حسن رضوی	مقدمہ شاہکار	نظامی پریس لکھنو	۱۹۴۳
۹۴۔	مرزا علی لطف	گلشن ہند(مرتبہ محی الدین قادری زور)	رفاہ عام پریس،لاہور	
۹۵۔	میر تقی میر۔	نکات الشعراء(مرتبہ،مولوی عبدالحق)	انجمن ترقی اردو(ہند)اورنگ آباد،دکن	۱۹۳۵

۹۶۔	نگہت ریحانی خان	تنقید کے مثبت رویے	ثمر آفسٹ پریس، نئی دہلی	۱۹۹۷
۹۷۔	نقوی، ضمیر اختر	اردو مرثیہ پاکستان میں	سید اینڈ سید۔ اورنگزیب مارکیٹ۔ ایم اے جناح روڈ، کراچی	۱۹۸۲
۹۸۔	نقوی، نورالحسن	تاریخ اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۱
۹۹۔	نیر مسود	مرثیہ خوانی کا فن	ذکی سنز پرنٹرز کراچی	۲۰۰۵
۱۰۰۔	نوراللغات (حصہ چہارم)		حلقہ اشاعت لکھنو	۱۹۱۷
۱۰۱۔	وزیر آغا	تنقید اور جدید اردو تنقید	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۹
۱۰۲۔	اردو مرثیے کا ارتقاء (ابتدا سے انیس تک)		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۲
۱۰۳۔	وہاب اشرفی	تاریخ ادبیات عالم (کامل)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	

رسائل وجرائد

۱۔ اشفاق حسین ۔ سہ ماہی اردو انٹرنیشنل ،کینیڈا۔

۲۔ اے ۔رحمان سہ ماہی عالمی جائزہ (پہلا شمارہ) دہلی ،جنوری تا مارچ ۲۰۱۴

۳۔ افتخار حسین شاہ ہفت روزہ ایشین نیوز ،امریکہ،

۴۔ اعجاز معین مرزا ہفت روزہ نوائے کشمیر،امریکہ

۵۔ تحقیق (سالانہ مجلّہ) شمارہ ۱۶،شعبہ اردو آرٹس فیکلٹی ،سندھ یونیورسٹی ،جام شورو ،پاکستان، ۲۰۰۸

۶۔ تحسین فراقی (ڈاکٹر) ۔مباحث ،لاہور، ،جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲

۷۔ تحقیق (سالانہ مجلّہ) شمارہ ۱۶،شعبہ اردو آرٹس فیکلٹی ،سندھ یونیورسٹی ،جام شورو ،پاکستان، ۲۰۰۸

۸۔ جمشید مسرور۔ ماہنامہ بازگشت، ناروے،

۹۔ خواجہ محمد اکرام الدین (پروفیسر) ۔ماہنامہ اردو دنیا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی ،مدیر (اپریل ۲۰۱۲ تا جون ۲۰۱۵)

۱۰۔ خواجہ محمد اکرام الدین (پروفیسر) ۔سہ ماہی فکر وتحقیق (نیا افسانہ نمبر) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی ، ،اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳)

۱۱۔ خواجہ محمد اکرام الدین (پروفیسر) ۔سہ ماہی فکر وتحقیق (اردو اشاریوں پر خصوصی شمارہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی ،الدین ،اپریل تا جون ۲۰۱۳

۱۲۔ خواجہ محمد اکرام الدین (پروفیسر) ۔سہ ماہی فکر وتحقیق (اردو اشاریوں پر خصوصی شمارہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی ، ،اپریل تا جون ۲۰۱۳

۱۳۔ رحیم انجان ۔ماہنامہ ملاقات ،کینیڈا،

۱۴۔ رفیق سلطان ۔ماہنامہ اردو دنیا ،امریکہ،

۱۵۔ سہیل جالبی ۔ماہنامہ نیا دور ،امریکہ

۱۶۔ سید عاشور کاظمی ۔ماہنامہ ہم سفر ،لندن،

۱۷۔ سید مجاہد علی ۔ماہنامہ کارواں ،ناروے،

۱۸۔ سرور عثمانی ۔سہ ماہی مفاہیم (ادب نمبر) جھارکھنڈ،، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴

۱۹۔ سید ضمیر اختر نقوی ۔القلم (علمی، ادبی، ثقافتی اور تحقیقی جریدہ) شمارہ ۷، کراچی، پاکستان، جون ۲۰۰۱

۲۰۔ سہ ماہی عصر ادب، نئی دہلی

۲۱۔سہ ماہی اردو بک ریویو، نئی دہلی، مدیر محمد عارف اقبال، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹

۲۲۔ سہ ماہی جہان اردو، دربھنگہ، مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱

۲۳۔ صباحت قمر زبان وادب (تحقیقی وتنقیدی ششماہی مجلّہ) فیصل آباد، پاکستان،، جنوری تا جون ۲۰۰۶

۲۴۔ عارف خورشید۔ عالم گیرادب (حمید سہروردی: شخصیت اور ادبی جہات) کتابی سلسلہ ۲، اورنگ آباد، دکن،

۲۵۔ عارف خورشید۔ عالم گیرادب (عارف خورشید: فن اور شخصیت) کتابی سلسلہ ۳، اورنگ آباد، دکن، جولائی ۲۰۱۲

۲۶۔ عالمی اردوادب، مدیر کشور وکرم، دسمبر ۲۰۱۳

۲۷۔کشور وکرم عالمی اردوادب، دسمبر ۲۰۱۳

۲۸۔ محمد عارف اقبال ۔سہ ماہی اردو بک ریویو، نئی دہلی، مجولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۹

۲۹۔ معراج پاشا ۔پندرہ روزہ مہک، امریکہ،

۳۰۔ مشتاق احمد (ڈاکٹر) ۔سہ ماہی جہان اردو، دربھنگہ، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱

۳۱۔ ماہنامہ اخبار اردو (بیرون ممالک میں اردو) اسلام آباد، پاکستان، اکتوبر۔نومبر ۱۹۹۰

۳۲۔ محمد صادق جاوید ہفت روزہ اردو ٹائمز، امریکہ

۳۳۔ ماہنامہ ایوان اردو، اردو اکادمی دہلی، نومبر ۲۰۱۴

۳۴۔ ماہنامہ شعر، لندن

۳۵۔ ماہنامہ صبا، کینیڈا، مدیر کبیر قریشی

۳۶۔ ماہنامہ فنون، جرمنی

۳۷۔ ماہنامہ نیا اردو، لکھنو، مدیر وضاحت حسین رضوی، اپریل ۲۰۰۶

۳۸۔ ماہنامہ آج کل (اردو ادب کا مجر) نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۱

۳۹۔ وضاحت حسین رضوی۔ ماہنامہ نیا اردو، لکھنو، اپریل ۲۰۰۶

۴۰۔ ہفت روزہ پاکستان نیوز، ناروے، مدیر شوق بدایونی

"Urdu Shairi Ki Tanqeed Aur Dr. Taqi Abedi: Ek Tanqeedi Mutalia (Anees, Faiz Aur Hali Ke Hawale Se)"

Submitted to the University of Jammu
for the award of
Doctorate of Philosophy in Urdu
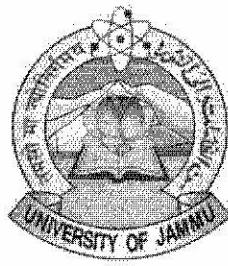
Submitted by
Saima Manzoor

Supervisor
Prof. Shohab Inayat Mlik

Department of Urdu
University of Jammu- 180006
2017